قرآن کے بنیادی موضوعات

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ترجمہ: محمد کاظم



مشعل

قرآن

کے

بنیادی موضوعات

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ترجمہ: محمد کاظم



مشعل بکس

آر بی۔5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن

لاہور۔54600، پاکستان

قرآن کے بنیادی موضوعات

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ترجمہ: محمد کاظم

ناشر: مشعل بکس

آر۔بی۔۵، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان
فون وفیکس: 042-5866859
e-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.com

ٹائٹل ڈیزائن: احمر رحمٰن

پرنٹرز: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

قیمت: -/320

ترتیب

پیش لفظ

ڈاکٹر فضل الرحمن ایک بین الاقوامی سطح کے مسلم سکالر تھے- آج سے تقریباً چالیس برس پہلے وہ اسلام آباد کے مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے- جہاں چھ سال کام کرنے کے بعد وہ بعض حالات سے مجبور ہو کر پاکستان کو خیر باد کہہ کے امریکہ چلے گئے- امریکہ میں انیس برس کا طویل عرصہ (۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۸ء تک) انہوں نے شکاگو یونیورسٹی میں اسلامی فکر کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور اسی عرصے میں انہوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اپنی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں، جن میں تین مقابلۃً زیادہ اہمیت کی ہیں:

۱- Islam (تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا)

۲- Major Themes of the Quran (۱۹۷۹ء)

۳- Islam and Modernity (۱۹۸۲ء)

ان میں سے تیسری کتاب کا اردو ترجمہ "اسلام اور جدیدیت" کے عنوان سے ادارہ "مشعل" لاہور نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا- اب دوسری کتاب کا اردو ترجمہ "قرآن کے بنیادی موضوعات" کے نام سے اس وقت پیش کیا جا رہا ہے-

قرآن کے بارے میں ڈاکٹر فضل الرحمن کا بنیادی تھیسس یہ ہے کہ اس کتاب کو ایک اکائی کے طور پر نہیں پڑھا اور سمجھا گیا- اکثر یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ اس کی آیات کو الگ الگ کر کے ان کا ترجمہ اور تشریح کی جاتی ہے- جس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ مختلف اہم موضوعات مثلاً خدا، انسان، معاشرے اور یوم آخرت وغیرہ کے بارے میں قرآن کا مجموعی نقطہ نظر کیا بنتا ہے اور اس ضمن میں

اس کی ہدایات اور تعلیمات کا باہمی ربط کیونکر سامنے آتا ہے- ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اس طرح کے امتزاجی (Synthetic) مطالعے کے بغیر ایک قاری اپنے اندر قرآن کا صحیح مذاق پیدا نہیں کرسکتا-

کتاب کے ''تعارف'' میں مصنف نے قرآن کے مختلف انگریزی تراجم پر بات کی ہے- ان کے نزدیک A.J.Arberry کا ترجمہ قرآن The Quran Interpreted انگریزی زبان میں اب تک بہترین ترجمہ قرار دیا جاسکتا ہے- قرآن کے انگریزی تراجم کی انہوں نے تین اقسام بتائی ہیں- ایک وہ جن میں قرآن پر یہودی اور عیسائی عقائد کے اثرات کا کھوج لگانے کی کوشش کی جاتی ہے- دوسرے وہ جن میں قرآن کی سورتوں کو ان کے زمانہ نزول کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے اور تیسرے وہ جن میں قرآن کے مضامین کو الگ الگ یا بالجملہ بیان کر کے سامنے لایا جاتا ہے- ڈاکٹر صاحب اس بات کا افسوس کرتے ہیں کہ یہودی اور عیسائی سکالر قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے عموماً اپنی اس خواہش کو دبا نہیں سکتے کہ کسی طرح سے قرآن کو یہودیت یا عیسائیت کی باز گشت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی یہودی یا عیسائی کا مقلد بنا کے پیش کیا جائے- قرآنی سورتوں کی تاریخی ترتیب کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ کسی سکالر اور محقق کے لئے تو اس کے کام میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے، لیکن اس سے قرآن کا بنیادی نقطہ نظر اور اس کی تعلیمات کی مربوط و معین صورت واضح نہیں ہوسکتی- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں سب سے اہم کام یہ تھا کہ تیسری قسم کے مطالعے پر زیادہ محنت کی جاتی، یعنی قرآن کے مضامین و مندرجات کا گہرا مطالعہ کر کے انہیں آج کی صورت حال میں اس طرح پیش کیا جاتا کہ قرآن کا اصل مقصد پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا- لیکن اس اہم کام پر نہ اہل مغرب نے زیادہ توجہ دی اور نہ خود مسلمانوں نے! مسلمانوں کے ساتھ یہ مشکل ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن کی تعبیر و تشریح آج کی صورت حال اور اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کی جائے گی تو اس میں بہت سے مواقع پر روایتی تفسیروں سے ہٹ کر بات کرنی پڑے گی اور یہ خطرہ مول لینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا- ڈاکٹر فضل الرحمن کہتے ہیں: وقت آ گیا ہے کہ اب یہ خطرہ مول لینا چاہیے- اس لئے کہ اس کے بغیر قرآن کو آج کی زندگی کے لئے موزوں اور برمحل (relevant) ثابت نہیں کیا جا سکتا-

قرآن کی آیات میں بعض کا ناسخ اور بعض کا منسوخ ہونا صحیح احادیث اور تفاسیر سے ثابت ہے۔ اس باب میں مستشرقین اپنی بات کہنے کا موقع ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ان میں سے بعض جو متوازن رویے کو چھوڑ کر انتہا پسندی کی طرف میلان رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ اصل میں قرآن کی آیات جس شکل میں اب ہمارے سامنے ہیں "انہیں محمدؐ نے پہلے ایڈٹ کیا۔ (یعنی ان پر نظر ثانی کی) ان کو چیک کیا (یعنی ان کی جانچ کی) اور پھر ان کا اعلان کیا۔" یہ مستشرق John Wansbrough اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ایک دوسرے صاحب Burton کا خیال ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمن نے قرآن کے بارے میں اہل مغرب کی ان سب غیر متوازن آراء کی نشان دہی کی ہے اور اس کے ساتھ انہوں نے قرآن پر کام کرنے والے بعض متوازن اور معقولیت پسند مستشرقین کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً جرمنی کے Rudi Paret کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ اس کا جرمن ترجمہ قرآن بہت عمدہ اور سنجیدہ ہے اور اسی طرح قرآن پر اس کے حواشی Koran Kommentar بھی، جس میں ہر آیت کے نیچے دوسری متعلقہ آیات کے حوالے (Cross references) دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح وہ جاپانی سکالر T. Izutsu کے کام کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ قرآن کے موضوع پر اس کی مختلف تصانیف کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اگرچہ میں بعض مقامات پر پروفیسر ایزتسو سے اتفاق نہیں کرتا۔ مثلاً اس نے "تقویٰ" کی اصطلاح کا جس طرح سے تجزیہ کیا ہے، اس سے میں پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ لیکن میں اس کی تصانیف کو بہت مفید سمجھتے ہوئے ان کی سفارش کرتا ہوں۔



قرآن کے بنیادی موضوعات جن پر ڈاکٹر فضل الرحمن نے اپنی اس کتاب میں بات کی ہے، حسب ذیل ہیں:

۱۔ خدا۔

۲۔ انسان ــــــ بطور ایک فرد کے۔

۳۔ انسان ــــــ معاشرے میں۔

۴۔ نیچر (یعنی یہ سارا نظام قدرت)

۵- رسالت اور وحی

۶- معادیات (روز آخرت کے بارے میں عقائد و تعلیمات)-

۷- شیطان اور شر-

۸- مسلم امت کا ظہور-

ان ابواب کے علاوہ کتاب کے آخر میں دو ضمیمے بھی دیئے گئے ہیں:

ضمیمہ اول ___ مکے میں اسلامی امت کی مذہبی صورت حال-

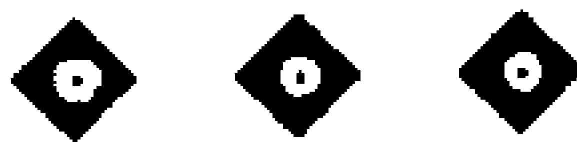
ضمیمہ دوم ___ اہل کتاب اور مذاہب کا تنوع-

ان موضوعات پر اپنا مطالعہ پیش کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ موضوع زیر بحث کے بارے میں وہ اپنے اُن خیالات اور افکار کا اظہار کرتے ہیں جو انہوں نے قرآن کے گہرے اور تحقیقی مطالعے سے اخذ کئے ہیں اور جن کے انہوں نے غالباً تحریری اور ذہنی نوٹ لے رکھے ہیں- ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ مثالوں کے ذریعے ان کی وضاحت کی خاطر جگہ جگہ حسب ضرورت متعلقہ قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہیں- یہ حوالہ وہ تین طرح سے دیتے ہیں: طویل اور اہم آیات کا ترجمہ وہ متن کے نیچے اقتباس کی صورت میں نقل کرتے ہیں- چھوٹی اور مفرد آیات کا ترجمہ وہ قوسین میں اپنی عبارت کے متن کے اندر ہی دے دیتے ہیں اور بریکٹ میں سورت اور آیت کا نمبر درج کرتے ہیں اور بعض دفعہ وہ متعلقہ آیت کا صرف مفہوم اپنے متن میں شامل کر لیتے ہیں اور بریکٹ میں سورت اور آیت کا حوالہ دے دیتے ہیں-

اوپر کے یہ سب موضوعات چونکہ قرآن کے بنیادی موضوعات ہیں، اس لئے ان پر بات کرتے ہوئے قرآنی آیات کا حوالہ دیے بغیر دو قدم بھی نہیں چلا جا سکتا- اگر یہ بیانیہ انداز کی تخلیقی قسم کی تصنیف ہوتی تو اس کی صورت دوسری ہوتی کہ اس میں لکھنے والا ہر موضوع پر ایک رواں اور سلیس انداز میں اپنی آراء و افکار کا اظہار کرتا اور آگے بڑھ جاتا- یہ بتائے بغیر کہ اس کی وہ آراء و افکار قرآن سے کس طرح اور کہاں سے اخذ ہوتے ہیں- لیکن ڈاکٹر فضل الرحمن کی یہ کتاب، اس کے بخلاف، خالصۃً تحقیقی اور علمی انداز میں لکھی گئی ہے اور محققین کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اپنی کوئی بھی رائے، کوئی بھی قول، کوئی بھی خیال بغیر ضروری حوالے کے نہ دیں- ان کے قلم سے ایسا جملہ کبھی نہ نکلے جس کے پیچھے سند موجود نہ ہو- ڈاکٹر صاحب نے جب اپنی اس کتاب کے لئے تحقیقی انداز پسند کیا، تو ان کے لئے لازم ہوا کہ وہ جہاں

جہاں بھی ضرورت سمجھیں، قرآن کی پوری پوری آیات اقتباس کے طور پر دیں یا ان کے بعض حصوں کا ترجمہ اپنے متن میں شامل کریں اور ہر حال میں متعلقہ سورت اور آیت کا نمبر درج کریں- تصنیف کا یہ انداز پڑھنے میں ذرا دشواری تو پیدا کرتا ہے کہ عبارت کے بیچ میں حوالہ آ جانے سے پڑھنے میں تسلسل قائم نہیں رہتا- لیکن ایک عمیق اور امتزاجی قسم کے مطالعے کے لئے یہ تحقیقی انداز ناگزیر ہے- ترجمہ کرتے ہوئے میں چونکہ اس کتاب سے کافی عرصہ وابستہ رہا ہوں، اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ اسے ایک سرسری مطالعے کے بعد ایک طرف رکھ دیا جائے، بلکہ اسے پوری طرح سمجھنے اور اپنے اندر جذب کرنے کے لئے اس کا کئی بار پڑھنا ضروری ہے- یہ ان موضوعات پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک طرح سے حوالوں کی کتاب (Referenc book) ہے- ایک مضمون جو قرآن میں ایک جگہ بیان ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب اسی مضمون پر مختلف سورتوں میں پائی جانے والی دوسری آیتیں بھی جمع کر دیتے ہیں- اس طرح اس مضمون پر قرآن کا سارا موقف اپنی مجموعی صورت میں ایک جگہ سامنے آ جاتا ہے-

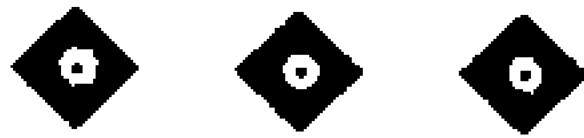
قرآن کی آیات کا حوالہ دیتے وقت ڈاکٹر صاحب، ہر جگہ سورت کا نمبر اور اس کے سامنے آیت کا نمبر دیتے ہیں- مثلاً (۱۷:۲۷) اس کا مطلب ہے، سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۷- لیکن چونکہ سورت کا صرف نمبر پڑھنے سے ذہن فوری طور پر اس سورت کے نام اور قرآن میں اس کے مقام کی طرف منتقل نہیں ہو پاتا، اس لئے میں نے آیات کے حوالے کے لئے سورت کے نمبر سے پہلے اس کا نام دینے کا بھی التزام کیا ہے- مثلاً (بنی اسرائیل ۱۷:۲۷)، (الفاطر ۳۵:۴۴) وغیرہ-



''خدا'' کے موضوع پر ڈاکٹر فضل الرحمن نے مفکرانہ انداز میں گفتگو کی ہے- ان کا کہنا ہے کہ قرآن خدا کے وجود کو ''ثابت'' نہیں کرتا، بلکہ موجود کائنات کا مشاہدہ کرا کے اس کی طرف ''اشارہ کرتا'' ہے- کائنات کا یہ عظیم الشان کارخانہ جو اتنے نظم، اتنی باقاعدگی اور اتنی حتمیت کے ساتھ چل رہا ہے، یہ کسی قدرتی عامل تسبیب کے بغیر نہیں ہو سکتا- یہ عامل اہل مذاہب کے نزدیک خدا ہے- جب خدا نے اس کائنات کو خلق کیا تو اس میں ایسے قوانین رکھ دیئے، جن سے وہ سر مو تجاوز نہیں کر سکتی- اب اس وسیع و عریض اور لانہایت کائنات کا مشاہدہ کیا کہتا ہے- کیا یہ اپنے آپ ہی محض

اتفاق سے، وجود میں آ گئی ہے؟ یا اس کے پیچھے ایک بامقصد تخلیق کار ہے؟ خدا نے انسان کو بھی خلق کیا، لیکن اس کو اپنے قوانین کا اس طرح سے پابند نہ بنایا، جس طرح سے اس نے نیچر کو بنایا تھا- اُسے اختیار دیا کہ وہ چاہے تو خدا کے قوانین کی پابندی کرے اور چاہے تو ان سے انحراف کرے- لیکن ایسا کرنے سے پہلے اس نے اپنی صفت رحمت سے کام لیتے ہوئے اس کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اپنے پیغمبر بھیجنے کا اہتمام کیا- ایک تو انسان کی جبلت میں پہلے دن سے ہی اس کائنات کے رب کا شعور رکھ دیا گیا تھا- پھر رسولوں اور نبیوں نے آ کر انسان کو یاد دلایا کہ ان کے اوپر ایک خدا ہے جو انہیں پیدا کرتا ہے- ان کو رزق دیتا ہے اور انہیں مارتا ہے- کچھ انسانوں نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی بات مانی اور کچھ نے نہ مانی- تو پھر خدا نے امتحان اور فیصلے کا نظام قائم کیا، جو موت کے بعد دوسری زندگی میں نافذ العمل ہوگا- ڈاکٹر فضل الرحمن کہتے ہیں کہ تخلیق، ربوبیت، ہدایت اور آخر میں فیصلے کا یہ سلسلہ اتنا معقول اور قدرتی ہے کہ قرآن کو بجا طور پر حیرت اور مایوسی ہوتی ہے، جب لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کے سوال اٹھاتے ہیں-

مستشرقین قرآن کی بعض آیات کو لے کر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا خدا ایک بے رحم طاقت ہے، ایک بے مہر ظالم اور من موجی جابر (Tyrant) جو چاہے تو کسی کو جہنم کی آگ میں جھونک دے اور چاہے تو کسی کو اس عذاب سے بچا لے- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ نتیجہ ہے قرآن کی آیات کو الگ الگ کر کے پڑھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا- وہ کہتے ہیں کہ جتنی آیات میں خدا کی ان سزاؤں کا ذکر ہے، اُن سے کہیں زیادہ آیات میں خدا کی بے پایاں رحمت، اس کی معاف کرنے اور بخش دینے کی صفت اور خطا کار اور نادم انسانوں کی توبہ قبول کرنے کے رویے کا ذکر ہے- جب تک ان دونوں طرح کی آیات کو آپس میں ملا کر نہیں پڑھا جائے گا قرآن میں خدا کا جو ایک مجموعی تصور بنتا ہے وہ ٹھیک طرح سمجھ میں نہیں آ پائے گا-



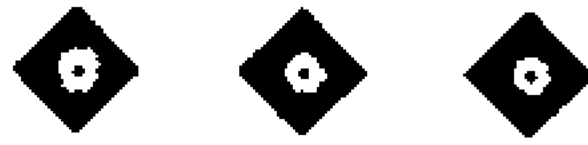
اس دنیا میں انسان کی دو حیثیتیں ہیں: ایک فرد کی حیثیت اور دوسری جس معاشرے میں وہ رہتا ہے، اس کے ایک رکن کی حیثیت! انسان کی ان دونوں حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن سے جو کچھ اخذ ہوتا ہے، اس پر فاضل مصنف نے الگ الگ باب باندھے ہیں-

خدا نے جب انسانی فرد کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ زمین پر اس کا خلیفہ یا نائب ہوگا- خدا کے اس فیصلے پر فرشتوں نے پہلے تو سوال اٹھائے، لیکن پھر وہ مان گئے، سوائے ایک کے جو جنات میں سے تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ آدم سے برتر ہے- خدا نے اس کی بغاوت سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کو اس امر کی مہلت دی کہ وہ اپنے منصوبے کے مطابق خدا کے بندوں کو صحیح راہ سے بھٹکائے اور یہ ثابت کرے کہ انسان ایک کمتر اور گمراہ مخلوق ہے- چنانچہ ڈاکٹر فضل الرحمن کہتے ہیں، فرد انسانی کے سامنے زندگی میں سب سے بڑا چیلنج شیطان کی ترغیبات اور اس کے بہکاوؤں سے اپنے آپ کو بچانا ہے- یہ ایک دائمی چیلنج ہے جو ان کے بقول اس کی ساری زندگی کو ایک اخلاقی کشمکش بنا کے رکھ دیتا ہے- اس کشمکش میں خدا انسان کی طرف ہوتا ہے، بشرطیکہ انسان اس کے لئے ضروری کوشش کرے اور خدا کی مدد کا مستحق ٹھہرے-

اس سلسلے میں اہل مغرب قرآن کی بعض آیات کو لے کر ایک اور مغالطہ یہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کے بس میں تو کچھ بھی نہیں- سب کچھ تو خدا کرتا ہے جیسا کہ وہ متعدد آیات میں کہتا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے- ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچتے ہیں، چنانچہ وہ ٹھیک طرح دیکھ بھی نہیں سکتے- ڈاکٹر فضل الرحمن کہتے ہیں کہ خدا یہ سب کچھ بغیر کسی وجہ کے اپنے آپ نہیں کرتا، بلکہ انسانوں کے اعمال اور ان کے رجحانات ان نتائج کے ذمہ دار ہوتے ہیں- جنہیں خدا اپنی طرف اس لئے منسوب کرتا ہے کہ یہ اس کے بنائے ہوئے نفسیاتی قانون کے تابع ہوتے ہیں- وہ نفسیاتی قانون یہ ہے کہ ایک شخص جب کوئی اچھا یا برا کام کرتا ہے تو اس کے لئے اس کام کو دہرانے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں اور جب وہ اس کام کو دہراتا چلا جاتا ہے تو اس کے لئے اس سے ہٹ کر کچھ اور کرنے کے مواقع تقریباً ختم ہو جاتے ہیں- اس صورت حال میں جب دل ایک ہی طرح کے کام پر جامد ہو جائیں تو گویا ان پر مہر لگ جاتی ہے، جو ان کے اعمال کے نتیجے میں، لیکن خدا کے قانون کے تابع ہوتی ہے- اس لئے خدا کہتا ہے کہ میں نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے-

قرآن کا منشا یہ ہے کہ انسان کو تین طرح کا علم حاصل ہونا چاہیے- ایک نیچر کا علم، جسے انسان کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے، یعنی طبعی علوم- دوسرا تاریخ (اور جغرافیے) کا علم- قرآن بار بار انسان سے کہتا ہے کہ زمین میں سفر کرو اور اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ اگلی تہذیبوں کے ساتھ کیا ہوا اور تیسرا اپنے آپ کا علم، یعنی انسان اپنے وجود پر، اس کے جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے، غور کرے- یہ سارا علم جس کا خدا تقاضا کرتا ہے طبعی اور سائنٹیفک نوعیت کا ہے اور اس علم کے بغیر خدا کا پورا تصور قائم نہیں ہو سکتا-

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کہتے ہیں کہ بعض مسلم مفکرین نے ماضی میں، اور حال میں بھی، اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جہنم کی سزائیں اور جنت کی شادمانیاں جسمانی نہیں، بلکہ روحانی ہوں گی۔ قرآن میں بعض مقامات پر اس خیال کی تائید ملتی ہے، بشرطیکہ روحانی سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ ''جسمانی'' کی بالکل ضد ہے۔ اس لئے کہ کوئی بھی خوشی ہو یا کوئی بھی تکلیف ہو وہ خالصتہً ''روحانی یا خالصتہً جسمانی نہیں ہوسکتی۔



''انسان ــــــ معاشرے میں'' کتاب کا تیسرا اور سب سے طویل باب ہے۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ قرآن کا مرکزی مطمحِ نظر اس زمین پر ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کرنا ہے، جس کی بنیاد عدل اور اخلاق پر ہو۔ اس نظام میں فردِ انسانی زیادہ اہم ہے یا وہ معاشرہ جس میں وہ رہتا ہے؟ ان کے نزدیک ایک نظری بحث ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسرا صحیح حالت میں قائم نہیں رہ سکتا۔

قرآن جب نازل ہوا تو مکے کی سوسائٹی میں دو بنیادی خرابیاں بہت نمایاں اور دُور رس اثرات کی حامل تھیں۔ ایک تو متعدد بتوں کی پرستش، جس نے معاشرے کو تقسیم کرکے اس میں طبقات پیدا کررکھے تھے، دوسرے انسانوں کے درمیان فاش اور ناپسندیدہ قسم کا معاشرتی اور اقتصادی تفاوت، جس میں ایک طرف تاجر پیشہ امیر کبیر طبقہ تھا اور دوسری طرف بہت غریب اور نادار لوگ، جنہیں دو وقت کا کھانا بھی میسر نہیں تھا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کہتے ہیں کہ شروع کی مکی آیات میں، جہاں قرآن نے عربوں کو بہت سے بتوں کے مقابلے میں ایک خدا کا تصور دیا، جو اس دنیا کا خالق اور مالک ہے اور ہر شے پر قادر ہے، وہاں اس نے سوسائٹی کے ان کھاتے پیتے لوگوں اور تاجر پیشہ امراء کی سخت مذمت کی، جو اپنا مال سینت سینت کر رکھتے تھے اور اسے غریب اور مسکین لوگوں پر اور بے ماں باپ کے بچوں پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ اس نے ایسے لوگوں کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کی وعید سنائی۔ جب تک آنحضرتؐ مکے میں رہے، دولت کی تقسیم اور اس کو غریبوں پر خرچ کرنے کے لئے صرف نصیحت اور تلقین سے کام لیا جاتا رہا۔ لیکن مدینے کو ہجرت کرنے کے بعد جب وہاں اسلامی مملکت کی داغ بیل پڑنے لگی تو ایک طرف ربا **(Usury)** کو حرام قرار دیا گیا اور دوسری طرف زکوٰۃ کا نظام قائم کیا گیا۔ زکوٰۃ اور صدقات کے اس نظام کی بدولت اللہ کا رزق جو پہلے چند ہاتھوں تک محدود رہتا تھا، اب غریب اور بے کس لوگوں تک بھی پہنچنے لگا۔

قرآن نے معاشرتی اور انتظامی معاملات کو ٹھیک طرح ادا کرنے کے لئے "شوریٰ" کا نظام قائم کیا اور حکم دیا کہ جہاں دو تین یا اس سے زیادہ لوگوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو وہ باہم مشورے سے اس کا حل ڈھونڈ لیا کریں۔ شوریٰ کا یہ طریقہ رائج کرنے کے بعد قرآن نے باہمی اختلاف اور ایک دوسرے کے خلاف کانا پھوسی اور پارٹی بازی کی سخت مذمت کی اور اسے شیطان کا بہکاوا قرار دیا۔ پھر قرآن جس طرح کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، اس میں پوری انسانیت کے درمیان مساوات اس کا بنیادی پتھر قرار دیا گیا۔ نیز اسلام کے قانون دانوں نے انسان کے لئے چار طرح کے بنیادی حقوق پر زور دیا: زندگی کا حق، مذہب اختیار کرنے کا حق، روزگار اور جائیداد کی ملکیت کا حق اور شخصی عزت و آبرو کا حق! اور ایک اسلامی ریاست کا یہ فرض ٹھہرا کہ انسان کے ان سب حقوق کی حفاظت کرے۔

قرآن نے اپنی خاص معاشرتی اصلاحات کے ذریعے سوسائٹی کے کمزور طبقوں کو طاقتور بنانے کا مقصد سامنے رکھا، جن میں غریب لوگ، یتیم بچے، عورتیں، غلام اور قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ شامل تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کہتے ہیں کہ ہم قرآن کی ان اصلاحات کو سمجھنے میں بنیادی غلطی کریں گے، اگر ہم نے اس سلسلے میں قانونی مطالبات اور اخلاقی ہدایات کے درمیان جو فرق ہے اس کو ٹھیک طرح نہ سمجھا۔ ان کا خیال ہے کہ مثلاً عورتوں سے متعلق اصلاحات میں قانونی جواز اور اخلاقی تقاضے کے درمیان فرق نہ کر کے مسلم فقہی روایت صحیح راستے سے ہٹ گئی ہے۔

عورتوں کے معاملے میں مثلاً ایک سے زیادہ شادیوں (Poly gamy) کے مسئلے کو لیجئے۔ قرآن (سورہ النساء ۴) میں کہتا ہے کہ اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ یتیم بچیوں کی میراث کا انتظام کرنے میں تم انصاف نہیں کر سکو گے تو تم بے شک ان میں سے دو دو، تین تین یا چار چار کے ساتھ نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان تم انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے ____ اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔ اسی سورہ میں آگے جا کر کہا جاتا ہے: "اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں انصاف ہرگز نہیں کر سکو گے۔" اب یہاں فقہاء نے اس قانونی اجازت کو تو لے لیا کہ دو دو، تین تین یا چار چار شادیاں کر لو اور اس اخلاقی شرط کو انہوں نے خاوند کے ضمیر پر چھوڑ دیا کہ وہ ان کے درمیان لازماً انصاف کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ایک مسلم جدیدیت پسند بیویوں کے درمیان انصاف کے تقاضے کو اولیت دے گا اور کہے گا کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کچھ خاص حالات میں اور خاص مقاصد کے پیش نظر دی گئی تھی۔

جہاں ایسے حالات نہ ہوں وہاں دوسری یا تیسری شادی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک سچ اصل میں یہ ہے کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت قانونی سطح پر اس لیے دی گئی کہ ماضی کی اس روایت کو بیک قلم موقوف کرنا ممکن نہیں تھا- لیکن اخلاقی سطح پر اس کے لیے جو شرط عائد کی گئی وہ اس غرض کے لئے تھی کہ معاشرے کو بہر حال اس اخلاقی منزل کی طرف بڑھنا چاہیے- جہاں مرد صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے اور عام حالات میں دوسری شادی کا خیال بھی دل میں نہ لائے-

غلامی کے معاملے میں بھی قرآن نے تدریج کی یہی پالیسی اختیار کی- اسلام سے پہلے عرب سوسائٹی میں غلامی کی ایک طویل اور مستحکم روایت موجود تھی- قرآن نے اس روایت کو آ کر یکلخت ختم تو نہ کیا کہ اس میں بڑی دشواریاں تھیں، البتہ بعض حالات میں اور کچھ شرائط کے ساتھ غلام رکھنے کو جائز قرار دیا- لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بہت زیادہ ترغیب دی، یہاں تک کہ گناہوں کے کفارے کے لئے جو اعمال تجویز کیے، ان میں غلام کو آزاد کرنا بھی تھا- مقصد یہ تھا کہ غلامی کا یہ رواج رفتہ رفتہ کم ہو کر بالآخر ختم ہو جائے-

ڈاکٹر فضل الرحمن کہتے ہیں کہ قرآن میں جتنے بھی قانونی یا نیم قانونی احکام وضع کیے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ہمیشہ ایک قانونی بنائے منطقی (ratio legis) ہوتی ہے، جو یہ بتاتی ہے کہ یہ قانون کیوں وضع کیا گیا ہے اور اس کے سمجھنے کے لیے آیت کے شانِ نزول کا علم ہونا ضروری ہوتا ہے- یہ قانونی بنائے منطقی سارے معاملے کی روح ہوتی ہے- ہمارے روایتی فقہاء اس کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن وہ ہر حال میں قانون کے مطالبے کے پابند رہتے ہیں- اس کی ایک مثال عورتوں کی گواہی کا مسئلہ ہے- قرآن نے قرض کے معاہدے کے کیس میں یہ ہدایت کی کہ اس پر دو مرد گواہ ہوں گے اور اگر دوسرا مرد میسر نہ ہو تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی لی جائے گی- دو عورتوں کی گواہی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے- اب قرآن کے اس حکم کا ratio legis یہ ٹھہرا کہ چونکہ اس زمانے میں مالی لین دین کے معاملات میں عورتوں کو خاص تجربہ نہیں تھا، اس لیے اس امر کا اندیشہ تھا کہ اس معاملے میں گواہی دیتے وقت ایک عورت بھول جائے گی تو اس صورت میں دوسری عورت اس کو یاد دلا دے گی- لیکن آگے چل کر جب مسلم معاشرے کے حالات بدل گئے اور عورتیں زندگی کے بہت سے معاملات میں حصہ لینے لگیں تو بھی مسلم فقہاء نے اسی حکم کی پابندی جاری رکھی- ڈاکٹر فضل الرحمن کہتے ہیں

کہ ایک مسلم جدیدیت پسند یہ دلیل دے گا کہ مرد کے مقابلے میں عورت کی نصف شہادت کی وجہ چونکہ مالی معاملات میں عورت کی یادداشت کی ممکنہ کمزوری تھی، اس لئے اب جبکہ وہ مالی معاملات سے آگاہ اوران میں تجربہ کار ہو چکی ہے تو مرد کے مقابلے میں اس کی نصف گواہی کا معاملہ ایسا ہے کہ اس پر دوبارہ غور کیا جانا چاہیے۔

اسی طرح مرد اور عورت کی برابری کا مسئلہ ہے۔ قرآن کے مطابق جہاں تک عقائد و اعمال کا تعلق ہے، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ نیک مرد اور نیک عورتیں دونوں اپنے اپنے اعمال کی جزا پائیں گے۔ اسی طرح بدکار مرد اور بدکار عورتیں اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتیں گے۔ لیکن ایک جگہ (سورہ النساء ۴: ۳۴) قرآن کہتا ہے: ''مرد عورتوں کے قوام ہیں۔ (یعنی ان کے معاملات کو چلانے کے ذمہ دار ہیں) اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔'' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مردوں کی عورتوں پر فضیلت طبعی اور پیدائشی نہیں ہے بلکہ وظائفی (Functional) ہے۔ اس لئے کہ ان کے ذمے پیسہ کمانا اور عورتوں پر خرچ کرنا ہے۔ لیکن اگر وقت کے ساتھ ساتھ اور بدلے ہوئے حالات میں عورت اقتصادی طور پر خود کفیل ہو جاتی ہے، چاہے میراث کی مالک بن کر یا خود دولت کما کر اور وہ گھر کا خرچ چلانے میں مرد کے ساتھ شریک ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی عورت پر مرد کی برتری اسی نسبت سے کم ہو جانی چاہیے۔

اس باب میں اور بھی بہت سے امور ہیں، جن پر ڈاکٹر فضل الرحمن نے بڑی معقولیت، توازن اور دلیل کے ساتھ بات کی ہے اور قرآن پڑھنے والوں کے سامنے علم و دانش کی نئی راہیں کھول کر انہیں سوچنے سمجھنے اور اس کتاب سے صحیح روشنی حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

اس پیش لفظ میں چونکہ کتاب کا پورا خلاصہ دیا جانا مقصود نہیں ہے اور نہ اس میں اتنی گنجائش ہے۔ ہم نے کتاب کے پہلے تین ابواب میں سے کچھ باتوں کا مختصر ساذکر نمونے کے طور پر صرف یہ دکھانے کے لئے کیا ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر فضل الرحمن نے کس طرح کے موضوعات اور مسائل کو اپنے مطالعے میں شامل کیا ہے اور ان میں ان کی بحث کا انداز کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی بعض آراء سے کسی کو اختلاف ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے جس خیال کا اظہار بھی کیا ہے، اس کے لئے پورا جواز مہیا کیا ہے اور اس کے حق میں منطقی دلیل دی ہے۔ نظریات اور آراء میں اختلاف زندگی اور حرکت کی علامت ہوتی ہے اور اس سے حقائق بلا آخر منقح ہو کر سامنے آتے ہیں۔

''قرآن کے بنیادی موضوعات'' جیسی کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین جو اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مطالعے میں اپنی عمریں بتا دیتے ہیں، اسلام پر اور قرآن پر کس کس طرح سے رائے زنی کرتے ہیں اور کیسی کیسی غلط فہمیوں کی اشاعت کرتے ہیں- مثلاً ایک صاحب Richard Bell ہیں، انہوں نے قرآن کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا تعارف بھی لکھا ہے- ان کا کہنا ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں ربط کی کمی دکھائی دیتی ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ جن لوگوں نے انہیں لکھے ہوئے مواد سے نقل کیا تھا، وہ اس کی سامنے کی اور پشت کی عبارتوں کو گڈمڈ کر گئے- ان مستشرقین کا بیشتر کام چونکہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی نگاہ میں تھا، اس لئے انہوں نے اپنی اس کتاب میں اس کا مناسب جائزہ لیا ہے اور قرآن کی صحیح پوزیشن واضح کی ہے- اس طرح کا عالمی سطح کا کام ڈاکٹر فضل الرحمٰن ہی کر سکتے تھے، جن کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور جن کی علمی قابلیت مسلم تھی- مشرق میں ہمارے علماء کو اول تو اس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ ان کے دین اور ان کی الہامی کتاب کے بارے میں دنیا کیا کہتی ہے، اور اگر علم ہو بھی جائے تو ان کے پاس اس کا جواب دینے کے لئے مطلوبہ قابلیت اور صلاحیت نہیں ہوتی-

اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے کا بڑا جواز اصل میں یہی ہے کہ ہمارے یہاں اسلام اور قرآن کے مطالعے سے شغف رکھنے والے ایسے علماء اور افاضل جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں ہیں، ان کو یہ دکھایا جائے کہ جب اسلام پر اور قرآن پر بین الاقوامی سطح کے علمی اور تحقیقی انداز میں بات کی جاتی ہے تو وہ کس طرح سے کی جاتی ہے- دوسرا فائدہ اس ترجمے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ ہمارے یہاں انگریزی زبان پڑھنے اور سمجھنے والے لوگ خاصی تعداد میں ہیں، لیکن ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے سکالر کی زبان اور اسلوب کو کما حقہ سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، وہ عالم اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفی مزاج بھی رکھتے تھے- اس لئے ان کی تحریر میں جب فلسفیانہ رنگ آتا ہے تو ان کی بات پوری طرح واضح نہیں ہو پاتی- ہمیں امید ہے کہ یہ ترجمہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی اس عالمانہ کتاب کے مطالب کو سمجھنے اور ان کو ذہن نشین کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوگا-

محمد کاظم

تعارف

مقصد تصنیف

مسلمانوں اور غیر مسلموں نے قرآن پر بہت کچھ لکھا ہے۔اس کتاب مقدس کی بے شمار تفسیریں جو مسلمانوں نے لکھی ہیں، ان میں متن کو الگ الگ آیت کی صورت میں لے کر اس کی شرح کی گئی ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ ان میں سے بیشتر تفسیروں میں کچھ خاص رجحان والے نقطہ نظر سامنے لائے گئے ہیں، ان تفسیروں کا اسلوب ایسا ہے کہ وہ کائنات اور زندگی کے بارے میں اس مربوط نقطہ نگاہ کا کوئی فہم پیدا نہیں کرتا جو بلاشبہ قرآن کی خصوصیت ہے۔قریبی زمانے میں غیر مسلموں اور ان کے ساتھ مسلمانوں نے بھی قرآنی آیات کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔یہ اگرچہ ایک سکالر کے لیے ماخذ یا اشارے کا کام دے سکتا ہے لیکن اس سے اس طالب علم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جو یہ جاننا چاہتا ہو کہ قرآن خدا، انسان اور معاشرے کے بارے میں کیا کہتا ہے۔چنانچہ قرآن کے بنیادی موضوعات کو متعارف کرانے کی جو ایک اشد ضرورت موجود ہے، امید ہے کہ یہ کتاب اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرے گی۔

اس کتاب میں بعض اہم موضوعات مثلاً امتوں کا تنوع (Diversity) معجزوں کے امکانات، اور ان کی حقیقت، نیز جہاد پر گفتگو کو چھوڑ کر، قرآن کے بنیادی موضوعات میں امتزاج پیدا کرنے کا جو طریق کار استعمال کیا گیا ہے وہ زمانی سے زیادہ منطقی ہے۔مثلاً خدا پر بحث کرتے ہوئے توحید کے نظریے کو۔جو منطقی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ساری بحث کا بنیادی پتھر قرار دیا گیا ہے اور خدا کے بارے میں تمام دوسرے قرآنی افکار یا تو اسی سے اخذ کیے گئے ہیں، یا اسی کے تحت لائے گئے ہیں۔علاوہ ازیں قرآن کو یہ موقع فراہم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود بولے۔تعبیر و تشریح سے صرف اسی صورت میں کام لیا گیا ہے جب افکار کو باہم جوڑنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس طرح کا تالیفی (Synthetic) بیان و اظہار وہ واحد طریقہ ہے جس سے پڑھنے والے کو قرآن کا، جو انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، صحیح ذائقہ میسر آ سکتا ہے۔ اگر آیات کی تاریخی ترتیب کو پھر سے قائم کر بھی لیا جائے (جو، رچرڈ بیل سے معذرت کے ساتھ، میرا خیال ہے ایک ناممکن کام ہے) تو اس سے اتنا ہی فائدہ ہوگا کہ اصل اور بنیادی خیال کے اندر جو جرثومہ ہے وہ سامنے آ جائے گا۔ یہ چیز "تفصیلی تجزیاتی" مطالعے (dissective Study) کے اُس طریقے سے بالکل مختلف ہے جس کا فائدہ علمی تحقیق کے لیے بالکل ظاہر ہے، لیکن جو یہ دعویٰ کبھی نہیں کر سکتا کہ وہ قرآن کو وہی کچھ سمجھتا ہے جو وہ خود اپنے بارے میں کہتا ہے، یعنی انسان کے لیے خدا کا پیغام ا____ پھر قرآن کے بارے میں رواجی اور گھسی پٹی معلومات کی تکرار: جیسے ایمان کے "پانچ ستون" یا قوانین میراث کی بحث وغیرہ۔ اس نے بھی قرآن کی سمجھ میں بہت سی سطحیت پیدا کر دی ہے۔

(یہ مطالعہ پیش کرتے ہوئے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کے حوالے دیے گئے ہیں تا کہ پڑھنے والا ان کی طرف خود رجوع کر سکے اور خود ان کے بارے میں سوچ سکے)

قرآن کے موضوع پر جدید مغربی تحریریں

قرآن کے ترجموں کو چھوڑ کر، جن میں اے جے آر بیری کا The Koran Interpreted انگریزی زبان میں بآسانی بہترین ترجمہ قرار دیا جا سکتا ہے (اس کے بعد مسلمانوں کے کیے ہوئے دو انگریزی تراجم: محمد مارمدوک پکھتال کا The Meaning of the Glorious Quran اور عبداللہ یوسف علی کا The Holy Quran آتے ہیں) قرآن کے بارے میں جدید مغربی لٹریچر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ایسی تصانیف جن میں یہ سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن پر یہودی یا عیسائی افکار کے اثرات کیا ہیں۔ (۲) ایسی تصانیف جن میں نزول قرآن کو تاریخ وار ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور (۳) ایسی تصانیف جو قرآن کے مضامین کو بالجملہ یا اس کے بعض پہلوؤں کو بیان کرنا چاہتی ہیں۔ اگر چہ اس موخر الذکر مطالعے کو سب سے زیادہ اہمیت دی جانی چاہیے تھی، لیکن اسے سب سے کم توجہ دی گئی ہے۔ مغربی سکالر غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کو اس طرح پیش کریں جس طرح کہ وہ اپنے آپ کو پیش کرانا چاہتا ہے، اور "معروضی تجزیے" کا کام ان لوگوں

کے پاس ہی رہے- چاہے وہ "مآخذ" کی صورت میں ہو یا افکار کی نشوونما کی صورت میں- اس کے بخلاف مسلم سکالروں کا سامنا دو طرح کے مسائل سے ہے: (۱) ایک تو اس خالص احساس کی کمی کہ قرآن کا آج کی زندگی سے بھی گہرا تعلق ہے، جبھی وہ آج کے انسان کے لیے قرآن کو اس انداز سے پیش کرنے سے قاصر ہیں جو اس کے لیے موزوں اور مفید ہو، اور اس سے بھی زیادہ (۲) یہ خوف کہ قرآن کی نئے انداز میں تعبیر کہیں بعض نکات میں روایتی آراء سے مختلف اور ہٹ کر نہ ہو- یہ دوسرا خطرہ ایک ناگزیر امر ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ خطرہ---- پورے خلوص اور ادراک کے ساتھ---- ضرور مول لینا چاہیے-

قرآن کے مطالعے کی یہ تین موٹی موٹی اقسام سب کی سب علمی نوعیت کی (Scholarly) ہیں، اگرچہ صرف تیسری قسم ایسی ہے جو موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرتی ہے، دوسری دو اقسام اس تیسرے کام کی تکمیل کے لیے بہت مفید ہوتی ہیں- قرآنی آیات کے پس منظر اور ان کی ترتیب و نزول کا علم قرآن کے مقاصد کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے بے حد ضروری ہے-

بدقسمتی سے قرآن کے بارے میں اب تک جو یہودی اور مسیحی خیالات رہے ہیں، انہیں ان لوگوں کی اس صاف دکھائی دینے والی خواہش نے بالکل گدلا کر دیا ہے کہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن یہودیت (یا عیسائیت) کی بازگشت کے سوا کچھ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوزیشن ایک یہودی (یا عیسائی) پیروکار کی ہے- ماضی کے دو بہترین علمی کاموں یعنی Abraham Geiger کی Was hat Mohammad aus dem Judenthume اور Hartwig Hirschfeld کی Judische Elemente im Aufgenommen Koran (1878) کے بعد کچھ زیادہ ہی کوششیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کی گئی ہیں کہ پیغمبر محمد ﷺ کسی نہ کسی یہودی عالم کے مقلد تھے- عیسائی علماء اس بارے میں اتنے بے اعتدال نہیں رہے اگرچہ رچرڈ بیل کی کتاب The origin of Islam in its Christian Environment میں جو یقیناً ایک عالمانہ کام ہے، بہت سے نظریات کے بارے میں سوال اٹھایا جا سکتا ہے-

یہودی عذر خواہ جن خطوط پر سوچتے ہیں ان کی منطقی انتہا John Wansbrough کی کتاب Quranic Studies (1977) ہے، جو یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے کہ (۱) قرآن یہودی روایت کا ایک صحیفہ ہے، کیونکہ یہ جب سامنے آیا تو یہودیت اور

عیسائیت کے درمیان ایک فرقہ وارانہ مناظرہ چل رہا تھا اور (۲) یہ مختلف روایات کا ایک مخلوط و مرکب صحیفہ ہے (اس نظریئے کو لے کر قرآن کے بعض اندرونی اختلافات مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اس کے رویوں پر بات کی جاتی ہے) چنانچہ (۳) اپنی اس پوزیشن کے ساتھ قرآن محمد ﷺ کے بعد کے زمانے کی چیز ہے۔

اس طرح کی سوچ سے کئی مسائل سامنے آتے ہیں۔ پہلے وانسبرو کے دوسرے نظریئے کو لیجئے کہ قرآن متعدد روایات کا ایک مرکب ہے، اور اس لیے یہ پیغمبر کے بعد کے زمانے کی چیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان ''روایات'' کی اصل، ان کی نوعیت، ان کی قدر و قیمت اور ان سے متعلق شخصیتوں کے بارے میں تاریخی معلومات واضح طور پر ناکافی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کہ متعدد کلیدی مسائل کو قرآن کی نزولی ترتیب اور حالات کے ارتقا کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس سوال کو لیجئے کہ ''قرآن معجزات کے بارے میں کیا کہتا ہے'' جیسا کہ میں باب چہارم میں وضاحت کے ساتھ بتاؤں گا، معجزات کے بارے میں جہاں قرآن کے رویے میں ایک ارتقا نظر آتا ہے وہاں یہ رویہ ہمیشہ مربوط و پیوستہ رہتا ہے اور بعد کے مراحل میں بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ معجزات کی اب ضرورت نہیں رہی، لیکن ان کا ہمیشہ امکان ہے۔ اگر ہم وحدت پر مبنی ایک صحیفے کو نگاہ میں رکھیں جو بتدریج اپنے آپ کو کھولتا اور واضح کرتا ہے تو یہ تبدیلی سمجھ میں آ سکتی ہے، اور یہ مختلف اور متضاد عناصر کا ایک مرکب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مذہبی امتوں کے تنوع (diversity) کے مسئلے سے کس طرح نمٹتا ہے۔ (اس پر باب ہشتم میں، اور زیادہ مکمل طور پر ضمیمہ ۲ میں بات کی گئی ہے)۔

وانزبرو کی بات ماننا میرے لیے ایک اور مسئلے میں بھی مشکل ہوا۔ وہ مسئلہ جزا و سزا کا ہے، یعنی تاریخ کا فیصلہ، اس لیے کہ وہ قرآن کی اصطلاحات سے بحث کرتے ہوئے ''تاریخی'' اور معادی'' (عقیدہ آخرت سے متعلق) معانی کے درمیان ایک واضح فرق قائم کرتا ہے۔ قرآن میں اس طرح کی کوئی تفریق نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان بہت ہی قریبی ربط ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وانزبرو ''تباہ شدہ قوموں اور تہذیبوں'' کی ان مثالوں کا تقابل، جو قرآن نے دی ہیں، حکماء کے اس لٹریچر کی قنوطیت کے ساتھ کرنا چاہتا ہے جس کا مرکزی خیال دنیا کی بے ثباتی ہے۔ اپنی بحث میں وانزبرو C.H. Becker کی کتاب Islam Studien کا حوالہ دیتا ہے، تاہم وہ بیکر کے اس سیدھے بیان کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ قرآن میں عاد اور ثمود کے قصے دنیا کی بے ثباتی اور فرد

کے مقدر کی تصویر پیش نہیں کرتے، بلکہ ان میں قوموں کی تقدیروں کا بیان ہے- میرا خیال ہے کہ وانزبرو کے اس نظریے کے خلاف قرآن خود ایک بہترین دلیل ہے (دیکھئے باب سوم) کیونکہ یہ قوموں کو بار بار خبردار کرتا ہے کہ وہ دوسری قوموں کے تجربوں اور ان کی غلطیوں سے فائدہ اٹھائیں-

اسی طرح میں نہیں سمجھتا کہ وانزبرو نے بعض آیتوں کے بدلے دوسری آیتوں کے لانے کے مسئلے کو (جسے قرآن خود 'نسخ' سے تعبیر کرتا ہے) ٹھیک طرح نبھایا ہے- صاف ظاہر ہے کہ اگر ایک آیت کا بدل لایا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد کی آیت نے پہلی آیت کی جگہ لے لی ہے- یہ ایک زمانی ترتیب کی ضرورت ہے جسے قائم رکھنا بہت مشکل ہو جائے اگر قرآن محض یک وقتی روایات کا ایک مرکب ہو- اس صورت میں کچھ ردوبدل تو واقع ہو سکتا ہے لیکن وہ نسخ نہیں کہلایا جا سکتا-

وانزبرو کے ساتھ میرے اختلافات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ اسی صورت میں بخوبی سمجھے جا سکتے ہیں کہ میری یہ کتاب اور اس کی کتاب پڑھ لی جائے (تاہم میں اس کے کم از کم ایک نکتے سے اتفاق کرتا ہوں، وہ یہ کہ ''جس طرح کا بھی تجزیہ کیا جائے گا وہ اسی کے مطابق نتائج کا تعین بھی کرے گا'') میرا یہ خیال ہے کہ اس طرح کا مطالعہ بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے، اگرچہ ہمیں یہ دیکھنے کے لیے Geiger اور Hirschfeld کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تجزیہ صحیح طور پر کیا جائے تو کتنا مفید ہو سکتا ہے-

جہاں تک قرآن کی تاریخی ترتیب کے مطالعات کا سوال ہے Noldeke-Schwally کا عظیم الشان کام: Geschichte des Qorans ابھی تک اعلیٰ ترین معیار قائم کیے ہوئے ہے، اور پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہونا چاہیے- R. Blachere کا فرانسیسی ترجمہ قرآن اور اس کا Introduction an Koran دونوں قرآن کی آیتوں کی وہی ترتیب اختیار کرتے ہیں جو نولدیکے نے دی ہے- اس کی کتاب Le Probleme de Mahomat ایک زیادہ معروضی تاریخی ترتیب استعمال کرتی ہے جس کی بنیاد پیغمبرؐ کے نفسیاتی ارتقا پر ہے، بجائے اس کے کہ وہ موضوعات کی ترتیب وتشکیل میں جرمن سکول کے اصول کی پابندی کرے- رچرڈ بیل کا ترجمہ قرآن اور اس کے ساتھ Introduction to the Quran دونوں میں بعض اوقات قابل قدر بصیرت کا اظہار ہوتا ہے- لیکن ان میں کچھ مرکز سے

بٹے ہوئے موضوعات بھی سامنے آتے ہیں- مثلاً وہ کہتا ہے کہ قرآن کی سورتوں میں کسی قدر بے ربطی پیدا ہوگئی، اس لیے کہ جن لوگوں نے انہیں نقل کیا، وہ لکھے ہوئے نسخے کے سامنے والے اور پشت والے حصوں کے درمیان فرق نہ کر سکے- منٹگمری واٹ نے رچرڈ بیل کی Intorduction کا ایک پوری طرح نظرثانی شدہ ایڈیشن شائع کیا ہے، جسے میں نے اس کے بہت سے نکات پر اختلاف کرنے کے باوجود بہت مفید پایا- Rudi Paret کا جرمن ترجمہ قرآن سنجیدہ اور بہت عمدہ ہے، اسی طرح اس کی Koran Kommentar ہے، جس میں وہ ہر آیت کے نیچے دوسری آیتوں کے بہت مفید حوالے دیتا ہے- Paret کا خیال ہے اور میں سمجھتا ہوں صحیح ہے کہ قرآن کی آیتوں کی ایسی زمانی ترتیب جو بیل (Bell) کرنا چاہتا ہے ایک ناممکن چیز ہے-

قرآن کے متن کی تاریخ پر بنیادی کام پھر نولدیکے شوالی کا ہے- Blachere اور دوسروں خاص طور پر A.Jeffery نے اپنی کتاب Materials for the History of the Text of the Quran میں بعض قابل قدر معلومات دی ہیں (اگرچہ Jeffery کو پڑھتے ہوئے کچھ احتیاط سے کام لینا چاہیے) دوسرے سرے پر وانزبرو کے ساتھ John Burton کی کتاب The Collection of the Quran ہے (جو نسخ کے نظریے کو بہت آگے تک لے جاتی ہے اور یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ قرآن کا پورا متن خود پیغمبر نے "ایڈٹ کیا، جانچا اور رائج کیا تھا") جبکہ Crone and cook کی کتاب Hagarism وانزبرو کے نظریے کو مسلمہ صداقت تسلیم نہ کرتے ہوئے اس سے الگ ہو جاتی ہے-

قرآن کے بارے میں علمی تحقیق کے اندر جو خلا ہیں وہ اس کی تیسری قسم میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں، یعنی ایسی تصانیف میں جن میں قرآن کے موضوعات سے بحث کی گئی ہے- ان میں سے اکثر قرآن کے صرف چند پہلوؤں سے غرض رکھتی ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی قرآن کے اندر گہرائی میں نہیں جاتی - اگر وہ خالصۃً "سائنٹی فک" نہیں بھی ہیں جو مثلاً قرآن میں وارد خارجی یا تجارتی اصطلاحات پر بات کرتی ہوں تو بھی وہ ایک غالب خارجی نقطہ نظر کا مظاہرہ ضرور کرتی ہیں- کسی نے بھی قرآن کو اس کی اپنی شرائط پر، بطور ایک اکائی کے، اب تک پیش نہیں کیا- خود مسلمانوں کی ان تصانیف نے بھی نہیں جن کا بہترین عکس Ignaz Goldziher کی کتاب Die Richtungen der Islamischen Koranauslegung میں دیکھا جا سکتا ہے-

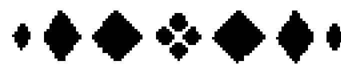
ایک مفید، اگرچہ سال خوردہ، تصنیف H.Grimme کی کتاب Mohammad (1895) کی دوسری جلد ہے جس میں قرآن کی رو سے مسلمانوں کے فرائض کے نظریے اور فلسفیانہ سوچ کا ایک عام جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اسلام کی مقدس کتاب کے بارے میں کسی عیسائی کا غیر معمولی طور پر حساس ردعمل Kenneth Cragg کی کتاب The Events of the Quran نیز اس کے مقالات کا مجموعہ The Mind of the Quran ہے۔ اسی طرح کچھ دوسری تصانیف بھی اس قابل ہیں کہ ان کا نوٹس لیا جائے۔ ان میں Thomas O'Shaughnessy کا مضمون The Development of the Meaning of Spirit in The Koran ہے جو Orientalia Christiana Analecta میں شائع ہوا تھا، اور S.H.Al-Shamma کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ The Ethical System Underlying the Quran ہے۔

اور آخر میں جاپانی سکالر T.Izutsu کے قابل قدر علمی کام کا ذکر بہت ضروری ہے۔ اس کی پہلی تصنیف: The Structure of the Ethical Terms in the Koran کو نظر ثانی کے بعد Ethico-Religious Concepts in the Koran کے نام سے 1966 میں شائع کیا گیا۔ ان دونوں کے درمیان اس موضوع سے متعلق ایک اور کتاب God and Man in the Koran کے نام سے آئی۔ ایزتسو کا طرز فکر معنی شناسی پر مبنی (semantic) ہے۔ اگرچہ ان کتابوں میں زیادہ تر مذہبی اخلاقیات اور رویے پر گفتگو کی گئی ہے، تاہم ان میں قرآن کا عمومی کائناتی نظریہ بھی زیر بحث آتا ہے۔ پروفیسر ایزتسو قرآن کی بعض کلیدی اصطلاحوں مثلاً تقویٰ کا جس طرح سے تجزیہ کرتے ہیں مجھے اس سے بعض مواقع پر اختلاف ہے، لیکن میں ان کی تصانیف کو بے حد مفید سمجھتے ہوئے ان کے مطالعے کی سفارش کرتا ہوں۔

کتابیات قرآن کی ایک فہرست William A. Bijlefeld نے رسالہ "مسلم ورلڈ" نمبر 64 (1974) صفحہ 79 پر Some Recent Contributions to Quranic Studies کے عنوان سے دی ہے۔

قرآن سے اقتباسات

اس کتاب میں قرآن کی آیات کے نمبر دیتے ہوئے میں نے فلوگل کے ایڈیشن کو نہیں، بلکہ سرکاری مصری ایڈیشن کو سامنے رکھا ہے- اکثر جگہ قرآنی آیات کا ترجمہ میں نے خود کیا ہے- تاہم باب اول اور باب ششم میں جہاں قرآن کے بہت زیادہ اقتباسات ہیں وہاں میں نے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ پکتھال کا ترجمہ استعمال کیا ہے- ویسے قرآنی آیات کے ترجمے جہاں جہاں بھی دیئے گئے ہیں، ان کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں-



باب اول

خدا

قرآن ایک ایسا صحیفہ ہے جس کا اصل موضوع انسان ہے اور وہ اپنے آپ کو انسانوں کے لیے ہدایت (ھدیٰ للناس) کہتا ہے- تاہم "اللہ" بھی، جو خدا کا اسم معرفہ ہے- قرآن میں (رب، رحمان اور دوسرے صفاتی ناموں کو چھوڑ کر) اڑھائی ہزار سے زیادہ بار آیا ہے- لیکن قرآن اللہ اور اس کی ماہیت کے بارے میں کوئی مقالہ نہیں ہے- اللہ کا وجود، قرآن کے نقطہ نظر سے، قطعی طور پر وظائفی (functional) ہے- وہ اس کائنات کا اور انسان کا خالق ہے، اور خصوصیت کے ساتھ انسان کو ہدایت دینے والا ہے- نیز اس کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے آزمانے والا اور اسے رحمدلانہ انصاف مہیا کرنے والا ہے-

اس رحمدلانہ انصاف کو جدید اہل قلم اکثر "رحم کی آمیزش والے انصاف" سے تعبیر کرتے ہیں- لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، باضابطہ تخلیقیت، رزاقیت، ہدایت اور انصاف اور رحم: یہ سب اوصاف ایک وحدت کی صورت میں قرآن کے الوہی تصور میں رچے بسے ہوئے ملتے ہیں- چونکہ یہ سب باہم جڑے ہوئے تصورات ہیں، اس لیے ہمیں اگلے صفحات میں خدا کے بارے میں بہت کچھ کہنا پڑے گا- اس باب میں ہم مختصراً ان سوالوں پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ خدا کی ضرورت کیوں ہے، اور ایک خدا کی کیوں ہے؟ اور قرآن کے نقطہ نظر سے ان سوالات کا منشا کیا ہے-

قرآن کے ایک سرسری مطالعے سے جو فوری تاثر ملتا ہے وہ خدا کے لامحدود جاہ و جلال کا ہے- اور اتنا ہی لامحدود اس کا رحم ہے- اگرچہ بہت سے مغربی سکالروں نے (ناواقفیت اور تعصب کے ملے جلے اثر تلے) قرآن کے خدا کو خالص طاقت، بلکہ سفاک طاقت کے ارتکاز کی صورت میں پیش کیا ہے- درحقیقت ایک وہمی اور متلون مزاج جابر! لیکن قرآن خدا کی بات اتنے مختلف

قرآن میں اور اتنے تواتر کے ساتھ کرتا ہے کہ جب تک یہ تمام بیانات جمع کر کے ان کی جامع ذہنی تصویر نہ بنائی جائے، کسی موضوعی اور من مانی سوچ کے بغیر، تو قرآن کے تصور خدا کے ساتھ انصاف کرنا، اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو گا۔

پہلے تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا آخر کیوں؟ کیوں نہ نیچر اور اس کے عناصر اور اس کی کارکردگی کے طریقوں کو اپنے آپ کھڑا ہونے دیا جائے اور کسی اعلیٰ ذات کو بیچ میں نہ لایا جائے جو آ کر حقیقت کو پیچیدہ کر دیتی ہے اور انسان کی عقل اور روح پر غیر ضروری بوجھ ڈال دیتی ہے۔ قرآن اسے ''ایمان بالغیب'' سے تعبیر کرتا ہے (سورہ الانبیاء ۲۱:۴۹، الفاطر ۳۵:۱۸، یٰس ۳۶:۱۱، ق ۵۰:۳۳، الحدید ۵۷:۲۵ وغیرہ) یہ ''غیب'' پیغمبر جیسے کچھ لوگوں کے لیے وحی کے ذریعے ''شہود'' بنا دیا گیا ہے (مثالیں: سورہ التکویر ۸۱:۲۴، یوسف ۱۲:۱۰۲، ھود ۱۱:۴۹، آل عمران ۳:۴۴) اگرچہ یہ ''غیب'' سوائے خدا کے اور کسی کو پوری طرح معلوم نہیں (اس کی متعدد مثالیں قرآن میں ہیں جیسے سورہ الجن ۷۲:۲۶، التغابن ۶۴:۱۸ وغیرہ) تاہم خدا کے وجود کا ایسے لوگوں کو یقین دلایا جا سکتا ہے جو سوچ بچار کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح یہ کوئی ''بے دلیل'' یا ''خلاف دلیل'' ایمان نہیں رہتا، بلکہ یہ سب سے بڑی سچائی بن جاتا ہے۔ یہ قرآن کا کام ہے۔ اگر یہ کام سرانجام پا جاتا ہے تو ہر چیز سرانجام پا جاتی ہے۔ اگر نہیں، تو پھر کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

لیکن یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے حقیقت کے طالبوں کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔ اگر وہ یہ نہیں کرتے تو وہ کسی طرح بھی طالب علم نہیں کہلائے جا سکتے۔ چنانچہ یہ ان سے کوئی غیر معمولی یا غیر معقول یا ان کے فرائض سے زائد مطالبہ نہیں ہے۔ ایک طالب حقیقت کو وہ کچھ بغور سننا چاہیے جو قرآن اس سے کہنا چاہتا ہے ''جو رحمان سے بن دیکھے ڈرتا رہا، اور جو رجوع ہونے والا دل لے کر آیا ہے'' (ق ۵۰:۳۳) ''ان واقعات میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو، یا وہ بات کو متوجہ ہو کر سنتا ہو'' (ق ۵۰:۳۷)۔ اس طرح کی آیات ہر جگہ ہیں ''ان کا حال تو ایسا ہے کہ جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو'' (حم السجدہ ۴۱:۴۴) لیکن خدا اتنا دور تو نہیں ہے کہ اس کے اشارے سنے نہ جا سکیں۔ ''اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' (ق ۵۰:۱۶)

اتنا قریب اور پھر اتنا دور! مسئلہ یہ نہیں کہ انسان کو کس طرح خدا کے وجود پر طویل اور پیچیدہ اور الٰہیاتی ثبوت دے کر ایمان کی طرف لایا جائے، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی توجہ بعض سامنے کے حقائق کی طرف مبذول کر کے اور پھر ان حقائق کو خدا کی یاددہانیوں میں تبدیل کر کے اسے جھنجھوڑ کر ایمان کی حالت کی طرف لایا جائے۔ اسی لئے تو قرآن بار بار اپنے آپ کو (اور پیغمبرؐ کو بھی) نذیر (یاددہانی کرانے والا) کہتا ہے۔

انسان کو یاددہانی کرانے کے لیے جس متواتر اور طاقتور جنبش (Thrust) کی ضرورت ہے اس کے بڑے نکات یہ ہیں: (۱) خدا کے سوا ہر چیز کا انحصار خدا پر ہے، جس میں قدرت کا یہ کارخانہ (Nature) بھی بتمام وکمال شامل ہے (2) خدا اپنے تمام جاہ وجلال اور طاقت کے باوجود لازماً ایک رحمت والا خدا ہے (3) ان دونوں پہلوؤں کا ماحصل یہ ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان ایک صحیح تعلق قائم ہو۔ ایک عابد اور معبود کا تعلق۔ اور اس کے نتیجے میں خود انسان اور انسان کے درمیان ایک صحیح تعلق کی صورت بنے۔ یہ ایک لازمی امر ہے کہ تعلق کی یہ معیاری صورتیں اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان کو جانچنے والا قانون بھی ہو، چاہے وہ انسان انفرادی حالت میں ہو، اجتماعی حالت میں ہو یا معاشرے کا ایک حصہ ہو۔ ایک دفعہ ہم ان تین نکات پر پوری طرح حاوی ہو جائیں تو وجود کے اس پورے نظام کی مطلق مرکزیت بھی، ایک بڑی حد تک، ہماری سمجھ میں آ جائے گی۔ اس لیے کہ قرآن کا ہدف انسان اور اس کا طرز عمل ہے، نہ کہ خدا۔

ہم باب چہارم میں زیادہ تفصیل میں جا کر اس امر کی وضاحت کریں گے کہ نیچر ایک محکم اور باہم مربوط ومسلک ڈھانچا (structure) ہے جس میں کوئی خلا نہیں، کوئی شکستگی نہیں، نظم ونسق کا کوئی خلل نہیں۔ یہ اپنے ہی قوانین کے مطابق چلتی ہے، جو اس میں خدا نے راسخ کر دیئے ہیں، اور اس لیے یہ خودمختار (autonomous) ہے لیکن یہ مطلق العنان (autocratic) نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے اندر اس کے وجود کے لیے کوئی اختیارنامہ (warrant) نہیں ہے اور یہ اپنے آپ کی وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔

عقلی اور اخلاقی مطلقیت (ultimacy) کے اس فقدان سے یہ اہم سوال اٹھتا ہے کہ اس کا وجود آخر آیا کہاں سے؟ خاص طور پر اس نازک سوال کا جواب دیا جانا بہت ضروری ہے کہ قدرت کا یہ کارخانہ اس طرح کیوں ہے، یہ کیوں اتنا بھرپور اور مکمل ہے۔ ایسا کیوں نہیں کہ صرف عدم ہوتا اور خالص خلا وجود متبادل صورتوں میں سے ہر لحاظ سے زیادہ آسان اور زیادہ قدرتی متبادل ہے۔

یونانیوں سے چل کر ہیگل تک اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ''کچھ نہیں'' (Nothing) ایک خالی لفظ ہے، جس کے کوئی حقیقی معنی نہیں ہیں، اس لیے کہ ''کچھ نہیں'' کا کوئی وجود نہیں ہوسکتا اور ہم اس کا تصور نہیں باندھ سکتے -لیکن پھر سوال یہ ہے کہ ہم اس کا تصور کیوں نہیں باندھ سکتے ؟ یہ یقیناً نظری طور پر ممکن ہے کہ کوئی نیچر بھی موجود نہ ہو- جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نیچر ''موجود'' چیز ہے اور اسی لیے وہ کسی طور ''ضروری'' ہے- ان کی مثال ایک بچے کی سی ہے جس کے لیے کھلونے ''موجود'' ہیں اور اس لیے کسی نہ کسی طرح ''ضروری'' ہیں-

یہی ٹھیک ٹھیک معنی ہیں منحصر ہونے (contingency) کے، لیکن ایک منحصر وجود کا سوچا بھی نہیں جاسکتا بغیر اُس وجود کے جس پر وہ منحصر ہے- اگر چہ یہ ممکن ہے کہ انسان اس وجود میں جو منحصر ہے اتنا مستغرق ہو جائے کہ اسے اس وجود کا خیال بھی نہ رہے جس پر وہ منحصر ہے- پھر وہی بچے والی مثال کہ جو اپنے کھلونوں میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ وہ یہ جاننا بھی نہیں چاہتا کہ ان کے ماورا کیا ہے-لیکن قرآن کی رو سے ایک دفعہ جب تم یہ سوچنے لگو کہ یہ کارخانہ قدرت کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا تو تمہیں ''خدا کو پالینا'' چاہے- یہ خدا کے وجود کا ''ثبوت'' نہیں ہے کیونکہ قرآن کے نقطۂ نظر سے اگر تم ''خدا کو پا نہیں سکتے'' تو تم اسے کبھی ثابت بھی نہیں کر سکو گے''اور سیدھا راستہ تو خدا تک ہی پہنچتا ہے اور کچھ راستے غلط رخ پر بھی جاتے ہیں'' (النحل ۱۶:9) بعض اسباب کی رو سے جن کا ذکر آگے آئے گا ''پانا'' کوئی خالی لفظ نہیں ہے- یہ تقاضا کرتا ہے کہ اولین اور بنیادی حقیقت کی پوری طرح نئے سرے سے جانچ کی جائے اور یہ ہر چیز کو نئے معانی کے ساتھ نئے تناظر میں لے آتا ہے اور اس دریافت کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کو دوسری موجود چیزوں میں سے ایک چیز نہیں سمجھا جاسکتا- مابعد الطبیعیاتی اقلیم میں ازلی، خالق، قائم بالذات وجود اور دوسری طرف مستعار مخلوق اور منحصر چیز کے درمیان وجود (being) میں برابر کی شراکت نہیں ہوسکتی- یہ ''شراکت'' البتہ دوسرے زمرے والوں کے درمیان ہوسکتی ہے-قرآن نے جو ''شرک'' کی اتنی مذمت کی ہے تو اس کی جڑیں اسی مابعد الطبیعیاتی اقلیم میں موجود ہیں، اور اسی سے، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، یہ مذمت اخلاقی دائرے کی طرف چلی جاتی ہے-

خدا وہ بُعد ہے جس سے دوسری ابعاد ممکن ہوتی ہیں- وہ ہر چیز کو معنی اور زندگی مہیا کرتا ہے- وہ سب پر محیط ہے اور حقیقی معنوں میں لامحدود ہے اور صرف وہی لامحدود ہے- باقی جو کچھ ہے اس کا محدود ہونا اور اس کی مخلوقیت اس کے وجود کے تانے بانے کے اندر ہی موجود ہوتی ہے- ''ہر چیز

جو اس زمین پر ہے (مطلب یہ کہ نیچر کا سارا نظام) فنا ہونے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے" (الرحمان ۵۵:۲۶-۲۷) "کہو اگر سمندر میرے رب کی (تخلیقی) باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، اگر ہم ویسا ہی سمندر اس کی مدد کو کیوں نہ لائیں" (الکھف ۱۸:۱۰۹) یہ صورت حال اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ صرف ایک ہی خدا ہو سکتا ہے، اس لیے کہ جب بھی انسان ایک سے زیادہ خداؤں کا تصور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہمیشہ ایک ہی خدا "اول" کی صورت میں اس کے سامنے آتا ہے۔ "دو خدا نہ بنالو، خدا تو بس ایک ہی ہے" (النحل ۱۶:۵۱) "اللہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں" (آل عمران ۳:۱۸) "اے محمد! ان سے کہو اگر اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ (لازماً) عرش کے (واحد) مالک کے مقام پر پہنچنے کی کوشش کرتے" (بنی اسرائیل ۱۷:۴۲)

چونکہ قدرت کا یہ سارا نظام بہت مربوط اور جڑا ہوا ہے اور ایسے قوانین کے تحت چل رہا ہے جو اس کی جبلت میں رکھ دیے گئے ہیں تو "علت اور معلول کے درمیان ایک قدرتی ربط" دیکھنے میں آتا ہے اور جیسا کہ ہم باب چہارم میں زیادہ اچھی طرح دیکھیں گے۔ قرآن اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ خدا قدرت کا یہ نظام خلق کرتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ نہ اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا اور یہ نظام قدرت، یا خدا اور انسانی ارادہ (جیسا کہ باب دوم میں مفصل ذکر ہوگا) ایک دوسرے کے "مدمقابل" ہیں اور ایک دوسرے کی قیمت پر اپنا عمل سرانجام دیتے ہیں۔ نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا انسان اور نیچر کے افعال سے زائد اور ماورا اپنا فعل انجام دیتا ہے۔ خدا کی نگری کے بغیر نیچر اور انسان کی نگری خطاکار، بے فائدہ اور اپنے آپ کو ضائع کرنے والی ہوتی ہے۔ اشیاء اور انسان دراصل خدا سے اسی طرح براہ راست متعلق ہیں جس طرح وہ ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ اور ہمیں اپنے اس بیان کی تعبیر اس سے بڑھ کر یوں کرنی چاہیے کہ خدا اس کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح ایک چیز نہیں ہے۔ یا دوسری موجود اشیاء کے درمیان ایک موجود شے نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کے "ساتھ" ہے۔ وہ ہر چیز کی "سالمیت" میں ہے۔ "اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا" (الحشر ۵۹:۱۹) اور جس طرح ہر چیز کا براہ راست تعلق اس سے ہے، اسی طرح ہر چیز، دوسری چیزوں کے واسطے سے بھی، خدا سے متعلق ہے۔ چنانچہ خدا حقیقت کا اصل معنی ہے، ایک ایسا معنی جس کا اظہار اور جس کی

وضاحت یہ کائنات کرتی ہے اور جس میں انسان بھی اپنا حصہ ادا کرتا ہے- یہ امر کہ اس کائنات میں جو بھی چیز ہے وہ خدا کی ''نشانی'' ہے، باب چہارم میں وضاحت سے بیان کیا جائے گا- اور یہ بات کہ اس کی بامعنی اور مفید سرگرمی کے دائرے کو انسان آگے بڑھاتا ہے، اس پر خاص طور سے باب سوم میں بحث کی جائے گی-

اسی طرح سے قرآن خدا کی قوت اور جاہ وجلال پر زور دیتا ہے اور بار بار دیتا ہے- لیکن جہاں مابعدالطبیعیاتی حقیقت اس تاکید کا اصل سبب ہے، اس تاکید کی ایک تاریخی بعد بھی ہے اور وہ جاہلی عربوں کا متعدد خداؤں کو ماننا ہے، جو خدا کے علاوہ بہت سے دیوی دیوتاؤں کو پکارتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے- اس پر قابو پانے کے لیے قرآن نے کہا:

''اے ایمان والو! جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی- اور یہ کافر ہیں جو ظالم اور بے انصاف ہیں- اللہ (ہی خدا ہے) اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ زندہ ہے اور کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے- نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے- کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے- جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اسے سب معلوم ہے، اور اس کے علم میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آ سکتی، سوائے اس کے جو وہ خود ان کو دینا چاہے- اس کی سلطنت آسمانوں اور زمین سب پر چھائی ہوئی ہے اور اس کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کام نہیں، اور وہ بڑا عالی شان اور عظمت والا ہے-'' (البقرہ۲: ۲۵۴-۲۵۵)

پھر کہتا ہے:

''وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں- غائب اور حاضر ہر چیز کا جاننے والا، وہ بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے- وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں- تمام جہانوں کا بادشاہ ہے، پاک ذات ہے، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے

والا، اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا ہے- پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں- وہ اللہ ہی ہے جو خالق ہے، وجود بخشنے والا ہے، صورت گری کرنے والا ہے- اس کے لیے بہترین نام ہیں- ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکمت والا ہے-"(الحشر ۵۹:۲۲-۲۴)

اور ایک دفعہ پھر کہتا ہے:

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا- پھر اس کے ذریعے ہم نے وہ خوشنما باغ لگائے، جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا- کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ہے؟ نہیں، لیکن یہی لوگ ہیں جو اس کے برابر شریک ٹھہراتے ہیں-

اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس زمین کے ٹھہرانے کے لیے پہاڑ بنائے اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردہ حائل کیا تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے-

کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے، اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے اور کون ہے جس نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے- کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ تم لوگ بہت کم سوچتے ہو-

اور کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے، اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے اور کون ہے جس نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے- کیا اللہ کے ساتھ کوئی خدا بھی ہے؟ تم لوگ بہت کم سوچتے ہو-

اور کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری کے طور پر بھیجتا ہے- کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ہے- بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں اور کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا

ہے- اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ
کوئی اور خدا بھی ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم (اللہ کے ساتھ دوسروں کو
شریک کرنے میں سچے ہو" (النمل ۲۷: ۶۰-۶۴)

یہ آیات جہاں خدا کی حاکیت اور طاقت پر زور دیتی ہیں، وہاں یہ اس کی غیر محدود رحمت کو بھی اجاگر کرتی ہیں- جیسا کہ ان پانچ آیات سے ظاہر ہے، خدا کی حاکیت کا اظہار اس کی مخلوق کے واسطے سے ہوتا ہے- اس مخلوق کو پالنا اور اس کو رزق مہیا کرنا، خاص طور پر انسان کے معاملے میں، اور پھر اس کو نئی صورت میں دوبارہ پیدا کرنا! خدا کا نیچر کو اور انسان کو پیدا کرنا، اور نیچر کو انسان کے لیے پیدا کرنا خدا کی اولین اور بنیادی رحمت ہے- اس کا قادر ہونا، اس کا خلاق ہونا اور رحیم ہونا، یہ صفات نہ صرف ساتھ ساتھ موجود ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اندرونی طور پر مربوط اور بعینہ ایک ہیں- "اس نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے" (الانعام ۶: ۱۲) "اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے" (الاعراف ۷: ۱۵۶) اس کے لامحدود ہونے کا مطلب صرف یک طرفہ طور پر ماورائے ادراک ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب اپنی مخلوق کے "ساتھ" ہونا بھی ہے- یہ خیال میں رہے کہ وہ رگِ جان سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہے (ق ۵۰: ۱۶) جب کبھی انسان سے کوئی خطا سرزد ہوتی ہے اور وہ اس پر تہہ دل سے نادم ہوتا اور خدا کی مغفرت کا طلب گار ہوتا ہے تو خدا فوراً اس کی طرف پلٹتا ہے اور اسے معاف کر دیتا ہے- دراصل اس کی بہت سی صفات جو بیان کی جاتی ہیں ان میں رحیم اور رحمان کے ساتھ "تواب" بھی ہے، یعنی پلٹنے والا اور معاف کرنے والا، بخلاف "چھوڑنے والے" کے- (دیکھیے البقرہ ۲: ۳۷، ۵۴، ۱۶۰، ۱۸۷، المائدہ ۵: ۳۹، ۷۱، التوبہ ۹: ۱۱۸، طٰہٰ ۲۰: ۱۲۲) اور "غفور" یعنی گناہ بخشنے والا (دیکھیے البقرہ ۲: ۱۷۳، ۱۸۲، ۱۹۲، ۱۹۹، ۲۱۸، ۲۲۵، ۲۲۶، المومن ۴۰: ۳) اور اسی طرح کے ۱۱۶ دوسرے مقامات جن میں قریب قریب سب جگہوں پر ان کے بعد "رحیم" کی صفت آتی ہے- جو لوگ صحیح معنوں میں توبہ کرتے ہیں اور نیک کام کرنے لگتے ہیں، خدا ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے- (الفرقان ۲۵: ۷۰)

خدا دراصل وہ روشنی ہے جس میں ہر چیز کو اپنا اصل وجود اور اس کا کردار دکھائی دیتا ہے-

"اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے- اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے
ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو- چراغ ایک فانوس میں ہو- فانوس کا

حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا- اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی- جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے- اس طرح روشنی پر روشنی! اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے، رہنمائی کرتا ہے-" (النور۲۴:۳۵)

دوسری طرف خدا کے خلاف جو قوتیں ہیں، ان کی مثال ایسی ہیں:

"جیسے ایک گہرے سمندر میں مرکب اندھیرا، کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس کے اوپر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے- اگر آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے- جسے اللہ نور نہ بخشے تو اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں-" (النور۲۴:۴۰)

خدا کی طاقت اور اس کی عظمت ایک بار بار دہرایا جانے والا مضمون ہے- اس لیے کہ اس کی طاقت اور عظمت ہی اس کے اس کائنات کو محیط ہونے کا اصل مفہوم ہیں- اس پر اتنے تکرار سے زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی اس خطرناک حماقت کو طشت از بام کیا جائے جس سے وہ محدود ہستیوں کو لامحدود ہستی کے ساتھ لا کھڑا کرتے ہیں اور ان کو ایک جیسا سمجھتے ہیں یا پھر وہ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان کچھ بیچ والے خدا فرض کر لیتے ہیں، جبکہ وہ اپنی مخلوقات کے ساتھ راست اور بہت قریبی تعلق رکھتا ہے لیکن ہمارے لیے اس سے بھی اہم یہ بات ہے کہ خدا اپنی عظمت، قدرت اور سارے جہان کا احاطہ کرنے والی موجودگی کا اظہار اپنی رحمت کے شواہد کے ایک پورے سلسلے کے ذریعے کرتا ہے، جس میں وہ مخلوق پیدا کرتا ہے، پھر اس مخلوق کو روزی مہیا کرتا ہے، اسے اپنی منزل تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے، اور پھر اپنے ان بندوں کی طرف پلٹتا اور انہیں معاف کرتا ہے جو ایک دفعہ اس سے دور ہو جانے کے بعد اس کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں- جو ان کے وجود، ان کی زندگی اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ ہے-

جہاں ہم تخلیق پر اور انسان کے نیچر کو استعمال کرنے کے موضوع پر باب چہارم (نیچر) میں زیادہ مکمل طور پر بحث کریں گے، اور ہدایت کے موضوع پر باب پنجم (رسالت اور وحی) میں، اور انصاف پر باب سوم (معاشرہ) اور باب ہشتم (عقیدہ معاد) میں بات کی جائے گی، وہیں ان سب موضوعات پر ہم یہاں مختصراً اسی حد تک کلام کریں گے جس حد تک کہ ان کا تعلق خدا سے ہے-

پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا کسی سنجیدہ مقصد کے بغیر محض ایک شغل بیکار، تفریح یا کھیل کے طور پر تخلیق نہیں کرتا۔ یہ بات قادر مطلق کی قدرت اور رحیم کی رحمت کے منافی ہے کہ وہ دل بہلاوے کے لیے یا محض ایک ترنگ میں آ کر کھلونے پیدا کرے۔ ایک اندھی تقدیر تو یہ کچھ کر سکتی ہے لیکن خدا ایسا نہیں کر سکتا۔ ''(وہ مومن لوگ) جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (اور کہہ اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا'' (آل عمران ۳:۱۹۱) ''اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کیا (ص ۳۸:۲۷)'' اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان کے درمیان ہے، کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے، اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے تو اپنے ہی پاس سے بنا لیتے (نہ کہ اپنی مخلوق کے ذریعے) اگر ہمیں یہی کچھ کرنا ہی تھا'' (الانبیاء ۲۱:۱۶-۱۷) اور پھر آخر میں انسان کی پیدائش کے متعلق: ''اور کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی نہیں لوٹنا۔ پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی ---'' (المومنون ۲۳:۱۱۵-۱۱۶) ''کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟'' (القیامہ ۷۵:۳۶)

چنانچہ قرآن صرف اتنا ہی نہیں کرتا کہ وہ ملحدوں سے اور ان دوسرے لوگوں سے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات محض اتفاقی چیز ہے اور مادے کا کھیل ہے، اپنی راہ الگ کر لیتا ہے، بلکہ ان سے بھی الگ ہو جاتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے اس کائنات کو محض کھیل کے طور پر پیدا کیا ہے، جن میں وہ صوفیہ بھی شامل ہیں جو واقعی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ خدا نے (ایک مشہور حدیث کی رو سے جسے وہ پیغمبرؐ سے منسوب کرتے ہیں) کہا کہ ''میں ایک مخفی خزانہ تھا، لیکن میں چاہتا تھا کہ جانا جاؤں، اس لیے میں نے یہ ساری خلقت پیدا کی۔'' جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ''اگر ہم کھیل کھیلنا چاہتے تو ہم یہ اپنے آپ ہی کر سکتے تھے'' اور اپنے آپ کو خود اپنے سامنے ظاہر کرنے کا مطلب تو کھیل ہی ہو سکتا ہے اور اگر یہ دنیا محض لہو و لعب ہے تو پھر قرآن کی رو سے ہدایت، گمراہی اور انصاف کی یہ ساری قیل و قال نہ صرف بے مقصد ہو جاتی ہے بلکہ ایک بہت بڑا دھوکا ثابت ہوتی ہے۔

سارا معاملہ ایک ایسے یقین پر آ کر ٹھہرتا ہے جو یونہی نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد اس سوچ پر ہے کہ آیا یہ پوری کائنات، جس طرح یہ منظم ہے اور اپنا کام سرانجام دے رہی ہے، کیا یہ محض

اتفاق ہوسکتی ہے یا یہ کسی با مقصد خالق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ اس یقین کو بھی منہدم کر دیتے ہیں کہ یہ کائناتیں دائرے کی صورت میں بار بار پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ دائرے میں گھومتی ہوئی کائنات بے شک بہت سے مفکرین۔ خصوصاً اہل یونان۔ اور کچھ جدید منجموں کے لیے بہت پرکشش ہو، تاہم ایک دائرے کی صورت میں جو حرکت ہوتی ہے وہ کسی مقصدیت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کا تعلق گھومنے والے جھولوں کی دنیا سے لگتا ہے۔

جب انسان کا مقصد خدا کی 'عبادت' کرنا ہے، یعنی اپنی اعلیٰ ترین قابلیتوں کو اپنی مرضی سے خدا کے حکم کے مطابق ڈھال لینا، اور نیچر کا (جو اپنے آپ مسلم اور مطیع خداوند ہے) استعمال کرنا، تو اسے زندہ رہنے اور ''صحیح راستہ تلاش کرنے'' کے کافی ذرائع مہیا کیے جانے چاہیں۔ چنانچہ خدا جو اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے نیچر اور انسان کو وجود میں لایا، اسی متواتر اور پیہم رحمت سے اس نے انسان کو علم کی تخلیق کرنے اور اسے اپنے جائز اور منصفانہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا ادراک اور ارادہ بھی ودیعت کیا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انسان کا اہم امتحان ہوتا ہے: کیا وہ اپنا علم اور قوت خیر کے لیے استعمال کرے گا یا شر کے لیے؟ کامیابی کے لیے یا نقصان کے لیے؟ زمین کو سنوارنے کے لیے یا اس میں فساد پیدا کرنے کے لیے؟ یہ ایک انتہائی نازک کام ہے۔ انسان کے لیے سب سوالوں سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا وہ تاریخ کو اچھے مقاصد کی طرف موڑ سکتا ہے، یا وہ اس کی خودسری اور متلون مزاجی کے سامنے بے بس ہو کر رہ جائے گا۔

اس وجہ سے خدا کی رحمت اپنے منطقی عروج کو پہنچ جاتی ہے، جب وہ ''اپنے رسول بھیجتا ہے'' ''کتابیں نازل کرتا ہے'' اور انسان کو ''راستہ'' دکھاتا ہے۔ یہ ہدایت انسان کی جبلت میں اس طرح گندھی ہوئی ہوتی ہے کہ جیسے اس کے دل میں خیر وشر کی تمیز موجود ہے (الشمس ۹۱:۸) اور جیسے انسانوں نے اس زندگی میں آنے سے پہلے خدا سے اقرار کیا تھا کہ وہی ان کا پروردگار ہے۔ (الاعراف ۷:۱۷۲) انسان ان باتوں کی بہت کم پروا کرتا ہے جبھی اخلاقی بحران واقع ہونے کی صورت میں خدا اپنے پیغام بھیجتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انسان کے رویے کا اخلاقی پہلو ہی ہے جو پھسل پھسل جاتا ہے اور مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس کی بقا اور کامیابی کے لیے بہت بنیادی اور اہم ہے۔ چنانچہ رحمت کے اس تمام عمل کے لیے، یعنی تخلیق سے لے کر رزق مہیا کرنے اور پھر ہدایت دینے تک، انصاف اور جزا ایک لازمی بات ہے۔ اس لیے کہ اس ہدایت ہی کے ذریعے انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اندر وہ روشنی (جسے قرآن میں تقویٰ کہا

گیا ہے) پیدا کرے گا۔۔ جس سے وہ بھلے اور برے میں تمیز کر سکے۔ جیسا کہ ہم باب دوم اور باب سوم میں تفصیل سے بتائیں گے، انسان کو تقویٰ کی روشنی سب سے پہلے اس مقصد کے لیے استعمال کرنی ہے کہ وہ اپنے اعمال کا جائزہ لیتے ہوئے کسی خود فریبی میں مبتلا نہ رہے۔

یہ سارا سلسلہ۔تخلیق، ربوبیت، ہدایت اور جزا جو سب رحمت کے مظاہر ہیں۔ اس قدر معقول اور متوازن ہے کہ قرآن اس پر حیرت اور تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے بارے میں سوال کیا جائے۔۔ جن دو نکات پر سب سے زیادہ سوال کیا جاتا ہے وہ ابتدا اور انجام سے متعلق ہیں۔ یعنی خدا کا کردار بطور ایک خالق کے اور بطور جزا و سزا دینے والے کے!

ایسے کچھ لوگ بھی جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ سزا و جزا اور محاسبہ ایک رحیم خدا کی نسبت سے بہت سخت بات ہے۔ لیکن ایسے مذہبی نظریوں نے بھی جو سارا زور خدا کی محبت پر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اپنے بندوں کی خاطر بہت کچھ قربان کر دیتا ہے، انہوں نے بھی انسان کی اخلاقی نشوونما کے سلسلے میں کوئی بڑی خدمت انجام نہیں دی۔ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو تو ایک خاص طریقے سے سزا دی جا سکتی ہے لیکن یہ سمجھنا قرین عقل نہیں ہے کہ انسان ابھی تک ایک طفل ہے، باوجود اس امر کے کہ اس کے اندر ''تقویٰ'' کی جو مشعل ہے، وہ چمکے گی اور جگمگائے گی۔ ایک بالغ قصوروار اور ایک بچے کے درمیان، بہت فرق ہوتا ہے، ورنہ انسان آخر کس وقت بالغ ہوگا؟ یہ جو تصویر ہے ایک شفیق باپ کی اور ایک بگڑے ہوئے بچے کی، اس پر ان قرآنی آیات کی راست ضرب پڑتی ہے جو خدا کے بارے میں لہو و لعب اور غیر سنجیدگی منسوب کرنے سے منع کرتی ہیں۔ اسی طرح ان آیات کی بھی (دیکھیے باب سوم) جو یہودیوں اور عیسائیوں پر اس لیے تنقید کرتی ہیں کہ وہ خدا پر اپنا حق جتاتے ہیں۔

لیکن قرآن کی نگاہ میں سب سے زیادہ بدکار اور قابل الزام وہ لوگ ہیں جو رسمی طور پر یا واقعتہً خدا کے وجود سے انکار کرتے ہیں، یعنی مادہ پرست ملحد اور ''وہ لوگ جو خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔'' یہ آخری جملہ ایسا ہے کہ اس پر قرآن بہت شدومد سے بات کرتا ہے۔ اگر خدا پر ایمان ہو تو باقی چیزیں ایک منطقی ترتیب کے ساتھ چلی آتی ہیں لیکن اگر خدا پر ایمان ہی نہ ہو تو باقی سب چیزیں۔۔۔ یعنی خدا کا نیچر کو سنبھالنا اور ایک قاعدے میں رکھنا، ہدایت مہیا کرنا اور معاملات زندگی کے انجام پر (آخرت کے روز) فیصلہ کرنا۔۔۔ یہ سب چیزیں یا تو مشکوک

ٹھہرتی ہیں یا یہ اتنے زیادہ قضیوں کا سبب بنتی ہیں کہ ان پر الگ بحث کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے نتائج یا تو مان لیے جاتے ہیں یا رد کر دیے جاتے ہیں، جس سے یہ پورا سلسلہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سارے سلسلے کو جوڑ کر رکھنے والا عامل خدا ہی ہے اور وہی ہے جو اسے معنی عطا کرتا ہے۔

یہ اسی سیاق و سباق میں ہے کہ نیچر اور اس کے باضابطہ عمل کے بارے میں قرآن کی جس دلیل کا خاکہ ہم نے اوپر دیا، وہ اب پوری طرح بامعنی ہو جاتی ہے: قرآن خدا کے وجود کو "ثابت" نہیں کرتا، بلکہ موجودہ کائنات سے "اس کی طرف اشارہ" کرتا ہے۔ اگر کوئی منظم کائنات نہ بھی ہوتی، بلکہ صرف ایک تنہا زیست (being) ہوتی تو پھر بھی وہ اپنے سے ماورا کسی چیز کی طرف اشارہ کرتی، کیونکہ وہ خود محض مشروط (contingent) ہوتی۔ لیکن یہاں صرف ایک مشروط و منحصر زیست نہیں ہے بلکہ ایک منظم اور بہترین طریقے پر چلنے والی ایک پوری کائنات ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک اس طرح کا نظام جس میں سب اجزاء ایک دوسرے پر منحصر ہوں اسے خدا کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ایک تنہا مشروط و منحصر وجود کو۔ اس لیے کہ ایک باقاعدہ اور مکمل اکائی میں تمام اجزاء اس کو اور اپنے آپ کو سہارا دینے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، اور باہر کی کسی ہستی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم اگرچہ ایک ہیئتِ نامیہ (organism) کے تمام اجزاء ایک دوسرے کو سنبھالے ہوئے بھی ہوں تو بھی وہ ہیئت بحالت مجموعی اپنی ابتدا کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کرتی۔ بعض معاصر اہل فکر نے اس طرح کا خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کائنات میں نظم کا تصور ہی بے معنی ہے۔ نظم کے لیے ایک کارگزاری یا ایک معیار کا ہونا لازم ہوتا ہے جس کے حوالے سے نظم کی بات کی جائے۔ چنانچہ نظم کا کوئی بھی تصور ہو وہ خود ہمارے ذہنوں کی موضوعیت کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ (میرے دفتر میں نظم ہوگا اگر کتابیں، فائلیں اور ڈسک وغیرہ ایسی جگہ پڑی ہوں جو میرے کام میں سہولت پیدا کریں، نہ کہ اس کی راہ میں رکاوٹ ہوں) اس لیے کائنات پر اس اصطلاح کا اطلاق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ دلیل جو پہلی دلیل کے مقابل آیا چاہتی ہے، بے جا طور پر ایک معروضی نظم کا موازنہ ایک ایسی موضوعی توقع کے ساتھ کرنا چاہتی ہے جو بعض انسانی معمولات سے پیدا ہوتی ہے۔ نیچر کے فینامینا میں باقاعدگی، تطابق اور متناسب تغیرات کو نیچر کے سائنس دانوں نے نظم کا نام دیا، بغیر ان

توقعات کے ضروری حوالے کے جو انسانی معمولات سے پیدا ہوتی ہیں- یہی وجہ ہے کہ یہ معروضی نظم "دریافت" کیا گیا ہے- چنانچہ بہت سے ملحد اور لاادریے قسم کے سائنس دانوں نے خدا کو تو نہ پہچانا، لیکن ایک قدرتی نظم کو پہچان لیا-

اب قرآن کی فکر میں ایک نہایت باریک اور اہم نکتہ آتا ہے- کیا یہ ماننا زیادہ قرین عقل ہے کہ کائنات میں یہ نظم اور ترتیب، جو اتنا وسیع اور اتنا پیچیدہ ہے- اس کے پیچھے کوئی مقصد ضرور ہے- یا یہ ماننا زیادہ قرین عقل ہے کہ یہ سب کچھ خالص اتفاق ہے؟ کیا اتفاق سے پیدا شدہ نظم مربوط اور پائیدار بھی ہو سکتا ہے؟ کیا اتفاق خود یہ دلالت نہیں کرتا کہ اس کے پیچھے زیادہ بنیادی مقصدیت کا ایک ڈھانچا ہوگا؟ خدا پر ایمان، اگرچہ یہ ایمان ہی ہوتا ہے (کیونکہ قرآن دوسرے زیادہ طاقتور دلائل پر انحصار کرتا ہے) یہ درحقیقت تجربی، لیکن مشروط شہادتوں سے لازماً زیادہ مضبوط ہوتا ہے کیونکہ یہ کم معقول، بلکہ غیر معقول، بات ہے کہ اتنا مہیب، عظیم الشان اور پائیدار کائناتی نظم خالص اتفاق ہے- اسی وجہ سے قرآن بار بار یہ دعوت دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے "کیا تم غور نہیں کرتے؟" "کیا تم سوچتے نہیں ہو؟"، "کیا تم اس طرف دھیان نہیں دیتے؟" اور ہم اس بات کو دہرائیں گے کہ یہ غور کرنا، سوچنا اور دھیان دینا، ان سب کا تعلق خدا کے وجود کے لیے رواجی دلائل مہیا کرنے یا خدا کے وجود کو "استخراج" کرنے سے نہیں، بلکہ اسے "دریافت" کرنے سے ہے، اور ذہن سے پردہ ہٹا کر اس کا ایک تصور قائم کرنے سے ہے-

ایک انسان جس کو یہ تصور ودیعت ہوتا ہے، وہ حقیقت کے ساتھ صحیح طور پر ہم آہنگ ہو جاتا ہے، اس لیے کہ 'ہونے' کی بنیاد ہی اسے آسرا مہیا کرتی ہے "وہ سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا" دوسرے معنوں میں اسے خدا کی تائید کے سوا کسی چیز کے کھونے کا ڈر نہیں ہوتا- اس کی شخصیت اتنی مضبوط و مامون ہو جاتی ہے کہ وہ کسی حملہ آور کے مقابلے میں محفوظ ہوتی ہے- خدا اس کا واحد مددگار اور ایک ہی پناہ گاہ ہوتا ہے- تمام دوسری مفروضہ پناہ گاہیں کسی کام کی نہیں ہوتیں- "جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے- کاش یہ لوگ جانتے!" (العنکبوت ۲۹:۴۱)- چھوٹی مگر زوردار لہجے والی سورہ اخلاص (۱۱۲) جسے اسلامی روایت میں بجا طور پر پورے قرآن کا نچوڑ قرار دیا جاتا ہے، خدا کو 'الصمد' کہتی ہے جس کے معنی ہیں ایسی چٹان جو نہ تو ہلائی جا سکے اور نہ توڑی جا سکے جس میں کوئی دڑاڑیں یا مسام نہیں ہوتے، جو سیلابوں کے

مقابلے میں یقینی ملجا و ماوی ہوتی ہے- ایسی چٹان سے کم تر کسی چیز پر اپنے آپ کو سہارنا اپنے آپ کو نقصان میں ڈالنا ہے (جیسا کہ قرآن بار بار کہتا ہے) اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے مکڑی کے جالے میں رہنا منظور کر لیا ہے- انسانوں کے اعمال جن کی بنیاد اس چٹان پر نہ ہو "ان کا کوئی وزن نہیں ہوتا" چاہے وہ خود ان کو کتنا ہی اعلیٰ سمجھتے ہوں- ایسے اعمال کا کوئی رشتہ زندگی کی اس قطعی بنیاد سے نہیں بن پاتا جس سے تمام قدریں پھوٹتی ہیں- چنانچہ وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے "ہر طرف اڑتی خاک" (الفرقان ۲۵:۲۳) صرف خدا ہی ہے جو زندگی کو وہ قدر، وحدت اور مکمل پن عطا کرتا ہے جو خیالات اور اعمال کو کارآمد اور با معنی بناتا ہے- حقیقت کو حصوں میں تقسیم کرنا، اسے مقامیت میں محدود کرنا اور سچائی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا "شرک" ہے- "اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا- اس کے ماسوا دوسرے گناہ وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے-" (النساء ۴:۴۸)

چنانچہ خدا ایسے شخص کو اپنا دوست بنا لیتا ہے اور اس کی معاونت کرتا ہے جس نے اسے "دریافت کر لیا ہے" لیکن خدا کی دوستی ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے کوئی فرد یا کوئی قوم اپنے طور پر فرض کر لے، اگر چہ قرآن میں ایسے وعدوں کا ذکر آتا ہے جو وہ افراد کے ساتھ اور امتوں کے ساتھ کرتا ہے- انسان کے لیے ضروری ہے کہ تقویٰ اختیار کرے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو صحیح فہم حاصل ہے تو اسے ہر آن چوکنا رہنا چاہیے (جو "تقویٰ" کے لفظی معنی ہیں) انسان خدا کے معاملے میں بے احتیاطی نہیں برت سکتا- اس لیے کہ دنیا میں کوئی فرد یا امت کسی بھی وقت سچائی کی دعوے دار نہیں بن سکتی- بلکہ اس طرح کا دعویٰ چاہے وہ کوئی فرد کرے یا کوئی امت اپنے کسی پیشوا کی طرف سے کرے، درحقیقت "تقویٰ" کی کمی کا اعتراف ہے- محمد ﷺ جن پر قرآنی وحی نازل ہوئی، ان سے قرآن میں کہا جاتا ہے کہ خدا ان کے ساتھ سلسلہ وحی منقطع کر سکتا ہے، اور اگر چاہے تو ان کے دل پر مہر لگا سکتا ہے- (بنی اسرائیل ۱۷:۸۶، الشوریٰ ۴۲:۲۴) قرآن جب عیسائیوں کے اس عقیدے کا ذکر کرتا ہے جس کی رو سے وہ یسوع مسیح کو خدا مانتے ہیں تو کہتا ہے "اگر خدا عیسیٰ ابن مریم کو اور اس کی والدہ کو اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے- اور آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب پر خدا کی بادشاہی ہے---" (المائدہ ۵:۱۷)

اب ہم خدا کی قدرت کے عقیدے کی طرف آتے ہیں- اس قدرت کا سرچشمہ خدا کا رحمدلانہ تخلیقی عمل ہے، جس میں وہ اشیاء کی صحیح قدر متعین کرتا ہے اور انہیں ایک خاص ترتیب اور ناپ تول سے، نہ کہ علی الحساب اور بے سوچے سمجھے پیدا کرتا ہے- ہم اس ''ناپ تول'' اور ''نظم و ترتیب'' پر باب چہارم میں بحث کریں گے- لیکن یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ عربی زبان میں قدرت اور ناپ تول کرنے کے لیے جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے وہ 'قدر' ہے اور قرآن 'قدر' کے لفظ کو ان دونوں مفاہیم میں استعمال کرتا ہے- اسلام سے پہلے کی عرب سوسائٹی میں یہ لفظ اکثر جمع کی صورت (اقدار) میں قسمت کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا، یعنی ایک ایسی اندھی طاقت جو ایسے معاملات کو جو انسان کے کنٹرول سے باہر ہوتے تھے، متعین کرتی تھی یا ان کے بارے میں پہلے سے فیصلہ کرتی تھی- خاص طور پر اس کی پیدائش، اس کی معاش کے ذرائع، اور اس کی موت کے بارے میں- یہ ایک قنوطی عقیدہ تھا لیکن یہ اس طرح کا عقیدہ نہیں تھا کہ انسان کے سبھی اعمال ''قسمت'' کے پیش فیصلے کے تابع ہوتے ہیں-

قرآن نے 'قدر' کی یہ اصطلاح اپنا تو لی لیکن ایک اندھی اور بے رحم قسمت کے تصور کو ایک قادر مطلق، بامقصد اور رحم دل خدا میں بدل دیا- یہ قادر مطلق خدا اپنے رحمدلانہ تخلیقی عمل کے ذریعے ہر چیز کی ایک قدر متعین کرتا ہے- ہر چیز کو اس کے پورے امکانات سے نوازتا ہے- اسکے طرز عمل کے قوانین وضع کرتا ہے- یوں سمجھئے کہ اس کا کردار متعین کرتا ہے- یہ جو قدر کی تعیین کرنا ہے یہ ایک طرف تو نیچر کے باقاعدہ ہونے کی ضمانت دیتا ہے اور دوسری طرف یہ اس بنیادی اور نہ پائے جاسکنے والے فرق کا اظہار کرتا ہے جو خدا کی فطرت اور انسان کی فطرت میں موجود ہے- خالق کی اس تقسیم و تعیین میں ایسی لامحدودیت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی بھی مخلوق، چاہے اس کی قوتیں اور امکانات کتنے ہی بڑے ہوں (جیسا کہ انسان کے) شریک نہیں ہوسکتی- شریک ہونے کے بارے میں یہی ایمان ہے جس کو قرآن کا عقیدہ شرک مکمل طور پر رد کرتا ہے-

آیئے ہم تقسیم و تعیین کے اس تصور کی بالکل ٹھیک تعریف کرتے ہیں- خدا نے، نہ کہ کسی دوسرے نے، یہ قانون وضع کیے ہیں، جن کے مطابق نیچر کام کرتی ہے- اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان یہ قوانین دریافت نہیں کرسکتا، اور انسانیت کے فائدے کے لیے ان کا اطلاق نہیں کرسکتا- کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جو ایک کاشتکار یا ایک سائنس دان کرسکتا ہے- قرآن انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نیچر کے قوانین دریافت کرے اور انہیں انسان کے فائدے کے لیے استعمال کرے-

خدا نے کچھ قانون ایسے بنائے ہیں جن کے مطابق مرد کا ایک جرثومہ ایک زنانہ بیضے کو بارور کرتا ہے اور ایک ضروری نظام عمل کے بعد ماں کے رحم میں ایک انسانی بچے کی نشو ونما ہوتی ہے اور قرآن اس بارے میں کہتا ہے ''پس ہم نے اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی خوب اندازہ مقرر کرنے والے ہیں'' (المرسلات ۷۷:۲۳) تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اس سلسلہ عمل کے قوانین دریافت نہیں کرسکتا جن کے مطابق ایک جرثومہ اور ایک بیضہ آپس میں ملتے ہیں اور پھر ایک خاص درجہ حرارت پر اور کچھ لوازمات اور شرائط کے ساتھ ایک مکمل انسانی بچہ پیدا کرتے ہیں، اور اس کے بعد وہ ان قوانین کو ایک ٹیوب میں انسانی بچہ پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں کرسکتا۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ خدا کے ساتھ مقابلہ کرنا، اس کے کاموں میں دخل دینا، اور اس کی خدائی میں شریک ہونا ہے۔ لیکن اصل پریشانی یہ نہیں ہے کہ انسان نے نیچر کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے، یا وہ خدا کی نقل کر رہا ہے۔ اس لیے کہ اس بات پر تو قرآن اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اصل ڈر اور خطرہ اس کے برعکس یہ ہے کہ انسان نیچر میں کجی اور بگاڑ پیدا کرنے میں شیطان سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے اور اس طرح وہ اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو۔

جہاں قرآن طاقت اور تقسیم کے لیے ایک ہی لفظ 'قدر' استعمال کرتا ہے وہاں وہ ایک اور اصطلاح 'امر' استعمال کرتا ہے جس کا قریبی تعلق اندازہ قائم کرنے سے ہے اور اس کے معنی بھی، جہاں تک نیچر کا تعلق ہے، وہی ہیں۔ نیچر کے قوانین خدا کے امر کا اظہار کرتے ہیں، تاہم نیچر خدا کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتی، اور نہ کرسکتی ہے، اور نہ وہ قوانین قدرت کے خلاف جاسکتی ہے۔ اسی لیے قرآن میں تمام نیچر کو مسلم کہا گیا۔ اس لیے کہ یہ اپنے آپ کو خدا کے حکم کے سامنے جھکا دیتی ہے اور اس کا اتباع کرتی ہے۔ ''اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں چار و نا چار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں؟'' (آل عمران ۳:۸۳) ''ساتوں آسمان او زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں'' (بنی اسرائیل ۱۷:۴۴، اسی طرح دیکھیے الحدید ۵۷:۱، الحشر ۵۹:۱، الصف ۶۱:۱، الرعد ۱۳:۱۵، النحل ۱۶:۴۹، الحج ۲۲:۱۸، الرحمان ۵۵:۶، الاعراف ۷:۲۰۶، الانبیاء ۲۱:۱۹-۲۰)

قادر (با اختیار اور سب اندازے قائم کرنے والے) کے تصور کے بعد آمر (حکم دینے والے) کے تصور کا آنا لازم ہے۔ جس طرح ہر چیز اس کی قضا و قدر کے تابع (مقدور) ہے اسی طرح ہر چیز اس کے حکم کے تابع (مامور) ہے۔ انسان اور نیچر کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں نیچر کو دیئے گئے حکم میں نافرمانی کی گنجائش نہیں ہوتی، وہاں انسان کو دیئے گئے حکم میں اس بات کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنے انتخاب اور قوت ارادی سے کام لے۔ چنانچہ جو حکم نیچر کے لیے ایک قدرتی حکم ہوتا ہے وہ انسان کے معاملے میں اخلاقی حکم بن جاتا ہے۔ یہ چیز تخلیق کے اس نظام میں انسان کو ایک اچھوتا مقام مہیا کرتی ہے اور ساتھ ہی وہ اس پر ایک انوکھی ذمے داری لاد دیتی ہے جس سے وہ تقویٰ کے ذریعے ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے انسان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ صرف خدا کی عبادت کرے اور تمام جھوٹے خداؤں کو ترک کر دے، جن میں اس کی اپنی خواہشات اور اس کی روح کی آرزومندانہ سرگوشیاں بھی شامل ہوتی ہیں، اس لیے کہ یہ سب اس کو پوری سچائی کے معروضی ادراک سے روکتی ہیں، اس کے تخیل کو محدود کرتی ہیں اور اس کے وجود کو ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے۔ اس موضوع پر قرآن کے جو بار بار سامنے آنے والے بیانات ہیں مندرجہ ذیل قطعی اعلانات ان کی ایک مخصوص مثال ہیں:

> ''کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبات کرتے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں، اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین'' (الکافرون ۱۰۹:۱-۷)
>
> ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے اور وہ برتر اور عظیم ہے۔ قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں (خدا کے سوا دوسروں کی عبادت کرنے پر) اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔'' (الشوریٰ ۴۲:۴-۵)
>
> ''قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں، اس بات پر کہ لوگوں نے (مکے کے مشرکین کی طرح عیسائیوں نے بھی) رحمان کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا، اور رحمان کی

یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے-" (مریم ۱۹:۹۰-۹۲)

"کہو وہ اللہ ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے- پھر بھلا بتلاؤ جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو راہنمائی نہیں کر سکتا الا یہ کہ اس کی راہنمائی کی جائے- آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے، کس طرح کے فیصلے تم کرتے ہو-" (یونس ۱۰:۳۵)

"کہو اللہ کو چھوڑ کر میں کسی اور کو سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور جو (سب کو) کھانا دیتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا- کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اس کے آگے سر تسلیم خم کروں--- کہو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک برے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں-" (الانعام ۶:۱۴-۱۵)

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو- کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟" (الفرقان ۲۵:۴۳)

"لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو، جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے- اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے- مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور- ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے- اللہ بے شک قوت والا اور غالب ہے-" (الحج ۲۲:۷۳-۷۴)

تو یہ ہے خدا کی وہ عمومی اور کلی تصویر جو قرآن سے نکل کر سامنے آتی ہے- ہم اتنے بہت سے مغربی لوگوں کے ان بیانات کے بارے میں کیا کہیں جو وہ اکثر--- اور بعض اوقات علم و تحقیق کے نام پر--- دیتے رہتے ہیں کہ قرآن کا خدا ایک بے مہر، الگ تھلگ، من موجی، بلکہ ظالمانہ طاقت ہے جو بعض لوگوں کو خواہ مخواہ گمراہ ہونے کے لیے چھوڑ دیتی ہے اور بعض کو ہدایت کی طرف آنے کی ترغیب دیتی ہے جو بعض لوگوں کو دوزخ کے لیے پیدا کرتی ہے اور دوسروں کو جنت میں بھیجنے کے لیے اس دنیا میں لاتی ہے اور یہ سب کچھ بغیر کسی وجہ اور مقصد کے ہوتا ہے- قرآن کا

خلاق، پالن ہار، رحیم اور بامقصد خدا تو ایک طرف رہا، اس طرح تو اسلام سے پہلے عربوں کی اندھی تقدیر بھی نہیں ہوتی تھی- پھر یہ کہ اس طرح کی تصویر تو عقیدہ خدا کے بالکل بنیادی خاکے کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی- اگر مغربی لوگوں کے الزامات صحیح ہیں تو وہ عقیدہ خدا کے اس بنیادی خاکے پر چاروں کھونٹ صحیح بیٹھنے چاہیں، اور اگر ایسا ہو جائے (جو کبھی نہیں ہوگا) تو ہمارا دیا ہوا خاکہ جو قرآن کی متعدد آیات پر مبنی ہے اسے غلط قرار دے کر رد کر دیا جائے-

کوئی شک نہیں کہ قرآن میں اس طرح کے متعدد بنایات آتے ہیں کہ خدا جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے یا یہ کہ خدا نے بعض لوگوں کے دل پر مہر لگا دی ہے کہ وہ حق کو پہچان نہیں سکتے (البقرہ ۲:۸،۱۴۲،۲۱۳،۲۷۲، ابراہیم ۱۴:۴، النحل ۱۶:۹۳، النور ۲۴:۳۵، القصص ۲۸:۵۶، الروم ۳۰:۲۹، الفاطر ۳۵:۸) اگرچہ اس سے کہیں زیادہ مقامات پر وہ کہتا ہے کہ "خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا"، "خدا ظالموں کو سیدھا راستہ نہیں دکھاتا"، "خدا ان کو ہدایت دیتا ہے جو کان دھرتے ہیں، جو مخلص ہوتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں-" (البقرہ ۲:۲۶،۲۵۸، ۲۶۴، آل عمران ۳:۸۶، المائدہ ۵:۱۶،۵۱، ۶۷، ۱۰۸، الانعام ۶: ۸۸،۱۴۴، التوبہ ۹:۱۹، ۲۱، ۳۷، ۸۰، ۱۰۹، یوسف ۱۲:۵۲، الرعد ۱۳: ۲۷، النحل ۱۶: ۳۷، ۱۰۷، القصص ۲۸:۵۰، الزمر ۳۹:۳، المومن ۴۰:۲۸، الشوریٰ ۴۲:۱۳، الاحقاف ۴۶:۱۰، الجمعہ ۶۲:۵، المنافقون ۶۳:۶) "جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے" (الصف ۶۱:۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کچھ ایسا عمل کرتا ہے جس سے وہ یا تو ہدایت کا مستحق ٹھہرتا ہے یا گمراہی کا- نیچر اور خدا دو مختلف factors نہیں ہیں- خدا items میں سے ایک item ہونے سے زیادہ ایک بُعد ہے یا معنی ہے- اسی طرح جہاں تک خدا کے سامنے انسان کے اعمال اور اس کی قسمت کا تعلق ہے، تو خدا اور انسان اس میں ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں ہیں، جیسا کہ متاخر معتزلہ اور اشاعرہ سمجھتے تھے- وہ یوں کہ معتزلہ نے تو انسان کو ہی تنہا عامل (sole agent) قرار دے دیا اور اس کو پوری طرح ذمے دار ٹھہرانے کے لیے خدا کے عمل دخل کا سرے سے انکار کر دیا- جبکہ اشاعرہ نے خدا کی "قدرت کاملہ" کا تحفظ کرنے کے لیے انسان کو کوئی اختیار دینے سے انکار کر دیا- قرآن اخلاقی زندگی کی حقیقتوں کا خیال رکھتا ہے، اس لیے کہ وہ اس تناؤ کی دونوں اطراف کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، جیسا کہ اگلے باب میں زیادہ وضاحت سے سامنے آئے گا-

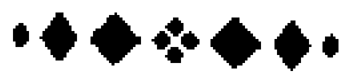
اس طرح کے تجزیے سے اگر کوئی چیز واضح ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ اس طرح سے کیا جائے کہ اس کی ٹھوس اکائی اس کی کاملیت کی صورت میں سامنے آئے اور یہ کہ قرآن سے بعض آیات چن لینا اور ان سے ایک جزوی اور موضوعی نقطہ نظر پیش کر دینا، یہ ایک داخلی مشاہدہ کرنے والے کو تو مطمئن کر سکتا ہے۔ لیکن یہ خود قرآن کے ساتھ لازماً بڑی زبردستی کی بات ہے، اور اس سے بہت زیادہ خطرناک تجریدی کلیے نکالے جا سکتے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ مغربی لوگ تو ایک طرف رہے کس طرح خود مسلمانوں نے اپنے یا اپنے مکتب فکر کے نظریات کی تبلیغ کرتے ہوئے قرآن کی صورت بگاڑ کے رکھ دی۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے مغربی سکالروں کی طرف سے غیر شعوری تعصب اور جان بوجھ کر توڑ مروڑ کے عمل نے، نیز قرآنی آیات کو بالکل الگ الگ کر کے ان کا مطالعہ کرنے کی عادت نے بھی اس میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ قرآن، بطور خدا کے کلام کے اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی ہے جتنا کہ خدا کا حکم یا قانون---- بلکہ خود خدا----- اور یہ زندگی کی گہرائی اور وسعت کی علامت ہے۔ یہ دانشورانہ اور ثقافتی تعصب کی جکڑ بندیوں میں نہیں آ سکتا۔

تاہم ہمیں عقیدۂ وحدت الوجود اور فلسفہ اضافیت سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں سب سے دلکش اور طاقتور روحانی نشہ آور چیزیں ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا items میں سے کوئی item نہیں ہے تو ہم یقیناً یہ نہیں کہنا چاہتے کہ خدا ہر چیز ہے یا ہر چیز میں ہے، اگرچہ اس کی موجودگی ہر جگہ ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا ٹھوس حقیقت ہے اور وہ ایسی تاویلات یا نظریات سے جو تعقلی اور ثقافتی مجردات ہیں محدود نہیں کیا جا سکتا، تو ہمارا مطلب یقیناً یہ نہیں ہوتا کہ اگر یہ تمام طریقہ ہائے فکر باہم میکانیکی طور پر جوڑ دیے جائیں تو ان کا جو مجموعہ ہو گا وہ سچائی کا آئینہ دار ہو گا۔ یہ نکتہ کہ خدا چیزوں کے اندر موجود نہیں ہے اور یہ کہ مخلوقات خدا سے الگ کوئی چیز ہے، پورا قرآن اس کی تائید کرتا ہے۔ لیکن اس طرح کی آیات کہ "اگر ہم چاہتے کہ کھیل اور تفریح اختیار کریں تو ہم یہ خود بھی کر سکتے تھے" (الانبیا ۲۱:۱۷) اس امر کو پوری طرح واضح کر دیتی ہیں کہ تخلیق خدا کے ہاں ہونے والا کسی قسم کا ڈرامہ نہیں ہے۔ اگرچہ اسے خدا اپنی تخلیق کے طور پر دیکھتا ہے اور یہ (مخلوق) خدا کو اپنے خالق کے طور پر دیکھتی ہے۔

رہا یہ نکتہ کہ تمام راستے جو انسان نے واقعتہً اختیار کیے ہیں، سب ملا کر بھی خدا کے متعلق سچائی کے آئینہ دار نہیں ہیں تو اس کی شہادت سورہ النحل ۱۶ کی آیت 9 سے ملتی ہے" اور سیدھا راستہ تو خدا

تک ہی پہنچتا ہے اور کچھ راستے غلط رخ پر بھی جاتے ہیں۔" یہ راستہ خدا کی، بطور خدا کے، صحیح پہچان ہے۔ ایسا راستہ جو انسان کے لیے واحد دلچسپی اور اہمیت کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ تمام دوسرے راستے گروہی اور فرقہ پرست ہیں جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں:

"جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، یقیناً ان سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے، وہی ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئے گا، اس کو اس کے برابر ہی بدلہ دیا جائے گا، اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اے محمدؐ! کہو میرے رب نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ بالکل ٹھیک دین، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، ابراہیم کا دین، جو حنیف تھا (جو دین کی وحدت کا قائل تھا، نہ کہ اس میں گروہ بندیوں کا) اور جو مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ کہو! میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا، اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا (سب سے پہلا مسلم) میں ہوں۔" (الانعام ۶:۱۶۰-۱۶۴)



باب دوم

انسان---بطور ایک فرد کے

ہر دوسری پیدا کی ہوئی چیز کی طرح انسان کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے- وہ درحقیقت ایک قدرتی تخلیق ہے- اس لیے کہ خدا نے آدم کو ایسی خمیری مٹی سے بنایا (الحجر ۱۵:۲۶، ۲۸، ۳۳، الانعام ۲:۶، الاعراف ۷:۱۲ وغیرہ) جسے جب ایک انسانی وجود میں ڈھالا جائے تو اس سے ایک خلاصہ (رَب) تیار ہوتا ہے جسے سُلالہ (تخلیق کرنے والی منی) کہتے ہیں- یہ سلالہ جب عورت کے رحم میں پہنچایا جاتا ہے تو یہ ایک تخلیقی سلسلۂ عمل میں سے گزرتا ہے جو سورہ المومنون ۲۳ (آیات ۱۲-۱۴) میں بیان ہوا ہے (اسی طرح ملاحظہ ہو سورہ السجدہ ۳۲ کی آیت ۸ اور دوسرے مقامات) لیکن انسان دوسری قدرتی مخلوقات سے اس بنا پر ممتاز ہے کہ اس کی تشکیل دینے کے بعد خدا نے اپنی روح اس میں پھونکی (الحجر ۱۵:۲۹، ص ۳۸:۷۲، السجدہ ۳۲:۹، نیز دیکھئے باب پنجم)- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن جسم اور ذہن کی دوئی کے اس نظریے کی تائید نہیں کرتا جو یونانی فلسفے، عیسائیت یا ہندومت میں پایا جاتا ہے بلکہ قرآن میں بمشکل ایسی آیت ہوگی جو یہ بتائے کہ انسان دو جداگانہ عناصر سے بنایا گیا ہے کجا کہ وہ مختلف النوع عناصر ہوں- یعنی جسم اور روح! (اگرچہ موخر زمانے کے قدامت پسند اسلام نے خاص طور پر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اور ان کے زیر اثر اس دوئی کو تسلیم کر لیا تھا- "نفس" کی اصطلاح جو قرآن استعمال کرتا ہے اور جس کا ترجمہ "روح" کیا جاتا ہے اس کے سیدھے سیدھے معنی ہیں: شخص یا ذات! اور اس طرح کے جملے جیسے النفس المطمئنۃ اور النفس اللوامہ (جن کا ترجمہ مطمئن روح اور ملامت کرنے والی روح کیا جاتا ہے) اس کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے اگر ہم انہیں انسان کی شخصیت کی مختلف حالتیں، اس کے مختلف پہلو، اس کے رجحانات اور میلانات قرار دیں- ان کو اپنی اصل کے اعتبار سے ذہنی (بخلاف جسمانی) قرار دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ذہن کو ایک مختلف شے نہ سمجھا جائے-

جب خدا نے آدم کو تخلیق کرنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ ''زمین میں اپنا خلیفہ'' مقرر کر سکے تو فرشتوں نے احتجاج کیا اور کہا ''کیا تو زمین میں ایک ایسی مخلوق بسانا چاہتا ہے جو وہاں فساد کرے گی اور کشت و خون کرتی پھرے گی۔ جبکہ ہم تیری تعریف کیساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں!'' خدا نے انسان کے خلاف ان الزامات کا انکار نہ کیا، لیکن جواب دیا: ''میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' خدا نے پھر فرشتوں اور آدم کے درمیان علم میں مقابلہ کرایا، اور فرشتوں سے پوچھا: ''چیزوں کے نام لو (ان کی صفات بتانے کے لیے) جب فرشتے یہ نہ کر سکے اور آدم نے یہ کر دکھایا (سورہ البقرہ ۲: ۳۰-۳۳) تو اس سے ظاہر ہو گیا کہ آدم کے اندر تخلیقی علم کی ایسی صلاحیت تھی جو فرشتوں میں نہیں تھی۔ اس پر خدا نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ تمام فرشتوں نے سجدہ کر کے علم میں آدمی کی برتری کو تسلیم کیا، سوائے ایک کے جسے قرآن جنات میں سے ایک جن قرار دیتا ہے (سورہ الکہف ۱۸: ۵۰) اس نے آدم پر اپنی برتری جتائی، آدم کی عزت و تکریم کرنے کا جو حکم خدا نے دیا تھا اسے تسلیم نہ کیا، اور شیطان بن گیا۔ چنانچہ شیطان کا کیریئر آدم کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ وہ ہم سن ہیں۔ اور قرآن شیطان کا ذکر اتنا زیادہ ایک مخالفِ خدا عنصر کے طور پر نہیں کرتا (اگرچہ وہ یقیناً خدا کا باغی ہے اور باغیانہ فطرت کی تجسیم ہے) جتنا کہ وہ اس کا ذکر ایک مخالفِ انسان طاقت کے طور پر کرتا ہے جو انسان کو ورغلا کر اور اس کو قدرتی سیدھے راستے سے ہٹا کر ہمیشہ گمراہی کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی رہتی ہے (دیکھیے باب ہفتم)

یہی گہری اخلاقی حقیقت ہے جو انسان کے لیے ابدی چیلنج بن کر سامنے آتی ہے، اور اس کی زندگی کو کبھی نہ ختم ہونے والی اخلاقی کشمکش میں بدل دیتی ہے۔ اس کشمکش میں خدا انسان کے ساتھ ہوتا ہے، بشرطیکہ انسان اس کے لیے مطلوبہ کوشش کرے۔ انسان کے لیے یہ کوشش کرنا ضروری قرار دے دیا گیا ہے اس لیے کہ تمام مخلوقات میں وہ یکتا اور بے مثال ہے۔ اسے اس امر کا پورا اختیار دے دیا گیا ہے کہ خدا کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اپنا مشن پورا کرے۔ یہ وہ مشن ہے۔ یعنی زمین پر ایک اخلاقی معاشرتی نظام قائم کرنے کی کوشش۔ جسے قرآن ''امانت'' سے تعبیر کرتا ہے (الاحزاب ۳۳: ۷۲) خدا نے یہ امانت آسمانوں اور زمین کو پیش کی لیکن انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ اس میں بہت بوجھ تھا۔ لیکن انسان نے اسے قبول کر لیا جسے قرآن ظالم اور احمق کہہ کر نرمی سے ملامت کرتا ہے۔ اس لیے کہ خدا نے اسے جو حکم دیا تھا، اس نے یقیناً اس پر عمل نہیں کیا (عبس ۸۰: ۲۳)

ہم یہاں قرآن کے اس تجزیئے پر بات کریں گے کہ انسان کی بنیادی کمزوری کیا ہے اور اس کا علاج کیونکر ہو سکتا ہے لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ اگرچہ شیطان انسانوں پر چاروں طرف سے حملہ آور ہوتا ہے لیکن اس کی ساری تدبیریں ان لوگوں کے معاملے میں ناکام ہو جاتی ہیں جو حقیقی معنوں میں نیک ہوتے ہیں۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ کوئی انسان بھی شیطان کی ترغیبات سے محفوظ نہیں ہے حتیٰ کہ پیغمبر بھی نہیں (الحج ۲۲:۵۲) یہاں تک کہ رسول خداﷺ بھی نہیں (الاعراف ۲۲۰، حم السجدہ ۴۱:۳۶) تاہم پیغمبر تو ایک طرف رہے، یہ ہر اس انسان کی طاقت میں ہے جو اپنے ایمان اور ارادے میں سچا ہو کہ ان ترغیبات سے بچا رہے (الحجر ۱۵:۱۱، بنی اسرائیل ۱۷:۶۵، النحل ۱۶:۹۹) اس کی وجہ یہ کہ ایسے آدمی ترغیبات کے باوجود ''اپنی اس فطرت کو سلامت رکھتے ہیں جس پر انہیں خدا نے پیدا کیا ہے۔'' جو ''تبدیل نہیں ہو سکتی۔'' (اگرچہ اس میں عارضی طور پر تھوڑا بہت خلل ڈالا جا سکتا ہے، الروم ۳۰:۳۰) حقیقت میں یہی وہ لوگ ہیں جو ساری مخلوقات کا عطر ہیں، جو فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، جن پر انہیں علم اور نیکی دونوں میں فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو پوری طرح یہ سمجھتے ہیں کہ ''انسان کو عبث نہیں پیدا کیا گیا (المومنون ۲۳:۱۱۵) اور وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کے لیے جوابدہ ہے۔ اس لیے کہ خدا اور انسان دونوں نے اس اہم معاملے، یعنی انسان کی ''خلافت'' میں بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ انسانیت کے ساتھ اب تک بڑی آفت یہ چلی آتی ہے کہ بہت سے لوگ ''عاقبت'' کی طرف نہیں دیکھتے اور کل کے لیے کچھ پونجی جمع نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ انسانی دوڑ دھوپ کے جو اخلاقی مقاصد ہیں انہیں پورا نہیں کرتے، بلکہ وہ انہیں سمجھتے بھی نہیں ہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ ایک دن سے دوسرے دن، بلکہ ایک گھنٹے سے دوسرے گھنٹے تک زندگی بسر کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔ ''وہ مویشیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے'' (الاعراف ۷:۱۷۹) ''ان کے پاس دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں'' (الاعراف ۱۷۹ اور دوسرے مقامات) ان کی بنیادی فطرت اتنی بگڑ چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ وہ ''شیطان کے بھائی'' بن گئے (بنی اسرائیل ۱۷:۲۷) درآنحالیکہ خدا نے آدم میں خود اپنی روح پھونکی تھی (الحجر ۱۵:۲۹، السجدہ ۳۲:۹، ص ۳۸:۷۲، دیکھئے التین ۴-۶) ''ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا، پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت کو بدل کر پست سے پست کر دیا۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے'' (التین ۹۵-۵)

چنانچہ قرآن پہلے گناہ کو ہی لے کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ کہتا ہے کہ جب آدم نے اپنے پرودگار سے کچھ کلمات سیکھ لیے تو ان دونوں یعنی آدم اور حوا کو معاف کر دیا گیا۔ (البقرہ ۲:۳۷)

یہاں سے قرآنی آیات کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جن میں اس طرح کا ذکر آتا ہے کہ "خدا نے انسانوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کی ٹھوڑیوں کو زنجیروں سے اس طرح جکڑ دیا ہے کہ وہ نہ پیچھے دیکھ سکتے ہیں اور نہ غور وفکر کر سکتے ہیں" قرآن یہ نہیں کہتا کہ خدا یونہی لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ بلکہ وہ عموماً یہ کہتا ہے کہ خدا جب ایسا کرتا ہے تو انسانوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے کرتا ہے۔ "ان کے بنیادی کفر کی وجہ سے" (الانعام ۶:۱۱۰، البقرہ ۲:۸۸) اور "ان کی نافرمانی کی وجہ سے" (البقرہ ۲:۴۹، الانعام ۶:۴۹) جیسے جملے قرآن میں بکثرت وارد ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ "ہم اس کو اسی طرف ہی چلائیں گے جدھر وہ خود چلتا ہے (النساء ۴:۱۱۵) اور خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل لے (الکہف ۱۳:۱۱، الانفال ۸:۵۳) یعنی جب تک کہ لوگ خود کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ قرآن بار بار یہ کہتا ہے کہ ہر مرد اور عورت انفرادی طور پر اور ہر قوم اجتماعی طور پر اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ قرآن جب شفاعت کو نہیں مانتا تو اس کے پیچھے یہی اصول کارفرما ہے۔ سورہ العنکبوت کی آیت ۱۲ میں آتا ہے کہ امیر اور باا‌ثر کفار پیغمبر کے پیروکاروں سے کہتے تھے کہ "ہمارے راستے پر چلو اور اگر ضرورت پڑی تو ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیں گے" اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ لوگ ان کے گناہوں کا کچھ بوجھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے گناہوں کا کئی گناہ زیادہ بوجھ اٹھائیں گے۔

دلوں پر مہر لگانے سے متعلق جو آیات ہیں ان کے پیچھے جو خیال کارفرما ہے وہ یہ نفسیاتی قانون ہے کہ انسان اگر ایک دفعہ کوئی اچھا یا کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کے لیے اس کام کو دہرانے کے امکانات بڑھتے جاتے ہیں اور اس کے خلاف عمل کرنے کے امکانات اسی نسبت سے کم ہوتے جاتے ہیں۔ جب ایک شخص مسلسل ایک برا یا اچھا عمل دہراتا رہتا ہے تو اس کے لیے تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف عمل کرے یا ایسا کرنے کے بارے میں سوچے۔ یہاں تک کہ جب برا کام کرتے ہوئے لوگوں کے دلوں پر مہر لگی ہوتی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوتا ہے اور اس حالت میں وہ کوئی اچھا کام کر لیتے ہیں تو ان کے اندر ایسی ذہنی حالت پیدا ہوتی ہے کہ خود شیطان بھی اس پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔ تاہم ایسے اعمال جو ایک نفسیاتی عادت کا سبب بنتے

ہیں، ان کا اثر چاہے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، انہیں قطعی طور پر فیصلہ کن نہیں سمجھا جا سکتا - اس لیے کہ انسانی سلوک کے لیے ایسا کوئی مقام نہیں ہے جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو- صحیح قسم کی توبہ ایک ایسے شخص کو جو سراپا برائی ہے، نیکی کے ایک نمونے میں بدل سکتی ہے- دوسری طرف، اگرچہ یہ بہت ہی شاذ و نادر ہوتا ہے، ایک بظاہر نیکی کا نمونہ (بلکہ پیغمبر بھی) شیطان کا سا کردار اختیار کر سکتا ہے جو عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہو-

''اور ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی نشانیاں عطا کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا اور شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کے رہا- اگر ہم چاہتے تو اسے ان نشانیوں کے سبب سے بلندی عطا کرتے لیکن وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے چل پڑا-'' (الاعراف ۷:۱۷۵-۱۷۶)

یہ سمجھنا کہ قرآن انسانی رویے میں مطلقاً جبر سے کام لینا چاہتا ہے اور انسان کو اپنے ارادے میں آزاد ہونے کی اجازت نہیں دیتا، یہ نہ صرف قرآن کی پوری تعلیم کا انکار کرنا ہے بلکہ اس کی بنیاد پر ضرب لگانا ہے- قرآن کا اپنا یہ دعویٰ ہے کہ وہ انسانوں کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے- وہ ہدیً للناس ہے-

یہ صورت حال اس کے باوجود، بہت پیچیدہ ہے اور اس کی تشریح ضروری ہے- یہ صحیح ہے کہ قرآن اکثر اس طرح کی بات کرتا ہے کہ جیسے انسان شعوری طور پر اپنے لیے صحیح یا غلط راہوں کا انتخاب کرتا ہے اور پھر ان پر چل پڑتا ہے- اور خدا اس کے اعمال پر صرف فیصلہ کرتا ہے (مثلاً والنجم ۵۳:۳۹-۴۰، الدہر ۷۶:۳، البلد ۹۰:۱۰ و مابعد الشمس ۹۱:۷-۱۰) لیکن قرآن اس سے بھی زیادہ مرتبہ یہ کہتا ہے کہ جب انسان ایک رخ اختیار کرتا ہے تو خدا اسے اس میں محصور کر دیتا ہے ''تو جس نے خدا کی راہ میں مال دیا اور پرہیزگاری اختیار کی، اور بھلائی کو سچ مانا، تو ہم اس کو آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے، لیکن جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی، اور بھلائی کو جھٹلایا، تو ہم اس کو برائی کے راستے کے لیے سہولت دیں گے (الیل ۹۲:۵-۱۰) اور اس کے لیے ہم نے اوپر ایک نفسیاتی توجیہہ بیان کی ہے-

لیکن ایک انسان کیسے اور کیوں ایک راستہ اختیار کرتا ہے؟ وہ کس طرح اپنے آپ کو خدا کی اطاعت میں دے دیتا ہے یا اس سے منہ موڑ لیتا ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ انسان کو حقیر، خودغرض،

روزمرہ زندگی میں ڈوبا ہوا اور خواہشات کا غلام بننے کے لیے کسی زیادہ کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی- اس لیے نہیں کہ یہ راستہ اس کے لئے "قدرتی" ہے، اس لئے کہ اس کی اصل فطرت تو بلند ہونے کی ہے- بلکہ اس وجہ سے کہ نیچے زمین میں اترنا، جیسا کہ ہم نے قرآن کی زبان میں بتایا، پاکیزگی کی بلندیوں تک پہنچنے کی نسبت بہت آسان ہے- چنانچہ اس دوسری حالت میں خدا کا رول، اس کی مدد اور تائید بہت اہم ہوتی ہیں- کوئی آدمی یہ نہیں کر سکتا کہ کہے کہ "میں ایک نیک شخص بننے لگا ہوں" اور وہ اپنے آپ نیک انسان بن جائے- اسے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اس جدوجہد میں خدا اپنی مرضی سے اس کا ساتھ دیتا ہے- لیکن خدا کے بارے میں کوئی چیز فرض نہیں کر لینی چاہیے- یہ سمجھ کر کہ اس کا ساتھ اپنے آپ حاصل ہونے والی چیز ہے- اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ جدوجہد کس مرتبے کی ہے اور کس قدر ہے اور خدا کا ساتھ مہیا ہونا خدا کے رحم کے مترادف ہے- آنحضرتؐ کے معاملے میں قرآن اس بات کو صاف صاف کہتا ہے (القصص ۲۸:۸۶)- غار حرا میں ان کی مشقت کے باوجود ___ "اور تم اس بات کی ہرگز توقع نہیں رکھتے تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی- یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل ہوئی ہے)" اور بعض اوقات انہیں یہ ڈرا دیتا ہے کہ وحی کا سلسلہ منقطع بھی ہو سکتا ہے (بنی اسرائیل ۱۷:۸۶) "اور اگر ہم چاہیں تو جو کتاب ہم نے تم پر وحی کی ہے وہ واپس لے لیں، پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاؤ، لیکن یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے-" (اس کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیئے باب پنجم) جب انسان نیچے گر کر زمین کی طرف جاتا ہے تو اس کا ضمیر کند ہو جاتا ہے اور وہ اپنی صحیح اور اعلیٰ فطرت کی آواز ٹھیک طرح نہیں سن پاتا- "ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو (حم السجدہ ۴۱:۴۴) پھر انسان نہ صرف یہ کہ سن نہیں سکتا بلکہ جب اسے بار بار حق کی یاد دہانی کرائی جائے تو وہ اس پر سیخ پا ہو جاتا ہے- اسکے اس غصے اور جھلاہٹ میں جب اس کی جھوٹی شان اور فخر شامل ہو جاتا ہے چاہے وہ ذاتی ہو، خاندانی ہو، قومی ہو یا تاریخی ہو، تو پھر وہ حق و صداقت کو رد کر دیتا ہے اور اس کے خلاف باقاعدہ مزاحمت کا رویہ اختیار کرتا ہے- اسے قرآن اپنی اصطلاح میں "کفر" کہتا ہے اور عملاً اسے اس خاص قسم کے فخر و تکبر کا ہم معنی قرار دیتا ہے- جس طرح نیکی کی طرف صعود کرنا خدا کی عملی تائید اور مدد سے ہوتا ہے- "کفر" کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انسان کو بالکل اپنے حال پر چھوڑ دیا-

یہی وہ سیاق وسباق ہے جس میں قرآن بڑی وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ انسان کے لیے خدا کا وجود لازم ہے- اور جس طرح خدا کا ذکر اور اس کی موجودگی زندگی کو پر معنی اور بامقصد بناتی ہے، اسی طرح انسانی شعور سے اگر خدا کو الگ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی زندگی میں کوئی معنی اور مقصد باقی نہ رہے- ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا- یہی لوگ فاسق ہیں'' (الحشر ۵۹:۱۹) یہ لوگوں کی اجتماعی زندگی کے معاملے میں اتنا ہی صحیح ہے (جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے) جتنا کہ ان کی انفرادی زندگی کے معاملے میں- خدا کا ذکر شخصیت میں ایک قوت وارتباط پیدا کرتا ہے جس میں زندگی کی ساری جزئیات اور انسانی سعی وعمل کے تمام پہلو ایک دوسرے میں پوری طرح مدغم اور مربوط ہوتے ہیں- دوسری طرف خدا کو فراموش کر دینے کے معنی ہیں کہ وجود ٹکڑوں میں بٹ جائے، زندگی بالکل لادینی ہو کے رہ جائے، اور ایک غیر مربوط اور انجام کار منتشر شخصیت وجود میں آئے اور انسان کُل سے غافل ہو کر تفصیلات کے جال میں پھنس جائے- علامہ اقبال نے ایمان اور کفر کے درمیان جو تفریق کی ہے وہ بالکل یہی ہے-

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(ضرب کلیم)

پھر انسان کے معاملے میں خدا کا جو رول قرآن میں بتایا گیا ہے اس کی بابت یہ جان لینا چاہیے (اور ہم آگے باب ششم میں اس پر مکمل کر بات کریں گے) کہ قرآن ایک ہی طرح کے فینا مینا کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کا سبب خدا بھی ہے اور نیچر بھی- اور یہ دونوں علتیں (causalities) مختلف یا مثنیٰ (duplicate) یا متفاوت نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک ہی ہیں- تاہم ان کے معانی مختلف ہیں- جب قرآن نیچر کی زبان استعمال کرتا ہے تو وہ ایک توجیہ پیش کر رہا ہوتا ہے- جب مذہبی محاورہ خدا کے عمل تسبیب کی نسبت سے استعمال کیا جاتا ہے- جو بہت زیادہ تواتر سے دیکھنے میں آتا ہے- تو یہ ایک واقعے کی عقلی توجیہ یا مدعا بیان کر رہا ہوتا ہے- چنانچہ بارشیں، بادل اور ہوائیں لاتی ہیں لیکن انہیں خدا لاتا ہے تا کہ وہ زمین کو سنبھالے رکھ سکے-

قدرتی سلسلہ ہائے عمل سے جو چیز بھی وقوع میں آتی ہے، وہ خدا کا کام ہوتا ہے- چنانچہ جب آنحضرتؐ سے پوچھا گیا (جیسا کہ بار بار ہوا) کہ خدا نے انہی کو کیوں منتخب کیا تھا، بجائے

ان دو شہروں کے کسی بڑے آدمی کے، تو اس کا جواب بعض اوقات یہ دیا جاتا ہے "کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟" (الزخرف ۴۳:۳۲) اور کسی دوسرے موقع پر کہا جاتا ہے "یہ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے۔" (الانعام ۶:۱۲۵) مطلب یہ کہ خدا لوگوں کو یونہی رسول منتخب یا مقرر نہیں کرتا۔ یہ ایک نمائندہ مثال ہے اس امر کی کہ قدرتی سیاسی سلسلہ ہائے عمل کو خدا کی مرضی کے طور پر کیسے پیش کیا جاتا ہے (ہم اگلے باب میں اس کی مزید مثالیں دیں گے۔ جس میں اس کے الٹ معاملہ بھی شامل ہوگا)

> "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں (یا ایک تہذیب کو --- یہاں بستی سے مراد ایک شہر بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ پیغمبر شعیب کا یا ایک تہذیب بھی جیسے فراعنہ کی) تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں تو اس وقت اس پر عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔" (بنی اسرائیل ۱۷:۱۶) قرآن میں دوسری جگہ فصل پکنے کا استعارہ استعمال ہوتا ہے یعنی جب اس قوم کی فصل پک جاتی ہے تو ہم اسے کاٹ دیتے ہیں۔

اہمیت کے اعتبار سے آخری بات یہ کہ یہ برابر ذہن میں رہنا چاہیے کہ قرآن صرف واقعات کے بیان کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ہدایات اور احکام بھی جاری کرتا ہے۔ اس کے پیغام کا مضمون اور اس کے اسلوب کی طاقت، اس طرح رکھی گئی ہے کہ وہ انسانوں کو لفظ کے عام معنوں میں "اطلاع بہم پہنچانے" سے زیادہ اس کے کردار میں تبدیلی لے آئے۔ اس لیے اس کے بیانات کا نفسیاتی اثر اور اخلاقی مدعا یہ دونوں بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح کے جملے کہ "خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیا ہے کہ وہ حق کو سن نہیں سکتے" قرآن میں اس طرح کے جملوں کے بیانیہ معنی ضرور ہیں جن کا تعلق ان نفسیاتی سلسلہ ہائے عمل سے ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ لیکن ان مضامین کے سیاق و سباق میں ان جملوں کا ایک خاص نفسیاتی مقصد بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کے طور طریقوں کو صحیح راہ پر لگا دیں۔ چنانچہ قرآن میں اس طرح کی آیات کی ہم جو بھی تشریح کریں یا ان سے جو بھی معانی نکالیں -- چاہے وہ نفسیاتی ہوں (سلسلہ عمل اور مطلوبہ اثر دونوں کی رو سے) مبنی بر حقیقت ہوں یا اخلاقی ہوں --- یہ سب مل کر کام کرتے ہیں اور انہیں ٹھیک سے سمجھا جانا چاہیے اور ان کے ذمہ ایک صحیح تناسب کے ساتھ رول لگانے چاہئیں۔

کوئی شک نہیں کہ قرون وسطی کے موخر زمانے میں مسلم معاشروں کے اندر لوگ تقدیر پر بہت زیادہ ایمان رکھتے تھے (اگر چہ اس بارے میں بہت سے مغربی بیانات انتشار کا شکار ہیں کہ یہ کس طرح کی چیز تھی اور اس کی قوت کیا تھی) لیکن ان کی وجہ قرآن کی تعلیمات نہیں تھیں بلکہ متعدد دوسرے عوامل تھے- ان میں سب سے نمایاں دینیات کے اشعری سکول کی بے پناہ کامیابی تھی (جس نے خدا کی قدرت کاملہ کے تحفظ کی خاطر انسان کو بالکل ہی مجبور و بے بس بناڈالا تھا، لیکن جس کا اثر مسلمانوں پر حقیقی سے زیادہ برائے نام تھا)، نیز تصوف کے عقیدہ وحدت الوجود کا (خصوصاً سولھویں صدی کے بعد) دور دور تک پھیلاؤ، اور ان سب سے زیادہ بعض دانشور اور دلیل باز قوموں خصوصاً ایرانیوں کے نظریہ کائنات میں بہت ہی جبریہ قسم کے عقائد!---ان تمام متاثر کرنے والے عوامل کے نتیجے میں قرآن کا قدر (یا تقدیر) کے بارے میں جو نظریہ ہے اس کی تعبیر اس طرح سے کی گئی کہ خدا نے ہر چیز کو، بشمول انسانی اعمال کے، اپنی تقدیر اور ارادے کے تابع کیا ہوا ہے-

یہ امر کہ یہ قرآن کے نظریہ قدر کی بہت ہی سادہ اور غلط تعبیر ہے (جس نے اسلام کے بارے میں بہت سے مغربی نظریات کو متاثر کیا ہے) بالکل واضح ہے- قدر کے معنی اصل میں 'حصہ متعین کرنا' کے ہیں اور خیال یہ ہے کہ جب صرف خدا ہی ہر طرح سے لامتناہی ہے تو دوسری ہر چیز متعین ہونے کا نشان لیے پھرتی ہے یعنی یہ کہ اس کے امکانات محدود ہیں، چاہے ان امکانات کا دائرہ، جیسا کہ انسان کے معاملے میں، بہت وسیع ہو! قرآن ان امکانات کو واقع میں لانے کی بات نہیں کرتا، بلکہ ان کے خلقی طور پر موجود ہونے کی بات کرتا ہے- قرآن کی رو سے جب خدا کسی چیز کو خلق کرتا ہے تو وہ اس کے ساتھ ہی اس کی فطرت، اس کے امکانات اور اس کے رویے یا سلوک کے قوانین اس کے اندر رکھ دیتا ہے جس سے یہ ایک خاص نمونے میں ڈھل جاتی ہے اور اس عالم کون ومکان (cosmos) میں ایک عامل (factor) بن جاتی ہے- چونکہ کائنات میں ہر چیز ان قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے جو اس کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں یعنی خود بخود خدا کے حکم کی تابعداری کرتی ہے- اس لیے پوری کائنات ہی اس اعتبار سے ''مسلم'' ہے جو خدا کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیتی ہے- اس عالمگیر قانون میں واحد استثناء انسان ہے، اس لیے کہ وہ واحد وجود ہے جسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ خدا کے حکم کی اطاعت کرے یا نافرمانی کرے- ٹھیک اسی طرح جیسے یہ حکم ہر دوسری مخلوق کے اندر ''لکھ دیا گیا ہے'' اسی طرح یہ حکم انسان کے دل پر بھی لکھ دیا گیا ہے-

''اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا۔ پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کردی (جس سے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاقی تباہی سے بچا سکتا ہے) یقیناً فلاح پا گیا، وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو (فجور میں) دبا دیا''
(الشمس ۹۱: ۷-۱۰)

فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں ہر دوسری مخلوق خود بخود اپنی فطرت کے مطابق چلتی ہے، انسان کو ''چاہیے'' کہ اپنی فطرت کے مطابق چلے، یہ جو ''چلتی ہے'' کا ''چلنا چاہیے'' میں بدل جانا ہے تو یہ انسان کا غیر معمولی حق بھی ہے اور اس کے لیے غیر معمولی خطرہ بھی! یہی وجہ ہے کہ انسان کے لیے یہ اتنا اہم ہے کہ شیطان چاہے جتنی ہی سازش کرے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی فطرت کی طرف کان لگائے اور اسے توجہ سے سنے۔

یہ معنی ہیں اس ''اولین عہد'' کے جو خدا نے تمام انسانوں سے لیا تھا۔

''اور جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' انہوں نے کہا: ''ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہنے لگو (اپنے گناہوں کی معذرت کرتے ہوئے) کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے (اور ان کے تربیت یافتہ تھے) پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں ہلاک کرتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا'' (الاعراف ۷: ۱۷۲-۱۷۳)

مطلب یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر قوم کو اپنے ہی ضمیر سے استصواب کرنا ہوتا ہے اور ان کے دل پر جو لکھ دیا گیا ہے جو اولیں عہد و اقرار سے عبارت ہے، اس کی وجہ سے کوئی بھی اس عذر کے پیچھے پناہ نہیں لے سکتا کہ ان کو تو ''موروثی روایت'' نے اور ان کے آباؤ اجداد کے لگے بندھے طریقوں نے ایک راہ پر لگا دیا تھا۔ پیغمبروں کا سب سے بڑا کام انسان کے ضمیر کو بیدار کرنا ہے تا کہ وہ اپنے دل پر لکھے ہوئے اس اولیں عہد کو زیادہ وضاحت کے ساتھ اور زیادہ مضبوط یقین کے ساتھ پڑھ

سکے- اس لیے قرآن مکمل اور قطعی منطق کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے پیغمبروں سے خاص طور پر مضبوط ایک عہد لیا تھا" اور جب ہم نے سب پیغمبروں سے عہد لیا، تم سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ ابن مریم سے اور سب سے ہم نے بہت ہی پختہ عہد لیا" (الاحزاب ۳۳:۷)

چونکہ انسان کی اصل فطرت اس کے اندر رکھ دی گئی ہے اور اسے خدا کے پیغمبر آ کر اور زیادہ مضبوط اور واضح کر دیتے ہیں، انسان کا نیکی کی خواہش نہ کرنے اور گمراہی کے گڑھے میں اترنے کا کوئی عذر بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ قرآن نے محاورۃً اس کا اظہار کر دیا ہے- اس وجہ سے قرآن کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس بات کا اعادہ کرتے ہوئے نہیں تھکتا کہ ایسے تمام انسانی اعمال جن کا قطعی انداز میں کسی دوسرے انسان پر ارتکاب کیا جاتا ہے، تو وہ انجام کار اپنے عامل کی طرف لوٹتے ہیں- تمام برائی، تمام بے انصافی، تمام مضرت جو ایک انسان دوسرے کے ساتھ کرتا ہے وہ بہت زیادہ اساسی طور پر، اور بہت زیادہ قطعی انداز میں انسان اپنے آپ کے ساتھ کرتا ہے- اور یہ استعارہ نہیں بلکہ لفظی معنوں میں ایسا ہوتا ہے- یہ افراد کے معاملے میں بھی اتنا صحیح ہے جتنا قوموں کے معاملے میں- اسی لیے "اپنے آپ پر ظلم کرنا" قرآن میں ایک بہت عام اصطلاح ہے (عرب اہل لغت ہمیں بتاتے ہیں کہ ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی صحیح جگہ پر نہ رکھنا، اس لیے جو بھی غلط کام ہو، ظلم ہے یعنی خود عامل کے معاملے میں ظلم) اور قرآن کا صاف مدعا یہ ہے کہ تمام ظلم بنیادی طور پر اپنے آپ پر ہی ہوتا ہے- گزری ہوئی نسلوں کی ساری گمراہیوں اور غلط کاریوں کا احوال سنا کر قرآن عام طور پر کہتا ہے: "ہم نے ان پر کوئی ظلم نہ کیا (کہ انہیں تباہ کر ڈالا) بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر خود ہی ظلم کیا تھا (البقرہ ۲:۲۳۱، الطلاق ۶۵:۱، النمل ۲۷:۴۴، القصص ۲۸:۱۶، البقرہ ۲:۵۴، الاعراف ۷:۲۳، البقرہ ۲:۵۷، آل عمران ۳:۱۱۷، الاعراف ۷:۱۶۰، ۱۷۷ وغیرہ)

انسان کی بنیادی کمزوری جس سے اس کی تمام خرابیاں پھوٹتی ہیں اسے قرآن نے ضعف اور قتر کہا ہے اور اس بات کا اعادہ قرآن نے بار بار مختلف سورتوں میں اور مختلف حوالوں سے کیا ہے- انسان کا فخر ----- یعنی اس کا اپنے آپ کو برتر قانون کے ساتھ خاص سمجھنا اور اس کی بے بسی اور ناامیدی دونوں اس "ضعف" سے جنم لیتی ہیں- اس کی خود شکستگی کی حامل خودغرضی اور لالچ، جس کا وہ برابر شکار بنا رہتا ہے اس کا جلد بازی کا اور بدحواسی کا رویہ، اس کی خود اعتمادی کی کمی اور وہ خوف

جو اسے مسلسل گھیرے رہتے ہیں- ان سب کے پیچھے دراصل اس کے ذہن کا چھوٹا پن ہے-

''کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے، اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے-'' (المعارج ۷۰:۱۹-۲۱)

''اور نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں-'' (النساء:۱۲۸)

''جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں'' (الحشر ۵۹:۹، التغابن ۶۴:۱۶)

''اے محمدؐ! ان سے کہو اگر میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم (دوسروں پر) خرچ ہو جانے کے ڈر سے ضرور ان کو روک رکھتے - واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے-'' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۰)

یہ اس چھوٹے پن کی وجہ سے ہے کہ انسان اتنا جلد باز اور فوراً گھبرا جانے والا ہے، اور اپنے ردعمل کے طویل المیعاد نتائج کو نگاہ میں نہیں رکھتا- ''انسان جلد باز مخلوق ہے'' (الانبیاء ۲۱:۳۷) ''انسان جب خیر کے لیے دعا کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی شر کے لیے بھی دعا کرتا ہے- انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے'' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱) ''ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلد ہی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو'' (القیامہ ۷۵:۲۰) ''بھلائی کرو اور اسے اپنے لیے آگے بھیجو'' قرآن میں انسان کو یہ یاد دہانی مستقلاً کرائی جاتی ہے (البقرہ ۲:۱۱۰، ۲۲۳، المزمل ۷۳:۲۰، الحشر ۵۹:۱۸)

یہ اسی جلد بازی کی وجہ سے ہے کہ انسان فخر سے پھول جاتا ہے اور پھر مایوسی کے آگے سپر بھی ڈال دیتا ہے- دنیا میں اور کوئی وجود ایسا نہیں ہے جو انسان کی طرح جلدی پھول بھی جائے اور پھر جلدی اس میں سے ہوا بھی نکل جائے- قرآن بار بار اس امر کا ذکر کرتا ہے کہ جب انسان کو نعمتیں عطا کی جاتی ہیں تو وہ جلد ہی خدا کو بھول جاتا ہے- جب طبعی عوامل اس کے لیے کام کرتے ہیں تو اپنی آسودگی اور خود کفایتی کے احساس میں وہ ان قدرتی عوامل میں خدا کو نہیں دیکھ پاتا لیکن جب اس پر برا وقت آتا ہے تو پھر یا تو وہ امید سے بالکل ہی محروم ہو جاتا ہے، یا وہ صرف اسی ساعت میں خدا سے رجوع کرتا ہے- وہ خدا کو صرف مصیبت میں یاد رکھتا ہے اور مصیبت کی حالت میں بھی ہو سکتا ہے وہ خدا کو یاد نہ کرے اور نہ اس کو پکارے، بلکہ صرف مایوسی میں ڈوب کر رہ جائے-

"اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے- اور اگر مصیبت کے بعد ہم اسے نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ ساری سختیاں مجھ سے دور ہو گئیں- پھر وہ خوشیاں مناتا ہے اور اکڑنے لگتا ہے، سوائے ان لوگوں کے جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں" (ھود ۱۱: ۹-۱۰)

"انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا اور جب کوئی آفت اس پر آ جاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے- مگر جونہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ لازماً کہہ اٹھتا ہے کہ "میں اس کا مستحق ہوں" ---- اور انسان کو جب ہم اپنی رحمت سے نوازتے ہیں تو وہ لاتعلق ہو جاتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے اور جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے-" (حم السجدہ ۴۱: ۴۹-۵۱، اسی طرح دیکھئے بنی اسرائیل ۱۷: ۸۳، یونس ۱۰: ۱۲)

انسان کا یہ متلون کردار، یہ ایک انتہا سے دوسری انتہا تک چلے جانا، جو اس کی محدود بصیرت اور چھوٹے ذہن کی پیداوار ہے، یہ کچھ بنیادی اخلاقی تناؤ کی حالتوں کو ظاہر کرتا ہے، جن کے اندر رہتے ہوئے انسانی کردار کو اپنا کام کرنا ہوتا ہے اگر اسے پائیدار اور مفید رہنا ہو- چنانچہ یہ متناقض انتہائیں کوئی ایسا "مسئلہ" نہیں ہیں جسے دینیاتی فکر سے حل کیا جائے، بلکہ یہ صرف تناؤ کی صورتیں ہیں جن کے ساتھ گزارا کرنا چاہیے اگر انسان کو صحیح معنی میں "مذہبی" یعنی خدا کا بندہ رہنا ہے- اس لیے کامل بے بسی اور ناطاقتی اور "تمام چیزوں کے لیے معیار بن کے رہنا-" ناامیدی اور فخر، جبریت اور "آزادی" مطلق علم اور خالص جہالت ---- یوں سمجھئے کہ مکمل طور پر اپنی ذات کا منفی احساس اور "قادر مطلق ہونے کا احساس" ---- یہ وہ انتہائیں ہیں جو صحیح انسانی رویے کے لیے قدرتی طور پر تناؤ کی صورتیں ثابت ہوتی ہیں- یہ انسانی عمل کے لیے خدا کا دیا ہوا قالب (framework) ہے- چونکہ اس کا اولیں مقصد اخلاقی توانائی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہے، قرآن جو اپنے آپ کو انسانوں کے لیے "ہدایت" کہتا ہے- اس بات کو بہت اہم سمجھتا ہے کہ انسان تناؤ کی مخالف انتہاؤں کو نہ توڑے- اخلاقی زندگی کی سب سے دلچسپ اور سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ اس توازن کو کسی بھی طرف سے درہم برہم کرنے سے ایک "شیطانی صورت

حال'' پیدا ہوتی ہے جو اپنے اخلاقی اثرات میں بالکل ایک جیسی ہوتی ہے یعنی اخلاق کی نفی! انسان چاہے فخر کر رہا ہو یا ناامید ہو، چاہے وہ اپنے آپ کو راہ راست پر سمجھتا ہو یا اپنی نفی کر رہا ہو، ان دونوں حالتوں میں نتیجہ اخلاقی انسانی شخصیت کا بگاڑ اور پھر اس کی تباہی پر ہوتا ہے۔

اس کا نمونہ خود شیطان ہے۔ جب اس نے آدم کو سجدہ کرنے کا خداوندی کا حکم نہ مانا تو وہ سراپا فخر تھا، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ آدم سے کہیں برتر ہے اور اس نے خدا کی بھی زیادہ پروانہ کی۔ جب وہ گرا تو اس کی ساری امید جاتی رہی اور مکمل مایوسی کے عالم میں اس نے خدا سے التجا کی کہ اسے روز آخرت تک مہلت دے تا کہ وہ آدم کی اولاد کو ورغلا کر انہیں گمراہ کر سکے (الاعراف ۷:۱۱، الحجر ۲۹:۱۵ وغیرہ) وہ ایک پیشہ ورانہ بدی فروش بن گیا۔ اس لیے کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی شخصیت کی بحالی اب نہ ہو سکے گی۔

چنانچہ قرآن صرف فخر اور دعوائے اتقاء ہی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ ناامیدی اور مکمل مایوسی کو بھی اتنا ہی بُرا سمجھتا ہے جسے وہ ''ایمان نہ رکھنے والوں'' کی بڑی علامت قرار دیتا ہے، ان لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔'' (یوسف ۱۲:۸۷، اسی طرح العنکبوت ۲۹:۲۳، الحجر ۱۵:۵۰، الزمر ۳۹:۵۳، اور وہ آیات جو اوپر انسان کی مایوسی کے بارے میں دی گئی ہیں) فخر اور مایوسی دونوں ایک ہی طرح کے ''کفر'' یا ''ایمان کے فقدان'' کی صورت ہیں، جو دوسرا نام ہے اخلاقی توانائی کے مکمل خاتمے کا!

بت پرستی اس حالت کا یقینی نتیجہ ہے اس لیے کہ انسانی رویے کے لیے جب کوئی ماورائی جائے پناہ نہ رہی تو اسے یا تو ''اپنی خواہشات کی پیروی'' کرنی چاہیے (الفرقان ۲۵:۴۳، الاعراف ۷:۱۷۶، الکہف ۱۸:۲۸، القصص ۲۸:۵۰) یا اگر وہ اپنی خواہشات کو معروضی شکل دیتا ہے تو پھر اسے ''سماجی خواہشات'' کی پیروی کرنی چاہیے۔ جو انسان کے معاشرے کا ایک طرح سے اظہار ذات ہوتا ہے ''اور اس نے (ابراہیم نے) کہا تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے لیکن قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے'' (العنکبوت ۲۹:۲۵) ---- جب انسان کا اخلاقی نقطہ نظر تنگ ہو جاتا ہے اور ماورائی بعد باقی نہیں رہتی تو پھر ایک عالمگیر معروضی اخلاقی نقطہ نظر سے یہ ایک ہی بات قرار پاتی ہے کہ انسان چاہے اپنے آپ کو خدا سمجھ کر یا اپنے معاشرے اور قوم کو خدا سمجھ کر (Emile Durkheim سے معذرت کے ساتھ) اس کی پرستش کرے۔ سچائی کی تخصیص کر دینے

، چاہے وہ انفرادی طور پر موضوعی ہو یا اجتماعی طور پر (قومی یا گروہی سطح پر) موضوعی، اخلاقی صلاحیتوں کو بے حس کر دیتی ہے اور سب کو ایک جیسا بے حس کرتی ہے- یہ بہت بڑی قیمت ہے جو اپنے چھوٹے پن کی انسان کو دینی پڑتی ہے-

ہم نے اوپر کہا کہ خدا کو فراموش کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی شخصیت کو ختم کر دے- چاہے وہ انفرادی ہو یا سماجی، اس لیے کہ صرف خدا کی یاد ہی شخصیت کو جوڑ کے رکھ سکتی ہے- اب ہم نے دیکھا کہ انسانی طور طریقے میں تناؤ کی جو صورتیں ہوتی ہیں ان کے توازن کو بگاڑنے سے بھی شخصیت تباہ ہو جاتی ہے- تو خدا کی یاد کو تناؤ کی ان صورتوں کے ڈھانچے کے اندر رہ کر ہی اپنا کام کرنا ہوتا ہے- کیونکہ جتنی بھی برائی ہے اس کا سبب دباؤ کی ان صورتوں میں توازن کو بگاڑنا ہے جسے قرآن ''حدود اللہ سے تجاوز کرنے'' کا نام دیتا ہے- (البقرہ ۲: ۱۸۷، ۲۳۰، النساء ۴: ۱۳، التوبہ ۹: ۱۱۲، المجادلہ ۵۸: ۴، الطلاق ۶۵: ۱)

''بیچ کا راستہ'' نہ صرف یہ کہ بہترین راستہ ہے بلکہ یہی واحد راستہ ہے- بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ''درمیان'' میں رہنے کا مطلب ہے ''بے کیف'' اور ''پیش پا افتادہ'' ہونا- اور ''اوسط'' سے وابستہ ہونا درحقیقت ادنیٰ درجے کا، نقلی اور ''پست'' ہونا ہے- یہ بات صحیح ہو سکتی ہے اگر درمیان اور اوسط کو ایسی چیز سمجھا جائے جس سے دونوں اطراف غائب ہیں، ایک منفی قسم کا اوسط، خشک استخواں جس سے تمام گوشت اتر چکا ہے- لیکن یہ قرآن کا ''اوسط'' نہیں ہے- جو چیز اس کے ذہن میں ہے وہ ایک مثبت اور تخلیقی اوسط ہے، ایک تکاملی قسم کا اخلاقی جسد نامی! اس لیے یہ اپنے آپ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ چوکنے پن اور طاقت سے جو انسان اس کے لیے بہم پہنچا سکے، حاصل کیا جا سکتا ہے- یہ توازن کا وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں دونوں اطراف پوری طرح موجود ہوتی ہیں، غائب نہیں ہوتیں، اور ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں، نہ کہ رد کی ہوئی!

تکمیلی اخلاقی عمل کا یہ اچھوتا توازن ہی وہ چیز ہے جسے قرآن تقویٰ کہتا ہے جو قرآن میں غالباً سب سے اہم انفرادی اصطلاح ہے- اپنے کمال کی حالت میں یہ انسان کی پوری طرح مربوط اور مکمل شخصیت کو ظاہر کرتی ہے- یہ اس طرح کا ''استحکام'' ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تمام مثبت عناصر شخصیت کے اندر لے لیے جاتے ہیں- اس اصطلاح کا ترجمہ عموماً ''خوف خدا'' اور ''نیکی'' کیا جاتا ہے- یہ معانی اگرچہ غلط نہیں ہیں لیکن مسلمان رفتہ رفتہ ''خدا کے خوف'' کی اصطلاح کو ترک کرتے جا رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جملہ غلط مفہوم پیش کرتا ہے- اس

غلط تصویر کے پیش نظر جو اسلام کے خدا کے بارے میں مغرب میں رائج ہے کہ وہ من موجی آمر ہے یا ایک جابر ہے- اس کو سامنے رکھیں تو خدا کے خوف کے معنی یوں لگتے ہیں جیسے بھیڑیے کا خوف! وق ی کا جو مادہ ہے اس کے معنی ہیں ''کسی چیز سے بچا کر رکھنا یا محفوظ رکھنا'' اور یہ اس لفظی مفہوم میں بھی قرآن میں استعمال ہوتا ہے (مثلاً الطور ۵۲:۲۷، المومن ۴۰:۹، ۴۵، الدھر ۷۶:۱۱)

چنانچہ تقویٰ کے معنی ہیں اپنے آپ کو اپنے کردار کے مضر یا برے اثرات سے بچانا- چنانچہ اگر ''خوف خدا'' سے کوئی یہ مراد لیتا ہے کہ یہ انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا خوف ہے- چاہے اس دنیا میں یا آخرت میں- تو یہ بالکل صحیح بات ہے- دوسرے لفظوں میں یہ وہ خوف ہے جو ذمہ داری کے ایک گہرے شعور سے پیدا ہوتا ہے، جس کا تعلق اس دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی! نہ کہ کسی بھیڑیے کا یا بھیانک ظالم کا خوف، اس لیے کہ قرآن کا خدا بے حساب رحم والا ہے، اگرچہ وہ اس دنیا اور آخرت میں سخت سزا دینے کا اختیار بھی رکھتا ہے-

قرآن میں اس تصور سے متعلق جتنی بھی آیات ہیں، ان کو سامنے رکھیں تو غالباً ''تقویٰ'' کی تعریف سب سے بہتر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ کہا جائے کہ جہاں عمل کا تعلق انسان سے ہے، اس عمل پر صحیح اور موثر انصاف، نیز وہ معیار جس پر اس عمل کو جانچا جاتا ہے دونوں انسان کے دائرہ کار سے باہر ہیں- اسی طرح ایک معاشرے کی اجتماعی کارکردگی کی صورت میں، اس کے بارے میں انصاف کرنے کا آخری معیار اور وہ انصاف خود، دونوں اس معاشرے سے ماورا ہوتے ہیں- جب ایک انسان یا معاشرہ کوئی عمل کرتے ہوئے اس حقیقت کا پورا شعور رکھتا ہے تو اسے صحیح ''تقویٰ'' حاصل ہوتا ہے- یہ خیال زیادہ موثر انداز میں ''ضمیر'' کی اصطلاح استعمال کر کے دوسروں تک پہنچایا جاسکتا ہے اگر ضمیر کا جو ہدف ہے وہ اس سے ماورا ہو- یہی وجہ ہے کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ''ضمیر'' اسلام میں اتنا ہی مرکزی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ محبت عیسائیت میں، جب ہم حقیقت علیا کے سامنے انسان کے ردعمل کی بات کرتے ہیں- وہ حقیقت جس کا تصور اسلام میں رحمدلانہ انصاف کا ہے نہ کہ باپ کی حیثیت کا!

تو ہماری اس دلیل کے سیاق وسباق میں تقویٰ کے معنی ہوئے: اخلاقی تناؤ اور کشاکش کے درمیان، دوسرے الفاظ میں ''حدود اللہ'' کے اندر پابند اور ثابت قدم رہنا، اور ان حدود سے تجاوز نہ کرنا اور نہ ان کے توازن کو بگاڑنا- انسان کا کردار اس صورت میں ایک ایسی صفت اختیار کر لیتا ہے جسے ''خدا کی عبادت'' کہتے ہیں- یہ کردار، جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے (الانعام ۶:۱۶۱) دس

گنا انعام کا مستحق ہوتا ہے (یا کئی گنا، جیسا کہ النساء ۴: ۴۰ میں آیا)- جبکہ برائی کو اس کے برابر بدلہ دیا جاتا ہے یعنی اگر اسے معاف نہ کر دیا جائے یا اس کے آثار مٹا نہ دیئے جائیں- کیونکہ قرآن کے مطابق جو اچھا ہوتا ہے وہ انسانیت کے فائدے کے لیے باقی رہتا ہے لیکن جو غلط ہوتا ہے اس کا وجود عارضی ہوتا ہے اگر چہ وہ موجود دکھائی دے- ''اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالا اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر بہ نکلا- پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے، اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں- اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ تو اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے فائدے کے لیے ہوتی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے- اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے-'' (الرعد ۱۳: ۱۷)

مجموعی طور پر، قرآن میں انسانی ریکارڈ کی قابل افسوس باتوں کے باوجود قرآن کا رویہ انسانی تگ و دو کے انجام کے بارے میں کافی پر امید ہے- یہ ایک صحت مند احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، نہ کہ خود اذیتی اور اخلاقی خبط و جنون کا وہ رویہ جو سینٹ پال اور بہت سے صوفیہ کی تعلیم میں ملتا ہے جس کے لیے کسی قسم کے خاص نجات دہندہ کی ضرورت ہوتی ہے- اگر ایک رحم دل اور عادل خدا موجود ہو اور مضبوط کردار جسے تقویٰ کہتے ہیں بھی موجود ہو تو انسان کی بھلائی اور عافیت اپنے آپ حاصل ہوتی جاتی ہے ''اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں'' (الشوریٰ ۴۲: ۳۷) ''جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں الا یہ کہ وہ ان کے کنارے تک آ کر رہ جائیں'' (النجم ۵۳: ۳۲) ''جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لے کر آئے گا تو اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا'' (الانعام ۶: ۱۶۱)

متعدد دوسری آیتوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ خدا انسانوں کی خطاؤں کو معاف کر دے گا یا ان سے درگزر فرمائے گا، بشرطیکہ ان کی مجموعی کارکردگی اچھی اور فائدہ مند ہو (دیکھئے الزمر ۳۹: ۳۴-۳۶، جس کے بعد آیت ہے کہ ''کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں'' کہ وہ شفاعت کے دوسری وسیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں؟) جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں کا مجموعی رویہ تقویٰ کی مطابقت میں ہو، جو انہیں خلاف ورزی کرنے سے روکے گا، اور اگر وہ خلاف ورزی کا ارتکاب کر بھی لیں گے تو انہیں جلد اس امر پر مجبور کر دے گا کہ وہ اپنے کیے پر پچھتائیں اور اپنی

شخصیتوں میں عدم توازن کو درست کریں۔ پکے اور بے حس منافق جس طرح کی ناقابل معافی نفرت پیدا کرتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے "کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کرلیا ہے، انہوں نے (منافقین کی پیروی کرتے ہوئے) اچھے اور برے عمل کو ایک دوسرے میں ملا دیا۔ ہوسکتا ہے کہ خدا ان کی طرف توجہ فرمائے۔ بے شک خدا بخشنے والا اور مہربان ہے" (التوبہ ۹:۱۰۲) توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے سوائے ان لوگوں کے جو آخر وقت تک غلط کام کرنے پر تلے رہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ آخر میں وہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے اور خدا سے اس کی معافی مانگ لیں گے۔ قرآن جو عمل پر سارا زور دیتا ہے اس کے اس اصول کی نمایاں مثال اس بات پر اصرار کرنا ہے کہ ایمان کے وہ اعلانات اور معافی کی وہ درخواستیں جو آخر وقت کی جائیں گی وہ بالکل رد کردی جائیں گی۔ حضرت موسیٰؑ کے قصے میں فرعون جب مرنے لگتا ہے تو خدا سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے لیکن اس کی درخواست بہت سختی کے ساتھ رد کردی جاتی ہے (یونس ۱۰:۹۰-۹۱) ہاں خدا ان لوگوں کی پشیمانی قبول کر لیتا ہے جو بے سوچے سمجھے برائی کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر اس پر جلد نادم ہوتے ہیں۔ ندامت اور پشیمانی ان لوگوں کی قبول نہیں کی جاسکتی جو برابر برائی کا ارتکاب کیے جاتے ہیں اور جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو وہ کہتا ہے "اب میں خدا کے سامنے اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوں" (النساء ۴:۱۷، ۱۸ اسی طرح دیکھیے یونس ۱۰:۵۱)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ "نجات دہندہ کے منصب" (Saviourship) کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ شفاعت کو بھی رد کرتا ہے۔ اگرچہ حدیث کا لٹریچر ایسے حوالوں سے بھرا پڑا ہے کہ کس طرح پیغمبر اپنی امتوں کے گناہ گار لوگوں کی شفاعت کریں گے، خاص طور پر آنحضرتؐ اپنی امت کے لیے شفاعت کریں گے (اور اسلام کی عام روایت میں اولیاء اللہ گناہ گار لوگوں کی اتنی شفاعت کریں گے کہ وہ پیغمبروں سے بھی بڑھ جائیں گے) لیکن قرآن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ بار بار کہتا ہے کہ حشر کے روز خدا ہر پیغمبر کو بطور گواہ کے لائے گا جو اپنی امت کے اعمال پر گواہی دے گا۔ اور یہ ایسی شہادت ہوگی جس پر لوگوں کے اعمال کا فیصلہ ہوگا۔ "پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی محمدؐ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔" (النساء ۴:۴۱، دیکھیے سورہ القصص ۲۸:۷۵)

قرآن کا سارا مزاج ہی شفاعت کے خلاف ہے، اس لیے کہ اولاً "خدا کسی شخص پر اس کی

طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا" (البقرہ ۲:۲۳۳، ۲۸۶، الانعام ۶:۱۵۳، الاعراف ۷:۴۲، المومنون ۲۳:۶۲) دوسرے یہ کہ جیسا کہ ہم یہ بات وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں: خدا کی رحمت "ہر چیز کو محیط ہے" (الاعراف ۷:۱۵۶، المومن ۴۰:۷) مسلمانوں کے تقلید پسندانہ ایمان کی رو سے، جیسا کہ یہ اسلام کی دوسری اور تیسری صدیوں (آٹھویں اور نویں صدی عیسوی) میں ابھر کر سامنے آیا، کافروں اور عام غیر مسلموں کے حق میں شفاعت کا کوئی امکان نہیں (یہودیوں اور عیسائیوں کے انجام کے بارے میں بعض مسلمان علمائے دینیات، مثلاً ابن تیمیہ، نے ایک غیر وابستہ سارویہ روا رکھا ہے) لیکن یہ گناہ گار مسلمانوں کے لیے ضرور مہیا ہوگی۔ اس عقیدے کی شروع میں معتزلہ نے مخالفت کی تھی (لیکن آگے جا کر وہ شفاعت کے اس تقلید پسندانہ نقطہ نظر سے متفق ہو گئے۔ شفاعت اور نجات کے تصور میں موجود نفسیاتی عنصر ہی اتنا طاقتور تھا) اس کے باوجود قرآن کی یہ واضح آیت، بغیر کسی شک وشبے کے، مسلمانوں کے حق میں شفاعت کی بھی نفی کرتی ہے۔ "اے ایمان لانے والو! جو کچھ مال ومتاع ہم نے تم کو بخشا ہے۔ اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی" (البقرہ ۲:۲۵۴، اسی طرح دیکھیے البقرہ ۲:۴۸، ۱۲۳، الانعام ۶:۵۱، ۷۰، الزمر ۳۹:۴۴، یس ۳۶:۲۳)

تاہم قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ کوئی بھی خدا کی جناب میں سفارش نہیں کر سکے گا "سوائے اس کے جس کو اس کی اجازت ہو" (البقرہ ۲:۲۵۵، یونس ۱۰:۳، طہ ۲۰:۱۰۹، سبا ۳۴:۲۳، والنجم ۵۳:۲۶) قرآن کے انہی الفاظ سے راسخ العقیدہ لوگوں نے یہ خیال کر لیا کہ خدا کے حضور سفارش ہو سکتی ہے۔ اس مفروضے پر کہ خدا تعالیٰ آنحضرتؐ کو اس کی اجازت دے دیں گے کہ وہ اپنی امت کے لیے خدا سے سفارش کریں۔ لیکن جیسا کہ ابن تیمیہ بتاتے ہیں، اس حوالے سے اجازت کی جو شق ہے اس کو لفظی معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ یہ تو محض ایک خطیبانہ انداز ہے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ خدا کی ذات کتنی عظیم ہے۔ جس کے سامنے سب لوگ بے بس ہیں سوائے اس کے جس پر اس کی رحمت ہو۔ "تصور کرو اس دن کا جب روح (الامین) اور ملائکہ صف باندھ کر کھڑے ہوں گے، اور کوئی بول نہیں سکے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ بھی ٹھیک بات کہے گا" (النبا ۷۸:۳۸) اجازت کے ساتھ سفارش کرنا نہ صرف ناقابل فہم تصور ہے بلکہ جیسا کہ آیت ۳۸ سے ظاہر ہوتا ہے اگر قرآن کے الفاظ کو لفظی معنوں میں لیا جائے تو کوئی شخص خدا کی

اجازت کے بغیر بول بھی نہیں سکے گا، کجا کہ وہ کسی کی سفارش کرے۔ قرآن دراصل ان بلیغانہ جملوں کے ذریعے خدا کی بے پایاں عظمت وجلال کی تصویر کھینچتا ہے (دیکھئے اسی سورہ کی آیت ۳۷: ''وہ جو آسمانوں اور زمین کا اور جو ان دونوں کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں''

اب ہم اعمال کے ''حساب'' اور افعال کو ''تولنے'' کے سوال کی طرف آتے ہیں جو کسی فرد یا معاشرے کی مجموعی کارکردگی جانچنے کے لیے کیا جائے گا۔ ایسا ''حساب'' جس پر انسان کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ ''حساب'' اور ''میزان کرنے'' کا جو تصور اتنی وضاحت کے ساتھ قرآن کی متعدد آیات میں پیش کیا گیا ہے اسی کے معاشرتی تاریخی پس منظر میں مکہ کی تجارتی زندگی ہے لیکن یہ دلچسپ حقیقت، مذہبی اعتبار سے ایک عام سی بات ہے۔ وہاں جس چیز کی اہمیت ہوگی وہ کسی عمل کی کوالٹی کی ہوگی جسے قرآن ''وزن'' کا نام دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی اس قابل ہو کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرلے، لیکن اس کے منفعت بخش اثرات صرف اسی تک محدود رہیں، نہ وہ دوسروں کی حالت کو بہتر بنائیں اور نہ ان کی قسمت پر مضر طریقے سے اثر انداز ہوں۔ لیکن اگر دوسرے لوگوں پر اس کا اثر نقصان دہ ہو تو اس کا یہ عمل، خدا سے بیگانہ ہونے کے سبب، ''کفر'' کا اور سچائی کو جھٹلانے کا عمل ہوگا۔ اگر یہ عمل صرف اسی پر اچھی صورت میں اثر انداز ہوتا ہے تو پھر بھی یہ خسران یعنی گھاٹے کا عمل ہوگا۔ ایک آدمی ''اپنے لوگوں کے لیے'' شجاعت کا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ لیکن وہ انصاف کے اصولوں کے خلاف اور حدود اللہ کو توڑتے ہوئے ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے عمل کے پیچھے بھی ایسی ذہنی حالت ہوسکتی ہے جسے قرآن ''کفر'' کہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انسان کے لیے خدا کے جو مقاصد ہیں اور انسان کے اپنے اصل مقاصد ہیں، ان کے خلاف جاتی ہے۔

خدا نے انسان کو یا اس کائنات کو ''عبث'' پیدا نہیں کیا (المومنون ۲۳:۱۱۵) اسی طرح ''ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور جو کائنات ان کے درمیان ہے اس کو بے مقصد پیدا نہیں کیا'' (ص ۳۸:۲۷، آل عمران ۳:۱۹۱) بلکہ ایک سنجیدہ مقصد سے پیدا کیا ہے۔ یہ مقصد ''خدا کی عبادت'' ہے یعنی انسان کے لیے جو خدا کا حکم ہے اس پر عمل کرنا، اس لیے کہ ''عبادت'' خود انسان کے فائدے کے لیے ہے، نہ کہ خدا کے فائدے کے لیے! ''انسان جو بھی اچھا کام کرتا ہے اس کے اپنے فائدے کے لیے ہے اور جو برائی بھی وہ کرتا ہے اس کا نقصان اسے پہنچتا ہے'' (البقرہ ۲:۲۸۶،

۷۹، النساء۴:۱۱۱) نیز دوسری بہت سی آیات جو قرآن کے اشاریے میں ''عمل'' اور اس کے مشتقات اور ''کسب'' اور اس کے مشتقات کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں۔

اس لیے انسان کو تنہا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا (القیامہ۷۵:۳۶) بلکہ اسے نیکی کی طرف مسلسل دعوت دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر اسے اپنی داخلی خواہشات کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا گیا تو امکان یہی ہے کہ وہ اپنی کارکردگی کے معیار اور جواز کے بارے میں غلط اندازہ قائم کرلے۔

''اے محمد! ان سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، چنانچہ قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔'' (الکہف۱۸:۱۰۳-۱۰۵)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، خبردار! حقیقت میں یہ لوگ مفسد ہیں، مگر انہیں شعور نہیں ہے۔'' (البقرہ۲:۱۱-۱۲)

خودفریبی کے مخصوص شکار انسانی ادارے، تنظیمیں اور خصوصیت کے ساتھ مذہبی گروہ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ''یہ کوئی تمہاری آرزوؤں کا معاملہ نہیں ہے، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کا، جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا، اور اللہ کے سوا کوئی دوست یا مددگار نہ پاسکے گا۔'' (النساء۴:۱۲۳)

خودفریبی کی گہرائی کو دیکھتے ہوئے یہ کتنا اہم لگتا ہے کہ انسان کو ''جگا کر'' اسے اس کی اصل فطرت کا شعور دلایا جائے۔ اس کو آمادہ کیا جائے کہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہو، اور ایسی باتیں سوچے اور ایسے عمل کرے جن کا کوئی نتیجہ ہو، کیونکہ انسان کا سارا مقدر بھی اسی پر مبنی ہے اور انسان کے بارے میں خدا کے جو مقاصد ہیں ان کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ ''غفلت'' کی تہیں بہت دبیز اور کئی گنا ہیں اور یہ اشد ضروری ہے کہ انسان اپنی نگاہ تیز کرے، پیشتر اس کے کہ بہت دیر ہو جائے'' (ق۵۰:۲۲) اس موضوع پر بات کرتے ہوئے قرآن کی تنبیہات بہت سخت اور ڈرانے والا لہجہ اختیار کرلیتی ہیں۔

''بہت سے جنوں اور انسانوں کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے، ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں لیکن وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ مویشیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہیں'' (الاعراف ۷:۱۷۹)

تجربی علم خود کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا، جب تک کہ انسان کے اندر یہ احساس بیدار نہ کرے کہ اس کی حیثیت کیا ہے، اس کی امکانی قوتیں کیا ہیں، اس کے سامنے خطرات کیا ہیں، اور اس کا مقدر کیا ہے:

''کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا، کہ ان کے پاس دل ہوتے، جن سے وہ سمجھتے بوجھتے یا کان ہوتے، جن سے وہ سنتے۔ اس لیے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہوتے ہیں وہ اپنی بصیرت کھو دیتے ہیں۔'' (الحج ۲۲:۴۶)

یہی وجہ ہے کہ قرآن انسان کے لیے تین طرح کے علوم میں دلچسپی رکھتا ہے۔ پہلا نیچر کا علم ہے۔ نیچر جسے انسان کے تابع بنایا گیا ہے، یعنی طبیعیاتی علوم۔ دوسری اہم قسم تاریخ (اور جغرافیہ) کا علم ہے۔ قرآن انسان سے بار بار یہ کہتا ہے ''زمین میں چل پھر کر دیکھو'' اور اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ ماضی کی تہذیبوں کے ساتھ کیا کچھ ہوا اور انہیں کیونکر عروج حاصل ہوا اور پھر وہ زوال پذیر ہو گئیں۔ تیسری قسم انسان کا خود اپنے بارے میں علم ہے۔ اس لیے کہ ''ہم انہیں آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے۔ کیا تمہارے لیے تمہارے رب کی یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے'' (حم السجدہ ۴۱:۵۳) یہ علم ''سائنٹیفک'' علم ہے، کیونکہ اس کی بنیاد ''آنکھوں اور کانوں کے مشاہدے'' پر ہے۔ اس کے باوجود اس سائنٹیفک علم کو بالآخر دل میں جاگزیں ہونا ہوتا ہے اور وہ احساس بیدار کرنا ہوتا ہے جو اس کی سائنٹیفک اور تکنیکی مہارتوں کی ایسے اخلاقی شعور کے مطابق قلب ماہیت کر دے جو اس کے اندر پیدا ہو ہی چکا ہوگا۔ اس شعور کے بغیر سائنٹیفک اور تکنیکی علم یقیناً خطرناک ہو سکتا ہے بلکہ ضرور ہوتا ہے اور مکہ کے مادی طور پر خوشحال لوگوں پر تنقید کرتے ہوئے قرآن اسی نکتے پر زور دیتا ہے: ''یہ دنیوی زندگی کے ظاہری امور کو جانتے ہیں، لیکن وہ آخرت کے نتائج سے پوری طرح غافل ہیں'' (الروم ۳۰:۷)

جب ہم انسانی اعمال کی تقابلی اہمیت اور وزن کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب لازماً یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ اعمال انسان کے مقدر پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں- ہمارا ذہن ایک دفعہ پھر اس استعارے کی طرف جاتا ہے کہ پانی کی لہر پر پھولا ہوا جھاگ ہوتا ہے لیکن وہ جلد ہی زائل ہو جاتا ہے اور اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑ جاتا جبکہ وہ چیز جو انسانیت کے لیے مفید ہوتی ہے، زمین میں باقی رہ جاتی ہے- قرآن آگے کہتا ہے:

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک کلمے کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے- اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گھنا درخت جس کی جڑیں زمین میں گہری ہیں اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں- ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل دے رہا ہے- یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اس سے سبق لیں- اور ایک مکروہ کلمے کی مثال (دوسری طرف) ایک ایسے مکروہ درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے اس کو کچھ ثبات نہیں ہوتا-'' (ابراہیم ۱۴: ۲۴-۲۶)

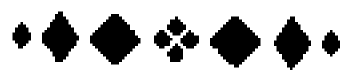
اسی لحاظ سے قرآن سب برے اعمال کو، خصوصاً جھوٹے خداؤں کی عبادت کو، ضلال قرار دیتا ہے- اس لفظ کا ترجمہ عموماً گمراہی کیا جاتا ہے جو صحیح ہے بشرطیکہ ہم واضح طور پر یہ سمجھ لیں کہ ''گمراہی'' اور ''غلط راستہ'' بنیادی طور پر اس بات کی علامت ہیں کہ انسان کہیں بھی نہیں پہنچ پائے گا چاہے وہ کتنا دور چلے یا کتنی مشقت سے چلے- بلکہ وہ ایک گڑھے میں جا کے گرے گا- اس کا مطلب یہ ہے کہ ضلال بے ثمر اور لاحاصل چیز ہے، عبث ہے، اور اس کا مترادف 'باطل' بھی قرآن میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے- برے اعمال کے نتائج کا نقشہ قرآن میں اکثر دوزخ کی آگ میں جلنے کی موثر علامتوں کی صورت میں کھینچا جاتا ہے- وہ آگ جس کی ''سنسناہٹ'' کو گناہ گار لوگ دور سے سن سکتے ہیں اور جو چٹانوں تک کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے-

ماضی اور حال کے کچھ مسلم مفکرین نے جہنم کی سزا اور جنت کی مسرتوں کو غیر جسمانی اور ''روحانی'' حالتیں قرار دیا ہے- خود قرآن میں اس کی کافی تائید سامنے آتی ہے، بشرطیکہ 'روحانی' سے جسمانی کا انکار مراد نہ ہو، کیونکہ کوئی مسرت اور کوئی تکلیف ایسی نہیں جو صرف روحانی ہو یا صرف جسمانی ہو- پھر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن ایک سے زیادہ مقامات پر اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ جہنم میں جو عذاب ہوگا وہ اس پر منحصر ہوگا کہ انسان اپنے اعمال کے بے نتیجہ ہونے سے کس قدر آگاہ تھا-

"جب کبھی ایک (نیا) گروہ جہنم میں داخل ہوگا وہ اپنے جیسے ایک (پہلے کے) گروہ پر لعنت بھیجے گا- یہاں تک کہ سب اس میں داخل ہو جائیں گے تو ہر پچھلا گروہ پہلے کی نسبت کہے گا کہ اے خدا ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس ان کو آگ کا دگنا عذاب دے-اس پر خدا فرمائے گا کہ تم سب کو دگنا عذاب دیا جائے گا لیکن تم نہیں جانتے-"
(الاعراف ۷:۳۸)

"(خدا ایک گناہ گار سے کہے گا) تو اس چیز (یعنی اپنے اعمال کے نتیجے) کی طرف سے غفلت میں تھا- لیکن آج ہم نے پردہ اٹھا دیا ہے تو تیری نگاہ بہت تیز ہے-" (ق ۵۰:۲۲)

چنانچہ جہنم کا عذاب بنیادی طور پر اس امر کا ادراک ہے کہ انسان نے اپنے خیال میں جو پہاڑ کھڑے کیے تھے وہ یکلخت سکڑ کر ریت کا ذرہ بن گئے ہیں اور قرآن بار بار یہ کہتا ہے کہ روز حساب تمام جھوٹے خدا گم ہو کر رہ جائیں گے اور ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا، وہ گویا وہاں ہوں گے ہی نہیں! (الانعام ۶:۲۴، ۹۴، الاعراف ۷:۵۳، یونس ۱۰:۳۰، ھود ۱۱:۲۱، النحل ۱۶:۸۷، حم السجدہ ۴۱:۴۸، الاعراف ۷:۱۳۹، ھود ۱۱:۱۶، ۲۲، ۶۲، العنکبوت ۲۹:۶۷، محمد ۴۷:۳) اس سے 'باطل' اور 'ضلال' کے درمیان مساوات قائم ہو جاتی ہے (ضلال یعنی "گمراہ ہونا" اور باطل یعنی "وہ چیز جو عبث ہے" اور "غیر حقیقی" ہے اور "بے نتیجہ" ہے) اور ان کے مقابلے میں "ہدایت" اور "حق" ہیں (ہدایت یعنی "کہیں پہنچ جانا" اور حق یعنی "سچائی" اور وہ چیز جو "حقیقی" ہے اس لیے "باقی رہتی" ہے اور "گم نہیں ہو جاتی")



باب سوم

انسان---معاشرے میں

کوئی شک نہیں کہ قرآن کا مرکزی ہدف اس دنیا میں ایک ایسا پائدار معاشرتی نظام قائم کرنا ہے جو منصفانہ اور اخلاق پر مبنی ہو- کیا انجام کار یہ فرد ہی ہے جو زیادہ اہم ہے اور معاشرہ اس کی تخلیق میں ضروری وسیلہ ہوتا ہے یا معاملہ اس کے برعکس ہے؟ یہ ایک نظریاتی اور منطقی بحث ہے، اس لیے کہ فرد اور معاشرے کا تعلق یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوں- معاشرے سے الگ فرد کا کوئی وجود نہیں ہے- یقیناً انسانی حرکت و عمل کے تصورات، جن پر ہم نے بات کی، خاص طور پر تقویٰ، جبھی بامعنی ہوتے ہیں جب وہ ایک معاشرتی حوالے سے دیکھے جائیں- یہاں تک کہ اپنے نفس پر ظلم کرنے کا معاملہ، جس کی رو سے افراد اور خاص طور پر معاشرے بالآخر تباہ ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب بھی ایک معاشرتی اور تاریخی صورت حال میں انسان کے زندہ رہنے کے حق کا خاتمہ ہے- جب قرآن فرعون یا قارون جیسے افراد کی موت کا ذکر کرتا ہے تو وہ دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایک خاص طرز زندگی، ایک معاشرہ اور تہذیب کا ایک خاص نمونہ کس طرح اپنے آپ کو خود برباد کر دیتا ہے-

جہاں کہیں بھی ایک سے زیادہ انسان موجود ہوں، خدا براہ راست ان کے باہمی تعلق میں در آتا ہے اور ایک تیسری بُعد پیدا ہو جاتی ہے جسے دو انسان اپنے لیے خطرہ مول لے کر ہی نظر انداز کر سکتے ہیں-

> ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا آسمانوں اور زمین میں ہر چیز کا علم رکھتا ہے؟
> کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان

چوتھا اللہ نہ ہو، یا پانچ آدمیوں کے درمیان سرگوشی ہو اور چھٹا اللہ نہ ہو
(خفیہ بات کرنے والے) خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی
وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے" (المجادلہ ۵۸:۷)

قرآن نے اسلام کے مخالفین کی (چاہے وہ کفار مکہ ہوں یا مدینہ کے منافقین) چھوٹی لیکن مسلسل ہونے والی سازشی مجلسوں پر جو بار بار تنقید کی ہے، یہ آیت ان میں سے ایک ہے۔ اور اگرچہ اس کا ظاہری معنی یہ ہے کہ بھلے وہ آپس میں رازدارانہ طریقے سے بات چیت کریں خدا کو سب پتا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ زیادہ عمومی تصور اس کا یہ ہے کہ جہاں بھی دو یا تین آدمی موجود ہوں، وہاں خدا موجود ہوتا ہے۔ خدا کی موجودگی محض علمی اور نظری اعتبار سے نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس کے وہاں ہونے سے دوسرے نتائج برآمد ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم انسان کی سعی و عمل کا ایک مجموعی محاسبہ ہے۔ یہ معنی ہیں قرآن کی بار بار یاددہانیوں کے کہ خدا ہمیشہ خبردار ہوتا ہے، وہ دیکھتا ہے اور ہر چیز کا شاہد ہوتا ہے اور جہاں تک معاشروں کا تعلق ہے "وہ برابر تاک میں رہتا ہے" (الفجر ۸۹:۱۴) اور "آسمانوں اور زمین میں کوئی ذرہ بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا" (یونس ۱۰:۶۱، سبا ۳۴:۳)

قرآن جب ایک اخلاقی اور مساوات پر مبنی معاشرتی نظام کا اعلان کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ اس معاشی عدم توازن اور معاشرتی تفاوت کی سختی کے ساتھ مذمت کرتا ہے جو اس وقت مکہ کی تجارتی سوسائٹی میں رائج تھا۔ قرآن نے سب سے پہلے اس سوسائٹی کے دو ایسے پہلوؤں پر تنقید کی جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ پہلا اصنام پرستی یا بہت سے خداؤں کو پوجنا جو سوسائٹی کی درجہ بندی کی علامت تھا، دوسرے حد درجہ معاشرتی اقتصادی ناہمواریاں جن کی بنیاد انسانوں کے درمیان ایک تباہ کن تفریق پر تھی۔ یہ دونوں ایک ہی مسئلے کے دو رخ ہیں، صرف ایک خدا ہی نسل انسانی کے درمیان بنیادی اتحاد کو یقینی بنا سکتا ہے۔ اس طور پر کہ وہ اس کی مخلوق ہے، اس کی رعایا ہے اور آخر کار صرف اسی کے سامنے جوابدہ ہے۔ معاشی ناہمواریوں کو بار بار تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس وجہ سے کہ ان کا علاج سب سے زیادہ مشکل تھا اور وہ معاشرتی نزاع کی تہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ قبائلی رقابتیں اور ان سے متعلق اتحاد کی گوناگوں دشواریاں، اور باہمی دشمنیاں اور انتقامی جذبات، یہ سب بھی کوئی کم اہم نہ تھیں، اور ان قبائل کو آپس میں جوڑ کر ایک سیاسی وحدت میں بدل دینا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اسی طرح لڑکیوں، یتیموں اور عورتوں

کے ساتھ بدمعاملگیاں، اور غلامی کی روایت بہت زیادہ شدید قسم کی اصلاح کا تقاضا کرتی تھیں۔
پہلے ہم اقتصادی ماحول کو دیکھتے ہیں۔ مکہ ایک خوشحال تجارتی شہر تھا، لیکن اس کے زیر زمین ایک ایسی دنیا تھی جس میں کمزوروں کا (جن میں بے قبیلہ، غلام اور مزدور لوگ شامل تھے) استحصال کیا جاتا تھا، اور طرح طرح کے دھوکہ بازی کے تجارتی اور مالیاتی کاروبار رائج تھے۔ قرآن ایک ایسی صورت حال کی بلیغ شہادت دیتا ہے جس میں ایک طرف خودغرضی، تنگ دلی اور اشیاء کے نمایاں استعمال کا ایک پرغرور اظہار تھا اور دوسری طرف پیس ڈالنے والی غربت اور بے بسی تھی:

''تم لوگوں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر دولت جمع کرنے کی دُھن غفلت میں ڈالے رکھتی ہے، یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں عنقریب تم جان لو گے، پھر سن لو کہ عنقریب تم جان لو گے'' (التکاثر ۱۰۲:۱-۴)

''تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو لوگوں کا عیب ڈھونڈتا ہے اور پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتا ہے، جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گنتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ نہیں، وہ یقیناً حُطمہ میں گرایا جائے گا اور کیا تم جانتے ہو حُطمہ کیا ہے۔ یہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو (بے پروا اور کنجوس لوگوں کے) دلوں تک پہنچ جائے گی۔ (الھمزہ ۱۰۴:۱-۶)

قرآن یقیناً دولت کمانے کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ دولت کو بڑی قدر عطا کرتا ہے اور اسے ''فضل اللہ'' سے تعبیر کرتا ہے (الجمعہ ۶۲:۱۰، المزمل ۷۳:۲۰، المائدہ ۵:۲۰، اسی طرح دیکھیے النور ۲۴:۲۲، النمل ۲۷:۱۶، الروم ۳۰:۲۳) اور اس کے لیے ''خیر'' کا لفظ استعمال کرتا ہے (البقرہ ۲:۱۸۰، ۲۱۵، ۲۷۲-۲۷۳، ھود ۱۱:۸۴، الحج ۲۲:۱۱، ص ۳۸:۳۲، ق ۵۰:۲۵، القلم ۶۸:۱۲، المعارج ۷۰:۲۱) وہ امن اور خوش اقبالی کو خدا کی اعلیٰ نعمتوں میں شمار کرتا ہے:

''قریش (مکہ کا تاجر قبیلہ) جاڑے اور گرمی کے سفر سے کس قدر مانوس ہوا ہے (کہ اب وہ اس کا عادی بن گیا) اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے خدا کی عبادت کریں، جس نے انہیں بھوک سے بچا کر

کھانے کو دیا اور (جنگ کے) خوف کی جگہ امن سے نوازا" (قریش ۱۰۶:۱-۴)

لیکن دولت کا غلط استعمال انسان کو اعلیٰ قدریں اختیار کرنے سے روکتا ہے اور اسے اس دنیا کا حقیر سامان اور اس زندگی کا دھوکا بنا کر رکھ دیتا ہے (آل عمران ۳:۱۴، ۱۸۵، ۱۹۷، النساء ۴:۷۷، التوبہ ۹:۳۸، یونس ۱۰:۲۳، ۷۰، الرعد ۱۳:۲۶، النحل ۱۶:۱۱۷، القصص ۲۸:۶۰، المومن ۴۰:۳۹، الشوریٰ ۴۲:۳۶، الزخرف ۴۳:۳۵، الحدید ۵۷:۲۰) دولت کے حصول کے لیے اہل مکہ کی دھن کو ان کے "علم کی انتہا" قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ صرف ظاہری زندگی کو جانتے تھے اور اس کے اعلیٰ مقاصد سے غافل تھے۔ (الروم ۳۰:۷)

جب غریب اور نادار لوگوں کی بہبود کی کوئی فکر ہی نہ رہی تو عبادتیں بھی منافقانہ بن کے رہ گئیں۔

> "تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایمان کو جھٹلاتا ہے۔ یہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے اور مسکینوں کا کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پس تباہی ہے ان کے لیے جو نماز پڑھتے ہیں لیکن اپنی نمازوں سے غافل ہیں، جو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (غریب لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔" (الماعون ۱۰۷:۱-۷)

اقتصادی طور پر جو ضرورت مند لوگ ہیں ان کا کوئی خیال نہ رکھنا انسانی ذہن کی کم ظرفی اور تنگی کا قطعی اظہار ہے۔ انسان کی بنیادی کمزوری!

اہل مکہ یہ کہتے تھے کہ انہوں نے دولت محنت سے کمائی ہے اس لیے وہ اس کے جائز حق دار ہیں اور وہ اپنی خواہش کے مطابق اسے خرچ کر سکتے ہیں یا اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔ قرآن نے زور دے کر کہا کہ کمائی ہوئی ساری دولت کمانے والے کا حق نہیں ہوتی بلکہ اس میں ضرورت مند لوگوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ "ان کے مال میں مانگنے والوں اور محروم لوگوں کا حصہ ہے" (المعارج ۷۰:۲۴-۲۵، الذاریات ۵۱:۱۹) دوسرے یہ کہ قرآن نے اہل مکہ کو بتایا کہ وہ دولت بھی جو انہوں نے جائز طریقے سے جمع کی، اسے وہ محض اپنی خواہش کے مطابق خرچ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ غربت کے سمندر میں وہ امارت اور افراط کے جزیرے بن کر نہیں رہ سکتے "وہ کہتا ہے میں نے بہت سا مال (ان امور پر) لٹا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس پر کسی کی نگرانی نہیں تھی۔" (البلد

۹۰:۶-۷) بنی شعیب علیہ السلام کے لوگ انہیں بتاتے ہیں: ''اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے تھے، ہم ان کو ترک کر دیں، یا ہم اپنے مال و دولت میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟'' (ھود ۱۱:۸۷، اسی طرح دیکھئے البقرہ ۲:۲۷۷، الروم ۳۰:۳۸-۳۹ الدھر ۷۶:۹) ایک مدنی سورت البقرہ کی چند مسلسل آیات (۲۶۱-۲۷۴) میں قرآن بتاتا ہے کہ ضرورت مند پر جو بھی خرچ کیا جائے اس کی مثال گندم کے ایک دانے کی ہے جس سے سات بالیں اگتی ہیں اور ہر بال میں سو سو دانے ہوتے ہیں- رہے وہ لوگ جو نمائش کرنے کی خاطر خرچ کرتے ہیں یا وہ جو مفاد پانے والے لوگوں سے داد چاہتے ہیں ان کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے، اور ننگی چٹان باقی رہ جائے جو کچھ بھی نہیں اگا سکتی- جبکہ وہ لوگ جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ ان اونچے باغات کی طرح ہیں کہ ان پر مینہ پڑے تو دگنا پھل لائیں اور اگر مینہ نہ بھی پڑے تو پھوار ہی سہی کہ اپنی اونچائی کی وجہ سے وہ پھر بھی پھل لائیں گے- پھر کہتا ہے ''شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے (اگر تم نے معاشرے پر خرچ کیا) اور تمہیں بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے، دوسری طرف خدا تمہیں اپنی طرف سے بخشش کا وعدہ کرتا ہے اور (اس طرح خرچ کرنے پر) خوش اقبالی کا'' (البقرہ ۲:۲۶۸) بلکہ قرآن معاشروں کے انحطاط کا واحد بڑا سبب ہی اس امر کو بتاتا ہے کہ معاشرے کے امیر اور خوشحال افراد عام لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں-

> ''جب خدا انسان کو آزماتا ہے اور اس کو عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی، لیکن جب خدا اسے آزماتا ہے اور اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا- نہیں (یہ ایسا نہیں ہے) بلکہ یہ تم ہی ہو کہ یتیم کی خاطر نہیں کرتے اور نہ مسکین کے کھانے کے بارے میں ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہو- تم میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہو-'' (الفجر ۸۹:۱۵-۲۰)

اس سلسلے میں دو اہم اقدام یہ کئے گئے کہ ایک تو سود کو منع کر دیا گیا، اور دوسرے لوگوں کے مال و زر پر زکوٰۃ عائد کر دی گئی- سود کو ممنوع قرار دینے کے لیے قرآن میں اس کی بنیاد تیار کی گئی:

''جو سود تم دیتے ہو تا کہ لوگوں کے مال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے - اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا - اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، اس کے دینے والے دراصل اپنا مال بڑھاتے ہیں-'' (الروم ۳۰:۳۹)

یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ معاشرے پر خرچ کی جانے والی رقم کے بارے میں یہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ یہ کئی گنا بڑھتی ہے تو اس کے پس منظر میں سودی لین دین تھا، اس لیے کہ سود کے کاروبار میں لگائی جانے والی رقوم دگنا چوگنا ہوتی جاتی تھیں- (آل عمران ۳:۱۳۰) بہر حال سود کو حرام قرار دے دیا گیا (البقرہ ۲:۲۷۵-۲۷۸) اور لوگوں کو خبردار کر دیا گیا کہ اگر انہوں نے سود کھایا تو وہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کرنے کے لیے تیار رہیں- سود اور جائز تجارت کے درمیان جو لوگ برابری کی بات کرتے ہیں اسے رد کر دیا گیا - اور ایک دفعہ پھر سود اور خیر کے کاموں میں خرچ کرنے کے تضاد کو اجاگر کیا گیا - قرض خواہوں سے کہا گیا کہ وہ اپنا زر واپس لیں - بلکہ ''اگر تم وہ بھی معاف کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا - اگر تمہیں اس کا شعور ہو-''

سود کی ممانعت عام لوگوں کی بہبود کے لیے ضروری تھی - لیکن قرون وسطی کے اسلامی فقہا نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سود کی تمام شکلیں ممنوع قرار دی گئی ہیں اور یہ ایسا موقف ہے جسے مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت نے ابھی تک اختیار کیا ہوا ہے - باوجود اس امر کے کہ جدید بنک کاری میں ''ترقیاتی اقتصادیات'' کے ضمن میں بنیادی تبدیلی واقع ہو چکی ہے - موجودہ انتشار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ متعدد تعلیم یافتہ مسلمان اپنی پوزیشن کی تائید میں کینسے (Keynse) یا مارکس کے دلائل استعمال کرتے ہیں-

جہاں تک تقسیم میں انصاف کا تعلق ہے قرآن نے یہ اصول قائم کیا کہ ''دولت صرف امیر لوگوں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے'' (الحشر ۵۹:۷) اگرچہ یہ الفاظ مدینہ کے کھاتے پیتے لوگوں کو چھوڑ کر غریب مکی مہاجرین میں مال غنیمت کی تقسیم کے ضمن میں بولے گئے تھے اور مدینہ کے ان لوگوں نے کچھ شکایتیں بھی کی تھیں لیکن یہ قرآن کی عام اقتصادی پالیسی کے مرکزی موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہیں - چنانچہ قرآن نے جب اہل مکہ کے اس عمل کی مذمت کی کہ وہ دولت جمع کرتے تھے اور غریبوں اور ناداروں کا استحصال کرتے تھے تو مدینہ میں زکوٰۃ عائد کر دی گئی - اس کے مقاصد سورہ التوبہ ۹ آیت ۶۰ میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

''صدقات (یعنی زکوٰۃ) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلب منظور ہے- اور غلاموں کے آزاد کرانے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں، اور خدا کی راہ میں (مثلاً جہاد، معاشرتی بہبود کے امور جیسے تعلیم، صحت وغیرہ) اور مسافروں کی مدد میں بھی یہ استعمال کیے جانے چاہیں----)''

دولت خرچ کرنے کی یہ مدات، جن میں ایک وسیع معنی میں سماجی بہبود شامل ہے اور کہنہ قرض داری سے خلاصی بھی! اور (زکوٰۃ وصول کرنے کی) انتظامی خدمات کا معاوضہ، نیز مصلحت آمیز خرچ (دلوں کو جیتنے کے لیے) دفاع، تعلیم، صحت اور مواصلات پر اٹھنے والا خرچ- یہ سب اتنے پھیلے ہوئے ہیں کہ یہ ریاست کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہیں لیکن مسلمانوں نے زکوٰۃ کے ان تمام اخراجات کو ایک بندھی ٹکی روایت کے تحت بالکل محدود کر کے رکھ دیا- اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام ہی ختم ہو گیا-

معاشرتی سیاسی سطح پر قرآن کا مقصد بنیادی خاندانی اکائی کو تقویت دینا ہے جس میں ایک طرف والدین، بچے اور سن رسیدہ دادے دادیاں اور نانے نانیاں شامل ہوتی ہیں اور دوسری طرف قبیلے کی بجائے بڑی سطح پر مسلم امت! فرزندانہ وفاداری پر بہت زور دیا گیا ہے (البقرہ ۲:۸۳، النساء ۴:۳۶، الانعام ۶:۱۵۲، بنی اسرائیل ۱۷:۲۲، العنکبوت ۲۹:۸، لقمان ۳۱:۱۴، الاحقاف ۴۶:۱۵) امت کے افراد کا آپس میں جو تعلق ہے اس کا ذکر قرآن کے تمام صفحات میں بکھرا پڑا ہے خاص طور پر مدنی سورتوں میں- تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی کہا گیا ہے (الحجرات ۴۹:۱۰) وہ آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی رخنہ نہیں ہے ''گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں'' (الصف ۶۱:۴) وہ ضرورت مند مسلمانوں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان کو احتیاج ہو'' اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے لوگ مراد پانے والے ہیں'' (الحشر ۵۹:۹) ہاں البتہ کچھ سنجیدہ قسم کے تناؤ ایسے پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ایک طرف طبعی خونی رشتے ہوں (اولاد کی سعادت مندی کو شامل کر کے) اور دوسری طرف سچائی، پارسائی اور امت کے ساتھ وفاداری ہو- اور ان سب چیزوں کے لیے ایک مستقل فکر مندی کا تقاضا کیا جاتا ہے- حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بت پرست باپ کی کہانی کئی بار سنائی گئی ہے کہ کیسے بیٹے نے باپ کے لیے نرم احساس رکھنے کے باوجود خدا کی خاطر اس سے کنارہ کر

لیا (مریم ۱۹: ۴۷، الانعام ۶: ۷۵) اگر چہ یہ کہا گیا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے خدا سے مغفرت طلب کی۔ (الممتحنہ ۶۰: ۴، التوبہ ۹: ۱۱۴) لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے صرف اس لیے دعا کی "کہ اس نے باپ کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا" جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر انسان کے ماں باپ بے ایمانی میں دھنسے ہوئے ہوں تو ان کے لیے دعا مانگنا بھی کوئی اچھی بات نہیں، ہو سکتی۔ سورہ العنکبوت کی آیت ۸ میں ایک سخت اعلان کیا جاتا ہے۔ "ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیا ہے لیکن اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ دوسروں کو شریک کرو جن کا تمہیں علم بھی نہیں ہے تو تم ان کی پیروی مت کرنا" پھر حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بت پرست بیٹے (جو سیلاب میں غرق ہو گیا تھا) کی کئی بار سنائی گئی کہانی میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے۔

"اے ایمان لانے والو! انصاف کے علم بردار اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، اگر چہ اس کی زد تمہاری اپنی ذات پر اور تمہارے والدین اور رشتے داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، بہر حال اللہ دونوں سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔" (النساء ۴: ۱۳۵)

کوئی شخص دشمنوں کے ساتھ بھی غیر منصفانہ سلوک نہیں کر سکتا۔ "لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہ بات تقوی کے قریب ہے۔" (المائدہ ۵: ۸، اسی طرح المائدہ ۵: ۲) اور آخر میں اسلام کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے خون کے کسی رشتے کا پاس رکھنے کے خلاف سخت تنبیہ کی گئی ہے۔

"(اے محمد! مومنوں سے) کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑنے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں۔ اگر یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کی راہنمائی نہیں کیا کرتا۔" (التوبہ ۹: ۲۴)

چنانچہ مسلم امت کی بنیاد اس کے نظام فکر و عمل یعنی اسلام پر ہے، جس کا مقصد نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے (آل عمران ۳:۱۰۴، ۱۱۰، التوبہ ۹:۷۱) جس میں تمام خاص احکام اور ممانعتیں شامل ہیں اور جو دراصل تقوی کی معاشرتی بُعدوں کا دوسرا نام ہے۔ اپنا اجتماعی کاروبار (حکومت) چلانے کے لیے قرآن ان سے کہتا ہے کہ شوری کا نظام قائم کریں۔ (جو ایک مشاورتی کونسل یا اسمبلی ہوتی ہے) جہاں لوگوں کی مرضی ان کی نمائندگی سے اظہار پاتی ہے۔ شوریٰ ایک قبل از اسلام عرب جمہوری ادارہ تھا جسے قرآن نے بحال رکھا (الشوریٰ ۴۲:۳۸) قرآن نے خود پیغمبر کو حکم دیا (آل عمران ۳:۱۵۹) کہ لوگوں کے بڑوں سے مشورہ کر کے ہی معاملات کے فیصلے کیا کرو۔ لیکن پیغمبر کی غیر موجودگی میں قرآن (الشوریٰ ۴۲:۳۸) معلوم ہوتا ہے کسی طرح کی اجتماعی قیادت اور ذمے داری کا مطالبہ کرتا ہے۔ قرآن ایک مرد آہن کی حکومت ایک عارضی انتظام کے طور پر ہی برداشت کر سکتا ہے۔ اس صورت میں کہ لوگ ابھی پختہ ذہن کے نہ ہوئے ہوں۔ اس لیے کہ ایک معاشرہ جس کے لوگ ناپختہ رہ جائیں وہ پختہ کار رہنما کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں بہت سے مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک مرد آہن کی حکمرانی کے تصور کو جائز قرار دیا جائے اور اس کی تبلیغ کی جائے قرآن کی تعلیمات کے بالکل خلاف پڑتا ہے۔

اس کے ساتھ قرآن اختلاف اور گروہ بندی کی بھی سختی کے ساتھ ممانعت کرتا ہے، چاہے یہ کام گروہوں کا ہو یا سیاسی جماعتوں کا (اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاسی جماعتوں کی ممانعت ہے، صرف جتھابندی سے روکا گیا ہے) قرآن بہت محکم انداز میں کہتا ہے۔

> ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا لیکن وہ پھر وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں------ اے مومنو! جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقوی کی باتیں کرو----- کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں (المجادلہ ۵۸:۸-۱۰ اسی طرح دیکھئے آیت ۷، اور النساء ۴:۱۱۴)

سیاسی جماعتیں جو اپنی ذات میں خوش آئند ہو سکتی ہیں، انہیں نیچے گر کر ایسی قوتوں میں تبدیل نہیں ہو جانا چاہیے جو امت کو تقسیم کر کے رکھ دیں، بلکہ انہیں ایک دوسرے سے بھی مشورہ لینا چاہیے۔ جمہوری نظام کی شورش انگیزی کے خطرات سے بچنا لازم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اداروں کی فیاضانہ کثرت اور بنیادی انفرادی آزادی میں دلچسپی رکھنے کے باوجود قرآن بعض خاص حالات میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ ریاست کو، جب وہ معاشرے کی نمائندہ ہو سب سے بالاتر ہونا چاہیے۔ بغاوت کو بہت سخت جرمانے کی سزا دی جاتی ہے۔

> ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا انہیں سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں تو ان کے لیے اس سے بھی بڑی سزا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔''
>
> (المائدہ ۵:۳۳،۳۴)

جب مسلمانوں کے گروہوں کے درمیان نزاع اور باہمی ان بن کی صورت ہو تو قرآن ثالثی فیصلے کا حکم دیتا ہے۔ اگر ایک پارٹی ثالثی فیصلے کو رد کرتی ہے تو اسے طاقت کے زور پر منوانا چاہیے (الحجرات ۴۹:۹، اسی طرح آیت ۱۰) پھر اسلام عام لوگوں کی مصلحت کے لیے خبروں کی ایک طرح سے نگرانی اور ان کو سنسر کرنے کی بھی ترغیب دیتا ہے، جہاں یہ خطرہ ہو کہ خبروں کو کھلم کھلا مشتہر کرنے سے عوام کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔

> ''اور جب ان کو امن یا جنگ کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو (منافقین مدینہ) اسے مشہور کر دیتے ہیں (لوگوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے) لیکن اگر وہ اس کو اپنے رسول اور اپنی جماعت کے صاحب امر لوگوں تک پہنچاتے تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجاتی جو اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔''
>
> (النساء ۴:۸۳)

ایک عام قاعدے کی رو سے مسلمانوں کو ''خدا، رسول اور وہ جو تم میں صاحب امر (باقاعدہ منتخب یا مقرر کردہ حاکم) ہیں کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔'' (النساء ۴:۵۹)

لیکن یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ احتجاج یا بغاوت کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے- بلکہ قرآن کے مطابق حضرت نوح کے بعد تمام انبیاء اپنے وقت کے قائم کردہ نظام کے خلاف باغی ہی تھے- قرآن کے لیے جانچنے کی اصل چیز وہ ہے جسے وہ "فساد فی الارض" سے تعبیر کرتا ہے جو ایسی کوئی بھی صورت حال ہو سکتی ہے جس سے عام لاقانونیت پھیلے، چاہے وہ سیاسی ہو، اخلاقی ہو یا معاشرتی، جب بین الاقوامی معاملات اختیار میں نہ رہیں- قرآن رسول اللہؐ کے زمانے کی صورت حال پر رائے زنی کرتا ہے غالباً ان بین الاقوامی حالات کو سامنے رکھ کر جو ایران اور بازنطین کی جنگوں کا نتیجہ تھے (قرآن کی سورت اس جنگ کے حوالے سے شروع ہوتی ہے جس میں بازنطینی قوتوں کو شکست ہوئی تھی)

> "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں، (اے نبی!) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے، ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے-" (الروم ۳۰:۴۱،۴۲)

"فساد" یا "فساد فی الارض" اور "اصلاح" یا "اصلاح فی الارض" کے دوسرے حوالوں کے لیے دیکھیے سورہ البقرہ ۲:۱۱، ۲۷، ۲۰۵، الانفال ۸:۷۳، الاعراف ۷:۵۶، ۸۵، ہود ۱۱:۱۱۶، یوسف ۱۲:۷۳، الرعد ۱۳:۲۵، النحل ۱۶:۸۸، النمل ۲۷:۴۸، الشعراء ۲۶:۱۵۲، القصص ۲۸:۷۷)

تمام انسانی حقوق کا لب لباب پوری نسل انسانی کی برابری ہے جسے قرآن نے اختیار کیا، اس کی تائید کی اور اس کی باقاعدہ توثیق کر دی- اس نے انسانوں کے درمیان تمام امتیازات ختم کر دیے سوائے ان کے جن کی بنیاد نیکی اور تقویٰ تھی-

> "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں- آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو- ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بہت بری بات ہے- جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں- اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے

سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے
کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے
ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے۔ تمہیں اس سے گھن ہی آئے گی۔
اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔ لوگو! ہم نے تم کو
ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا
دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے
سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز
گار ہے (نہ کہ کسی ایک یا دوسری نسل یا قوم سے تعلق رکھنے والا) یقیناً اللہ
سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔" (الحجرات ۴۹: ۱۱-۱۳)

قرآن جب بنیادی انسانی مساوات پر زور دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نوع کے بعض افراد دوسروں پر اس طرح کی سفاکانہ برتری جتاتے ہیں جو تمام حیوانات میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں انسانی عقل اپنی بگڑی ہوئی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انسانی امکانات اور ان کے واقعی حصول کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ جاندار چیزوں کی کوئی بھی نوع اس طرح کے فاصلے سے دوچار نہیں ہوتی۔ قدرتی نقائص کو چھوڑ کر مثلاً کان کے کسی ایک کیڑے اور دوسرے کیڑے کے درمیان بمشکل کوئی فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ہم ارتقاء کے پیمانے پر اوپر کی طرف جاتے ہیں تو مختلف انواع کے امکانات اور ان کی عام خصوصیات کے درمیان فاصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ بڑے حیوانوں مثلاً بعض اقسام کے کتوں میں یہ فاصلہ دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں حیران کن ہوتا ہے۔

لیکن یہ انسان ہی ہے جس میں یہ فاصلہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ایک طرف خدا کے رسولوں کا اور ان کے ضمیر کا، ان کی حساسیت کا، ان کی ذہانت کی تیزی اور خدا پرستی کا ذکر کرتا ہے اور دوسری طرف بنی نوع انسان کی بہت بڑی تعداد کا جو "چوپائیوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے، یہ لوگ غفلت میں پڑے ہیں" (الاعراف ۷: ۱۷۹) پھر یہ ہے کہ انسان میراث میں یا کسی دوسری طرح سے حاصل کی ہوئی طاقت کا اس طرح استحصال کر سکتا ہے کہ اس میں اس کی ذاتی کامیابی کا کوئی دخل نہ ہو۔ بلکہ جو اسے ذاتی انحطاط کی طرف لے جائے۔ یہ ایک بالکل غیر معقول بات ہے لیکن تنہا انسان ہی اس کا ارتکاب کر سکتا ہے اور اس کی سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔

انسان اور انسان کے درمیان فرق کرنے کے یہ مصنوعی لیکن طاقتور ذرائع ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان مسلسل اپنے آپ کو یہ یاد دلاتا رہے کہ ''ہم تمام آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تھا'' (جیسا کہ رسول اللہؐ کے حجتہ الوداع کے خطبے میں آیا) نیز یہ کہ مٹی کی تاریکی میں کوئی امتیازات باقی نہیں رہتے اور اگر آسمانوں کی روشنی میں امتیازات ہیں بھی تو ان کی بنیاد وہ اصل ذاتی قدر و قیمت ہے جسے تقویٰ کہتے ہیں۔

اسلام کے قانون دانوں نے مکمل جواز کے ساتھ چار بنیادی آزادیوں یا حقوق پر زور دیا ہے۔ زندگی، مذہب، روزگار اور جائداد کی ملکیت، اور ذاتی انسانی آبرو اور وقار (عرض) اور ان تمام کی حفاظت کرنا ریاست کا فرض ہے (زندگی کے لیے: المائدہ ۵:۳۲، مذہب اور عقیدے کے لیے البقرہ ۲:۲۵۶، جائداد کے لیے: دولت کمانے سے متعلق وہ تمام آیات جو اقتصادی عدل اور زکوٰۃ کے سلسلے میں اوپر دی گئیں۔ ذاتی عزت و زبرو کے لیے وہ تمام آیات جن کا تعلق انسان کے شرف و وقار کے ساتھ ہے اور خود حضرت آدم کی پیدائش کی کہانی سورہ البقرہ ۲ آیت ۳۰ میں) ان حقوق کو بڑے پیانے پر پامال کرنا جس میں محض غربت کی وجہ سے انسان کی تحقیر کرنا بھی شامل ہے۔ فساد فی الارض کے زمرے میں آئے گا۔ تاہم قرآن کی نظر میں اتنا ہی بگاڑ اور فساد فی الارض واقع ہوتا ہے جب معاملے کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے، یعنی جب لوگ وہ ذمے داریاں پوری نہیں کرتے جن پر قرآن اس سے بھی زیادہ زور دیتا ہے۔ ''ذمے داریاں'' اور ''حقوق'' ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر زیادہ عرصہ باقی نہیں رہ سکتا۔ درحقیقت قرآن ایک ایسا صحیفہ ہے جو سب سے پہلے نیکی اور اخلاقی ذمے داری کے قوی احساس کی نصیحت کرتا ہے۔ اس امر کا اشارہ دیتے ہوئے کہ ذمہ داری کا پورا احساس بہت اچھی طرح سے تمام انسانی حقوق کا خیال رکھ سکتا ہے لیکن اس کا الٹ اتنا صحیح نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معاشرہ جو ''حقوق'' کو آزادہ روی اور لاقانونیت کے معنوں میں لینے لگتا ہے وہ اپنی ہلاکت کا خود ہی بندوبست کرتا ہے۔

قرآن نے اپنی مخصوص معاشرتی اصلاحات کے ذریعے یہ چاہا کہ ملت کے کمزور طبقوں یعنی مفلسوں، یتیموں، عورتوں اور غلاموں کو طاقتور بنایا جائے۔ لیکن قرآن کی ان معاشرتی اصلاحات کو سمجھنے میں ہم بنیادی غلطی کریں گے اگر ہم نے قانونی احکامات اور اخلاقی ہدایات کے درمیان جو فرق ہے اس کو سامنے نہ رکھا۔ ان دونوں کے درمیان فرق کر کے ہی ہم نہ صرف قرآنی تعلیم کا صحیح

رخ معلوم کر سکتے ہیں بلکہ بعض پیچیدہ (مثلاً عورتوں کی اصلاح کے متعلق) مسائل کا حل بھی تلاش کر سکتے ہیں- یہ وہ میدان ہے جہاں مسلمانوں کی فقہی روایت جو قرآن کو محض ایک قانون کی کتاب سمجھتی رہی نہ کہ قانون کا ایک دینی ماخذ، غلط راستوں پر چل نکلی-

مثلاً کثرت ازدواج کی مثال لیجئے- قرآن کہتا ہے: ''اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو (یتیم) عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین یا چار چار سے نکاح کر لو- لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم (اپنی بیویوں کے ساتھ) انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو ---- بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ بہترین راستہ ہے-'' (النساء ۴:۳) اسی سورت میں اس سے پہلے کی آیت ۲ میں قرآن یتیم بچوں اور بچیوں کے بہت سے متولیوں پر (یتیموں کی کثرت بار بار کی جنگوں کا لازمی نتیجہ تھی) ان کی جائدادوں کے بارے میں بددیانت ہونے کا الزام لگاتا ہے---- یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا قرآن مکی دور میں ہی ذکر کرنے لگا تھا (الانعام ۶: ۱۵۳، بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴) اور مدینے میں آ کر اس پر مزید زور دینے لگا (البقرہ ۲: ۲۲۰، النساء ۴: ۲، ۶، ۱۰، ۱۲۷، یتیموں کی عام بہبود کے لیے دیکھئے: البقرہ ۲: ۸۳، ۱۷۷، ۲۱۵، النساء ۴: ۸، الفجر ۸۹: ۱۷، الضحیٰ ۹۳: ۹، الماعون ۱۰۷: ۲ مال غنیمت میں ان کا اور عام غریبوں کا حصہ الانفال ۸: ۴۱، الحشر ۵۹: ۷) تو قرآن کہتا ہے کہ چونکہ متولی یتیم عورتوں کی جائدادوں کے معاملے میں دیانت داری سے کام نہیں لیتے انہیں ان کے ساتھ شادی کر لینی چاہیے، چار کی تعداد تک، بشرطیکہ وہ ان کے درمیان انصاف کر سکیں- اس بات کا ثبوت کہ یہ اس نص کی صحیح تعبیر ہے اس سورت کی ایک اور آیت سے ملتا ہے جو النساء ۴ کی آیت ۳ سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے- وہ یہ کہ ''(اے محمدؐ!) لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں- تو کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں، جن کے حق تم ادا نہیں کرتے لیکن ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو، اور اسی طرح ان بچوں کے متعلق جو کمزور ہیں (النساء ۴: ۱۲۷) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سوال یتیم لڑکیوں کے خصوصی حوالے سے سامنے آیا، لیکن قرآن یہ بھی کہتا ہے، ''تم ان عورتوں کے درمیان کبھی انصاف نہ کر سکو گے، بے شک تم کتنا ہی اس کی خواہش کرو-'' (النساء ۴: ۱۲۹)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چار عورتوں تک سے شادی کرنے کی اجازت، ان بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کی ضرورت، اور صاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کہ انسانی مزاج کو دیکھتے

ہوئے یہ بات ناممکن ہے- ان سب میں ایک تضاد ہے- روایتی تعبیر اس معاملے کی یہ رہی کہ اجازت کی شق کے پیچھے تو قانون کی طاقت ہے جبکہ انصاف کا مطالبہ اگرچہ اہم ہے، اسے خاوند کے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہے- (اگرچہ روایتی قانون عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ صریح بے انصافی یا ظلم ہو رہا ہو تو وہ اس مسئلے کی اصلاح کے لیے یا طلاق لینے کے لیے درخواست کرے) معیاری مذہب کے نقطہ نظر سے اس صورت حال کی کمزوری یہ ہے کہ کوئی چیز خاوند کے اچھے ضمیر پر چھوڑ دی جائے اگرچہ انسانی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی ہے کہ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا- دوسری طرف مسلم جدیدیت پسند لوگ انصاف کے تقاضے کو اولیت دیتے ہیں اور اس کے ساتھ انصاف کے ناممکن ہونے کا اعلان بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک سے زیادہ بیویوں (Polygamy) کی اجازت دیتے وقت پیش نظر یہ تھا کہ یہ عارضی ہوگی اور ایک محدود مقصد کے لیے ہوگی-

حقیقت یہ دکھائی دیتی ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ثانوی سطح پر دی گئی تھی لیکن اس پر جو پابندیاں عائد کی گئیں وہ گویا ایک اخلاقی نمونہ تھا جس کی طرف متوقع طور پر معاشرے کو بڑھنا تھا- اس لیے کہ کثیر زنی کو قانونی طور پر بیک قلم منسوخ کر دینا ممکن نہیں تھا- ہم اسی طرح کی صورت حال کا سامنا غلامی کے مسئلے پر بھی کرتے ہیں- قرآن نے قانونی طور پر تو غلامی کے ادارے کو تسلیم کر لیا، اس لیے کہ اسے بھی بیک جنبش قلم قانونی طور پر ممنوع قرار دینا ممکن نہیں تھا- لیکن اس نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بہت ہمت افزائی کی (البلد۹۰:۱۳، المائدہ ۵:۸۹، المجادلہ۵۸:۳) بلکہ اس نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ وہ غلاموں کو ایک متفقہ رقم قسطوں میں ادا کر کے اپنی آزادی خریدنے کی اجازت دیا کریں (النور۲۴:۳۳) لیکن قدیم مسلم فقہا نے اسے ایک سفارش قرار دیا، نہ کہ حکم!

ایسا لگتا ہے کہ اسلامی قانون سازی میں عموماً یہی طریق کار رہا ہے- اگر ہم عام بات کریں تو ہر ایک قانونی یا نیم قانونی اعلان کے ساتھ ایک ratio legis ہوتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ ایک قانون کا کیوں اعلان کیا جا رہا ہے- اس ratio legis کو پوری طرح سمجھنے کے لیے معاشرتی تاریخی پس منظر (جسے مفسرین شان نزول کہتے ہیں) کا سمجھنا بہت ضروری ہے- ratio legis سارے معاملے کا نچوڑ ہوتا ہے اور جو قانون سازی کی جاتی ہے وہ اس کا مادی اظہار ہوتا ہے، اگر یہ اس کے مقصد کو مطابق اصل اور صحیح طرح پر حاصل کرتی ہے- اگر یہ اس مقصد کو حاصل نہیں کرتی

تو قانون کوتبدیل کرنا ضروری ہوتا ہے۔لیکن قدیم فقہا ratio legis کو ماننے کے باوجود قانون کے الفاظ سے چمٹے رہے اور یہ اصول سامنے لائے کہ "اگر چہ ایک قانون ایک خاص صورت حال کے نتیجے میں وضع کیا گیا، تاہم اس کا اطلاق اب سب طرح کے حالات پر ہوگا" مثلاً یہ کہا گیا ہے (البقرہ:۲۸۲) کہ قرض کا معاملہ کرتے ہوئے، قرض چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، اسے لکھ لیا جائے اور اس معاملے کے دو گواہ ہونے چاہئیں، جو دو قابل اعتبار مرد ہوں یا اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں" تاکہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے" ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ بھولنے والی ہوں گی، اس لیے کہ ان وقتوں میں عورتیں عام حالات میں قرض کا لین دین کرنے کی عادی نہیں تھیں۔ روایت پرست لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ قانون کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے، ابدی ہے اور ایسی معاشرتی تبدیلی جس سے ایک عورت اس قابل ہو جائے کہ وہ مالی لین دین کرنے لگے "غیر اسلامی" ہوگی۔ دوسری طرف جدیدیت پسند یہ کہے گا کہ چونکہ عورت کی گواہی کی کم تر قیمت ہونے کا انحصار مالی معاملات میں اس کی کمزور یاداشت پر تھا، اس لیے جب عورتیں اس طرح کے معاملات سے واقف ہو گئیں۔ جس میں نہ صرف کوئی خرابی نہیں بلکہ جو معاشرے کی بہتری کے لیے ہے۔ تو ان کی گواہی مردوں کی گواہی کے برابر ہونی چاہیے۔

اسی طرح کا سوال عورتوں اور مردوں کی عام مساوات کا ہے۔ قرآن کہتا ہے: "اور عورتوں کا بھی (مردوں پر) ویسا ہی حق ہے جیسا معروف طریقے پر (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے" (البقرہ۲:۲۲۸)۔ یہ بات یقینی ہے کہ قران عام طور پر محنت کی تقسیم اور عملی فرائض میں فرق کرنے کا قائل ہے (اگر چہ قرآن میں کہیں اس بات کی ممانعت نہیں ہے کہ عورتیں دولت کمائیں اور اقتصادی طور پر خود مکتفی ہوں۔ بلکہ آنحضرت کی پہلی بیوی ایک تجارتی کاروبار کی مالکہ تھیں اور قرآن ایک بیوی یا بیٹی کی مکمل اور آزاد اقتصادی شخصیت کو تسلیم کرتا ہے) سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ آیت صنفین کے درمیان جبلی عدم مساوات کا بیان ہے؟ ہمیں بتایا گیا ہے کہ "مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے کچھ انسانوں کو دوسروں پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ مردوں پر یہ ذمے داری ہے کہ (عورتوں پر) خرچ کریں۔" (النساء۴:۳۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر اپنے فریضے کی وجہ سے، نہ کہ جبلی طور پر، فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان کو پیسہ کمانے اور اسے عورتوں پر خرچ کرنے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ ہم پچھلے

باب میں کہہ چکے ہیں کہ قرآن بعض مردوں کی دولت اور طاقت میں برتر حیثیت کا اکثر ذکر کرتا ہے۔اسی طرح وہ بعض انبیاء کی دوسرے انبیاء پر فضیلت کا بھی ذکر کرتا ہے۔لیکن یہ فضیلت جبلی نہیں ہوتی بلکہ خالصتہً منصبی اعتبار سے ہوتی ہے۔اگر عورت اقتصادی اعتبار سے خودکفیل ہو جاتی ہے، چاہے وراثت کے ذریعے یا خود دولت کما کر، اور گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ادا کرتی ہے تو مرد کی برتری اسی نسبت سے کم ہو جائے گی، اس لیے کہ بطور ایک انسان کے اس کو اپنی بیوی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔

مذہبی نقطہ نظر سے مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے بالکل برابر ہیں۔"اور جو بھی اچھے کام کرے گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت اور صاحب ایمان ہو تو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے۔" (النساء ۴:۱۲۴، المومن ۴۰:۴۰، اسی طرح النحل ۱۶:۹۷) اکثر جب نیکی اور تقویٰ والے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو قرآن مردوں اور عورتوں کا الگ الگ ذکر کرتا ہے۔

> "(جو لوگ خدا کے آگے سر اطاعت خم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں، اور مطیع فرمان مرد اور مطیع فرمان عورتیں، اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں --- ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔" (الاحزاب ۳۳:۳۵)

چھوٹی بچیوں کے قتل کے دستور کو جس کا بعض عرب اپنی غربت یا عزت کی وجہ سے ارتکاب کرتے تھے، بالکل خاتمہ کر دیا گیا اور "جب اس لڑکی سے جسے زندہ دفنا دیا گیا تھا پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماردی گئی؟" (التکویر ۸۱:۸-۹)

> "جب ان میں کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی اچھی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنی آزردگی چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس خبر بد کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور (سوچتا ہے) کہ آیا ذلت برداشت کرتے ہوئے اسے زندہ رکھے یا اسے مٹی میں دبا دے۔خبردار!

یہ بہت ہی برا فیصلہ کرتے ہیں" (النحل ۱۶: ۵۸-۵۹، اسی طرح دیکھئے
سورہ الزخرف ۴۳: ۱۷، بنی اسرائیل ۱۷: ۳۱، الانعام ۶: ۱۴۱، ۱۵۲، الممتحنہ
۶۰: ۱۲)

سورہ الانعام کی آیت ۱۳۸ میں بہت زور دے کر اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ مشرکین عرب اپنے بچوں کو قتل کرنے کا جواز یہ دیتے تھے کہ ان کے خدا ایسا چاہتے تھے۔

قرآن نے بیواؤں کی ان سے سوتیلے بیٹوں کے ساتھ شادی کرنے کی بھی ممانعت کر دی (النساء ۴: ۲۲ پھر دیکھئے النساء: ۱۹) اساسی طور پر قران کا نقطہ نظر ازدواجی تعلق کے بارے میں یہ ہے کہ یہ محبت اور رحمت کے قدرتی جذبات کے بل پر ہی قائم رہتا ہے (الروم ۳۰: ۲۱) اور کہا گیا ہے کہ "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو" (البقرہ ۲: ۱۸۷) عورتوں کے ساتھ مہربانی اور فیاضی کے سلوک کی تلقین کی گئی ہے:

"اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو، اور نہ یہ جائز ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو ان میں سے کچھ لے لینے کے لیے تم انہیں تنگ کرو۔ سوائے اس کے کہ وہ کھلے طور پر فحاشی کی مرتکب ہوں۔ اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔ اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری کرنی چاہو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ مت لو۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور تم دیا ہوا مال کیسے واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔" (النساء ۴: ۱۹-۲۱)

طلاق کے بعد بچے کو دودھ پلانے کے مسئلے پر سورہ البقرہ آیت ۲۳۳ میں بات کی گئی ہے لیکن آیت ۲۲۹ سے ۲۳۲ میں خود طلاق کے مسئلے کے بارے میں بیان ملتا ہے۔ ان آیات میں بڑی وضاحت سے پتا چلتا ہے کہ قرآن یقیناً بچوں کی خاطر، دوسری شادی کی اجازت دے کر ایک خاندان کو باقی رکھنے کا کتنا آرزومند ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ جو مسلم امت کے تاریخی رویے کے ساتھ انوکھی طرح سے عدم مطابقت رکھتی ہے۔

''طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لینا ہے، یا بھلے طریقے سے اسے رخصت کر دینا ہے- اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو، سوائے اس صورت کے کہ زوجین کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکیں گے اور اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہیں رہ سکیں گے تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت رہائی پانے کے بدلے میں کچھ دے ڈالے- یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں پس ان سے باہر نہ نکلنا- اور جو بھی خدا کی حدود سے باہر نکلے گا تو ایسے لوگ ظالم ہیں- پھر اگر شوہر نے (دو بار طلاق دینے کے بعد) تیسری بار طلاق دے دی تو اس کے بعد عورت جب تک دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے، اس کے لیے حلال نہیں ہو گی- پس اگر وہ دوسرا خاوند اسے طلاق دے دے تو ان پر کچھ گناہ نہیں کہ پہلا خاوند اور وہ عورت ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لیں- اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے- یہ خدا کی حدود ہیں جو وہ ان لوگوں پر واضح کرتا ہے جو دانش مند ہیں- جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو یا تو انہیں بھلے طریقے سے روک لو، یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو، اور انہیں تم اس لیے نہ روکے رکھنا کہ ان کو تکلیف دو گے اور ان پر زیادتی کرو گے- جو کوئی بھی ایسا کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا (اس جملے کے لیے دیکھیے صفحات **47-45**) اور اللہ کی آیات کو ہنسی کھیل نہ بناؤ---- اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو انہیں اس بات سے نہ روکو کہ وہ دوسرے مردوں سے شادی کر لیں جب کہ وہ بھلے طریقے سے اس امر پر راضی ہو جائیں- یہ نصیحت کی جاتی ہے ان سب کو جو تم میں سے اللہ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو- یہ تم لوگوں کے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (البقرہ ۲:۲۲۹-۲۳۲)

اپنے قوانین میراث میں (النساء:۷-۱۲،۱۷۶) قرآن نے لڑکیوں اور دوسری عورتوں کے حصے مقرر کیے لیکن ایک بیٹی کا حصہ بیٹے کے حصے سے آدھا رکھا- جدیدت پسند مسلمانوں کی رائے اس بارے میں منقسم ہے کہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں لڑکی کو اپنے بھائی کے برابر حصہ ملنا چاہیے یا نہیں- اس تبدیلی کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ چونکہ بیٹی کو جب اس کی شادی ہوتی ہے، اپنے خاوند سے جہیز ملتا ہے (جس کے بغیر شادی جائز نہیں ہو سکتی) تو میراث کے حصوں میں جو ظاہری عدم مساوات ہے وہ اصل میں برابری ہی ہے- آج کے حقائق کی روشنی میں اس مسئلے پر مزید غور کیا جانا چاہیے-

ہم قرآن کے عام معاشرتی فلسفے کے بیان کی طرف لوٹتے ہیں- انسانی تاریخ بنیادی طور پر عبارت ہے معاشروں اور تہذیبوں کے بننے اور بگڑنے کے ایک مسلسل عمل سے، ان معیارات کی بنا پر جو لازماً اخلاقی ہوتے ہیں- ان کا ماخذ تو ماورائے ادراک ہوتا ہے- لیکن ان کی تطبیق پوری طرح اجتماعی انسانی زندگی کے اندر ہی ہوتی ہے- یہ معیار ''سنت اللہ'' کہلاتے ہیں (نوع انسانی کے لیے عمل کا نمونہ یا قانون جو تبدیل نہیں ہو سکتا)

> ''جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان کے بارے میں ہمارا یہی طریقہ رہا ہے اور تم ہمارے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے-'' (بنی اسرائیل ۱۷:۷۷)
>
> ''اور جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی طریقہ رہا ہے اور خدا کا حکم ایک ایسا فیصلہ ہے جو طے شدہ ہوتا ہے'' (الاحزاب ۳۳:۳۸)
>
> ''جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی خدا کا یہی دستور رہا ہے اور تم خدا کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے'' (الاحزاب ۳۳:۶۲)
>
> ''تو کیا یہ لوگ (مخالفین پیغمبر) اس انتظار میں ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے، وہی ان کے ساتھ بھی برتا جائے- اگر یہ بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور نہ یہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو کوئی طاقت اپنے مقررہ راستے سے پھیر سکتی ہے''
> (فاطر ۳۵:۴۳، اسی طرح الانفال ۸:۳۸، الحجر ۱۵:۱۳، الکہف ۱۸:۵۵، المومن ۴۰:۸۵، الفتح ۴۸:۲۳)

یہ "تاریخ کے فیصلے" کا قرآنی تصور ہے جو انسانی گروہوں اور قوموں پر اترتا ہے بجائے افراد کے (جن کا حساب آخرت میں ہوگا)- جب قرآن ان فیصلوں کا ذکر کرتا ہے جو لوگوں پر ان کی مجموعی کارکردگی کی وجہ سے وارد ہوئے، تو وہ بہت زیادہ صاف صاف اور کھلے الفاظ میں بات کرتا ہے، بہ نسبت اس کے جب وہ اس فیصلے کی بات کرتا ہے جو قیامت کے روز افراد کے بارے میں کیا جائے گا- دوسری حالت میں خدا بخشنے والا اور مہربان ہوتا ہے، چاہے کسی فرد نے بہت سی غلطیاں کی ہوں- تاہم قوموں کو اگرچہ خدا کچھ مہلت دیتا ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید وہ اپنا رویہ درست کر لیں اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنا لیں- (الرعد ۱۳:۳۲، الاعراف ۷:۱۸۳، الحج ۲۲:۴۴، ۴۸، آل عمران ۳:۱۷۸، القلم ۶۸:۴۵) لیکن "جب ان کا وقت آن پہنچتا ہے تو وہ نہ تو اسے آگے کر سکتے ہیں نہ پیچھے" ماضی کی بعض قومیں اس طرح مٹادی گئیں کہ "پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین، اور کوئی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی" (الدخان ۴۴:۲۹) بعض قوموں کے گناہوں کی پاداش میں پورے کرہ ارضی کو تباہ نہیں کیا جاتا، چنانچہ ان میں سے بعض تو کھڑی رہتی ہیں اور بعض کی فصل کٹ جاتی ہے (ھود ۱۱:۱۰۰، دیکھئے یونس ۱۰:۲۴) لیکن جب ایک قوم تباہ ہو جاتی ہے یا اخلاقی طور پر صاف ستھری اور طاقتور تہذیب آ کر اس کی جگہ لے لیتی ہے تو اس کے اچھے افراد کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اس کے برے افراد کا، اگر ان اچھے افراد نے انحطاط کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی-

> "پھر کیوں نہ ان قوموں میں سے جو تم سے پہلے گزریں- ایسے ہوشمند اور عاقبت اندیش موجود رہے جو لوگوں کو اللہ کی زمین میں فساد کرنے سے روکتے، سوائے چند قلیل افراد کے جن کو ہم نے بچا لیا- اور ظالم لوگ تو انہی چیزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے-" (ھود ۱۱:۱۱۶)

تو قرآن کے مقصد کا لب لباب یہی ہے کہ لوگوں کو اخلاقی تنزل کا راستہ اختیار کر کے اللہ کی زمین پر فساد کرنے سے باز رکھا جائے- چنانچہ سزا کی ایک مخفی دھمکی کے طور پر یہود کے بارے میں کہا گیا "بھلا ان کے مشائخ اور علماء انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے؟ بلاشبہ وہ بہت برا کرتے ہیں" (المائدہ ۵:۶۳) اس حکم کی عدم تعمیل کا گناہ اتنا ہی برا ہے جتنا کہ کسی برائی کے ارتکاب کرنے کا سنگین گناہ- یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے لوگوں کو اس

بات سے خبردار کیا، اوران لوگوں کے ذریعے دوسروں کو آگاہ کیا- اس لیے کہ ایک رسول اپنے سامنے کے لوگوں سے خطاب کرتا ہے- اوراس کا پیغام جب ایک دفعہ سنادیا جائے تو وہ عالمگیر ہو جاتا ہے- اسی وجہ سے قرآن نبوت کے ناقابل تقسیم ہونے پر اتنا زور دیتا ہے(جیسا کہ ہم باب پنجم اور ضمیمہ اول میں دیکھیں گے)انحطاط کو روکنے کا یہ کام، یا ایک دفعہ جب وہ شروع ہو جائے تو اس کا ازالہ کرنے کا عمل ہر اس امت کا فریضہ تھا جس کی داغ بیل اس کے رسول نے ڈالی تھی- آنحضرتؐ کے واسطے سے یہ فرض اب مسلم امت پر عائد ہو گیا ہے جن کے ذمے یہ لگایا گیا ہے کہ وہ ''بنی نوع انسان پر گواہ بن کے رہیں'' اور ''نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں'' (البقرہ ۲:۱۴۳، آل عمران ۳:۱۰۴، ۱۱۰) اور یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کے لیے جیسا کہ ہم دیکھیں گے، جہاد کا ضروری وسیلہ مہیا کیا گیا-

اخلاقی حالت کے کمزور پڑ جانے کو قرآن ایک قدرتی عمل کے طور پر پیش کرتا ہے ''ان پر بہت طویل زمانہ گزر گیا، تو ان کے دل سخت ہو گئے-'' (یعنی ان کے ضمیر بے حس ہو گئے) (الحدید ۵۷:۱۶) ''ہم نے کئی امتوں کو پیدا کیا، اوران پر طویل مدت گزر گئی'' (القصص ۲۸:۴۵، اسی طرح الفرقان ۲۵:۱۸) اسی ضمن میں قرآن یہودیوں اور عیسائیوں سے کہتا ہے ''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آ چکا ہے جو حق اور باطل کو کھول کر بیان کرتا ہے، رسولوں کی آمد کے ایک طویل وقفے کے بعد تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ خوشخبری دینے والا آیا اور نہ کوئی ڈر سنانے والا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے-'' (المائدہ ۵:۱۹)

اگر کسی امت کو اپنا یہ کام جاری رکھنا ہو تو ضمیر کی تجدید (renewal) بہت ضروری ہوتی ہے- اس سلسلے میں قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کو ان کے امتیازانہ دعووں کی وجہ سے خاص طور پر نشانہ بناتا ہے (اگر چہ وہ موخر الذکر کو یقیناً اول الذکر پر ترجیح دیتا ہے) ''وہ کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا جنت میں کوئی بھی داخل نہ ہوگا'' (البقرہ ۲:۱۱۱) ''وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو سیدھے راستے پر آ جاؤ گے- ان سے کہو کہ ہدایت تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے'' (البقرہ ۲:۱۳۵، اسی طرح دیکھئے آیت ۱۲۰، المائدہ ۵:۱۸) اوران کی پارسائی کا پیمانہ یہ ہے کہ ''یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کے پاس کچھ نہیں حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں-'' (البقرہ ۲:۱۱۳) قرآن نے مسلمانوں سے یہ بھی بار بار کہا ہے کہ جب تک وہ خدا کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے کوشش نہیں کرتے وہ خدا کے لیے

ناگزیر نہیں ہیں۔" اگر تم پلٹ جاؤ تو خدا تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور وہ لوگ تم جیسے نہیں ہوں گے۔" (محمد ۴۷:۳۸، اسی طرح دیکھئے التوبہ ۹:۳۹)

گناہ کی وہ خاص اقسام جو ایک معاشرے کو ختم کر سکتی ہیں، بہت سی ہو سکتیں ہیں جیسا کہ ہم نے کہا: اقتصادی جبر اور مفلس لوگوں کا استحصال یا غریبوں اور ماتحت طبقوں پر سیاسی اور معاشرتی ظلم وزیادتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "زمین کی وراثت" کمزور اور مظلوم طبقوں کی طرف آ جاتی ہے جیسا کہ فرعون کے معاملے میں بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا (الاعراف ۷:۱۳۷، القصص ۲۸:۵) یا پھر بت پرستی اور جنسی آزادی کی برائیاں پیدا ہو سکتی ہیں جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی امتوں میں دیکھی گئیں۔ جب انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو یا تو اس کے خلاف اندر سے ایک کامیاب ردعمل ہوتا ہے یا باہر سے کوئی طاقت مسلط کر دی جاتی ہے۔ اول الذکر زیادہ دیکھنے میں آتا ہے۔ تاہم اس معاملے میں بھی ایک نئی ابتدا کی جانی ہوتی ہے اور عموماً ایک نئی نسل کو ایک دفعہ پھر ایک صاف ستھری تہذیب کی بنا رکھنی ہوتی ہے۔

قرآن بعض اوقات اس طرح کی بات کرتا ہے کہ جیسے ایک درماندہ اور انحطاط پذیر تہذیب اور اس کے بعد آنے والی تہذیب کے درمیان ایک لازمی عدم تسلسل ہوتا ہے۔ اکثر ایک گرتی ہوئی تہذیب کے لیے کسی فوری اور بنے بنائے تواتر اور جانشینی کا یقین نہیں دلایا جا سکتا۔ خدا بجائے اس کے کہ ایک انحطاط پذیر اور دوسری توانا تہذیب کو ساتھ ساتھ زندہ رکھنا پسند کرے وہ سلیٹ کو صاف کر دیتا ہے اور اس پر ایک نئی چیز کی ابتدا کر دیتا ہے۔ قرآن یقیناً مستقبل کے لیے پرامید دکھائی دیتا ہے جبکہ ماضی کے بارے میں وہ رنجیدہ اور دل گیر لگتا ہے۔" جب ایک جماعت (جہنم میں) داخل ہو گی تو وہ اپنی ہم زاد پر لعنت بھیجے گی" کہ اس نے آنے والی نسلوں کے لیے بری مثال قائم کی۔ (الاعراف ۷:۳۸) یہ جملہ کہ "پھر ہم نے ان کے بعد نئی امت پیدا کر دی" قرآن میں بار بار آتا ہے (الانعام ۶:۶، المومنون ۲۳:۳۱، ۴۲، القصص ۲۸:۴۳) اسی طرح یہ کہ "ہم نے زمین کی وراثت دے دی" نئے اور زیادہ مستحق لوگوں کو! (الانبیاء ۲۱:۱۰۵، الاحزاب ۳۳:۲۷، القصص ۲۸:۵، الاعراف ۷:۱۲۸، ۱۳۷، الزمر ۳۹:۴۷، الدخان ۴۴:۲۸)

زمین کا اصل اور حقیقی وارث تو خدا ہے لیکن وہ ان قوموں کو جو اس قابل ہوتی ہیں اس کا انتظام چلانے کے لیے مقرر کر دیتا ہے (الحجر ۱۵:۲۳، مریم ۱۹:۴۰، آل عمران ۳:۱۸۰، الحدید ۵۷:۱۰) بعد میں آنے والی تہذیبوں اور ان کی علم بردار امتوں کے لیے یہ بات بہت ضروری ہوتی

ہے کہ وہ ان قوموں کا جو پہلے تباہ ہو چکی ہیں، غور سے مطالعہ کریں اور ان کی مثال سے عبرت حاصل کریں اس لیے کہ خدا کی سنت کسی کے لیے بھی تبدیل نہیں ہوتی- یہ قرآن میں غالباً سب سے زیادہ اصرار کرنے والی تجویز ہے، جو لوگوں کو برابر اس امر پر اکساتی ہے کہ وہ زمین پر چل کے مشاہدہ کریں اور ان لوگوں کا انجام دیکھیں جو ان سے پہلے گزر چکے- (آل عمران ۳:۱۳۷، الانعام ۶:۱۱، الاعراف ۷:۸۴، ۸۶، ۱۰۳، ۱۲۸، یونس ۱۰:۳۹، ۷۳، یوسف ۱۲:۱۰۹، النحل ۱۶:۳۶، النمل ۲۷:۱۴، ۵۱، ۶۹، القصص ۲۸:۴۰، ۸۳، الروم ۳۰:۹، ۴۲، الفاطر ۳۵: ۴۴ الصافات ۳۷:۷۳، المومن ۴۰:۲۱، الزخرف ۴۳:۲۵)

وہ لوگ جو باکمال اور حسن سیرت کے مالک ہیں اور اس کے ساتھ دوسروں کو اخلاقی خودکشی کرنے سے باز رکھتے ہیں، انہیں یقیناً خدا بچالے گا- یہ یقین کہ عملی (نہ کہ بے عمل) نیکی بالآخر ضرور کامیاب ہوگی- یہ قرآن کے اخلاقی نقطہ نظر کی بنیاد ہے- ہم جب رسالت پر بات کریں گے تو اس نکتے کو کھول کر بیان کریں گے لیکن یہاں ہم متعدد قرآنی آیات کا حوالہ دے سکتے ہیں جن میں ''ہم نے بچایا'' یا ''ہم بچائیں گے'' استعمال ہوا ہے-

لیکن ''نجات'' یا ''کامیابی'' کا کوئی تعلق ''باقی ماندہ'' کے اس یہودی عقیدے سے نہیں ہے جو عہد نامہ قدیم میں بیان ہوا- سامی مذہبی صحیفوں میں بیان کیے گئے سابق حالات کو کھینچ تان کر قرآنی تصورات پر منطبق کرنے سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے- چنانچہ یہ ظاہر کرنے کے شوق میں کہ قرآن ''باقی رہ جانے والوں'' کے یہودی عقیدے کو تسلیم کرتا ہے (ہم اس باب میں اس عقیدے کی تکذیب میں پہلے ہی قرآنی شہادت پیش کر چکے ہیں) جاہن وانسبر واپنی کتاب Quranic Studies کے صفحہ ۴ پر بعض ان قرآنی آیات کا حوالہ دیتا ہے جن میں بقیہ، باقیہ اور باقیوں کے الفاظ آئے ہیں (اگرچہ اس بات سے قطع نظر کہ یہ آخری لفظ قرآن میں کبھی نہیں آیا، یہ گرامر کے لحاظ سے بھی غلط ہے اور یہ باقون ہونا چاہیے) جن کا مطلب اس کے نزدیک عہد نامہ قدیم کے مفہوم میں باقی ماندہ (remnant) ہے-

اس بیان میں کوئی سچائی نہیں ہے- پورے قرآن میں اس طرح کی صرف ایک آیت ہے ''ہم نے اسی کی (نوح کی) نسل کو باقی رکھا'' (الصافات ۳۷:۷۷) لیکن وہاں بھی اس سے مراد نوح علیہ السلام کی جسمانی اولاد نہیں ہے بلکہ ان کی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہیں (جب کہ ہمیں سورہ ھود کی آیت ۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بیٹا طوفان سے نہیں بچایا گیا تھا اس لیے کہ

خدا نے نوح علیہ السلام سے کہا: وہ تمہارے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ ایک ناشائستہ عمل ہے) اس کے علاوہ ب ق ی کے مادہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے معنی "باقی رہ جانے والوں" کے ہوں- سورہ الشعراء ۲۶ کی آیت ۱۲۰ میں فعل معروف کا جمع کا صیغہ مفعولی صورت میں استعمال کیا گیا ہے، جو اسی نوح علیہ السلام کی قوم کا حوالہ دیتا ہے لیکن اس کا مطلب "بچ جانے والے بقیہ لوگ" نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ باقی رہ جانے والے جنہیں غرق کر دیا گیا- "باقیات" سے مراد وہ اچھے اعمال ہیں جو عمل کرنے والے کے بعد باقی رہتے ہیں (الکہف ۱۸:۴۶، مریم ۱۹:۷۶) جبکہ "باقیہ" جو واحد کے صیغے میں ہے اس کا مطلب ہے: "ابراہیم کی وہ تعلیم جو اس کی اولاد میں باقی رہ گئی" (الزخرف ۴۳:۲۸) یا کوئی بھی چیز جو باقی رہ جائے (الحاقہ ۶۹:۸) جہاں تک بقیہ کا تعلق ہے تو اس کے تین استعمالات میں سے (البقرہ ۲:۲۴۸، ہود ۸۶، ۱۱۶) کسی کے معنی بھی باقی رہ جانے والے کے نہیں ہیں اور ان تینوں میں سے جو آخری ہے جس کا وانز برو بطور یہودی ماقی (remnant) کے حوالہ دیتا ہے اور جس کا ہم نے ترجمہ کیا ہے "وہ لوگ جو باکمال اور حسن سیرت کے مالک تھے" وہ بالکل لغو بن جائے گا اگر اس کا ترجمہ "ماقی" کے طور پر کیا جائے- "خیال میں لاؤ وہ لوگ جن کے پاس "ماقی" (remnant) ہے" "ماقی کے پورے نظریئے کو ہی قرآن یہ کہہ کر ختم کر دیتا ہے کہ مسلمان اگر خدا کے مقصد کے لیے کوشش اور جدوجہد نہیں کریں گے تو وہ ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا، اور موجودہ لوگ اس کے منصوبے کی تکمیل کے لیے ناگزیر نہیں ہوں گے-

اسی طرح کا معاملہ اس نظریئے کا بھی ہے جسے قرآن کا "انتخابی نظریہ" کہا جاتا ہے جس پر وانس برو اور دوسرے لوگ زور دیتے ہیں- "الوہی انصاف میں یہاں کچھ تخفیف کر دی گئی ہے جو ایک طرح سے انجیل کی انتخابی روایت کا پرتو ہے (Quranic Studies صفحہ ۴) ہم پچھلے باب میں قرآن کے نیچرلسٹ اور غیر نیچرلسٹ (مذہبی) طرز اظہار اور ان کے باہمی تعامل کے بارے میں اتنا کچھ کہہ چکے ہیں کہ اس کے تکرار کی یہاں ضرورت محسوس نہیں ہوتی- خدا کی عنایات ایک شخص پر یا یوں کہیے کہ ایک شہر پر یا خدا کا کسی شخص کو یا کسی قوم کو منتخب کرنا، ان سب کو نیچرل اسباب کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے، اور قرآن انہیں انہی معنوں میں بیان کرتا ہے- یقیناً قرآن میں ایسا انتخاب کوئی نہیں جو ناقابل تغیر ہو- جب خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ وہ انہیں لوگوں کا امام بنانے لگا ہے (چاہے خدا نے انہیں منتخب کیا تھا یا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے

اعمال سے خود اس کا استحقاق پیدا کیا تھا جن میں ان کا اپنے بیٹے کی قربانی پر آمادہ ہونا بھی تھا) اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی تقدیر کے بارے میں سوال کیا تھا تو خدا کا جواب تھا "میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں ہوگا" (البقرہ ۲:۱۲۴) پھر قرآن نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے کہ اس نے کیوں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر چنا، وہ نیچر لسٹ انداز کا ہے (الانعام ۶:۱۲۴) جبکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ "کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟" (الزخرف ۴۳:۳۲) قرآن حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان سے بھی آگے تک (الانعام ۶:۸۳-۸۶) سترہ انجیلی شخصیات کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے "ہم نے ان کو فضیلت بخشی اور صحیح راستے کی طرف ان کی راہنمائی کی" (الانعام ۶:۸۷) لیکن اگلی ہی آیت میں صاف صاف کہہ دیا گیا کہ "اگر وہ لوگ شرک کا ارتکاب کرتے تو جو عمل انہوں نے کیے تھے سب ضائع ہو جاتے" اس شہادت اور اسی طرح کی دوسری شہادتوں کے ہوتے ہوئے خدا کا کسی کو "چن لینا" کیا معنی رکھتا ہے؟

درحقیقت "چن لینا" یا "منتخب کر لینا" قرآن کے نزدیک قدرتی سلسلہ عمل کا دوسرا نام یا مختلف طرز بیان ہے۔ پچھلے باب میں ہم نے قرآن میں اس اصطلاح کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ طرز اظہار قوموں کے زوال اور انحطاط کے بارے میں قرآن کے بیانات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ عمل کے ایک ہزار اور ایک خاص اسباب ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی سبب یقیناً کچھ لوگوں کی اخلاقی بے راہ روی اور کچھ دوسرے لوگوں کی اخلاقی بے حسی ہے جو تقویٰ یا گہرے اخلاقی احساس اور تحریک کا بالکل الٹ ہے۔ عام طور پر انسان امن، خوشحالی اور قوت کو اپنے اختیار میں رکھنے کا اہل دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی نہ کوئی چیز اسے فساد فی الارض کی کسی صورت کا ارتکاب کرنے پر ابھارتی ہے اور وہ ان تینوں نعمتوں کو کھو دیتا ہے جو درحقیقت اس کی تمناؤں کا سب سے اعلیٰ مقصود اور خدا کی بے بہا عنایات کا مظہر ہیں "بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوشحالی عطا کی یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کی عمریں بسر ہو گئیں" (الانبیاء ۲۱:۴۴، اسی طرح الفرقان ۲۵:۱۸، الزخرف ۴۳:۲۹) امن، خوشحالی اور قوت کی تلاش میں بے راہ رویوں کی وجہ سے جو اخلاقی بیماریاں پیدا ہوئیں اور ان کے نتیجے میں جو زوال اور تباہی آئی ان کو "امر اللہ" (خدا کا حکم) بھی کہا گیا ہے۔ "جب ہم کسی بستی کو (یعنی تہذیب کو) ہلاک کرنا چاہتے ہیں، تو ہم اس کے آسودہ حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں فسق و فجور پھیلاتے ہیں، اور جب اس بستی پر فیصلے کا وقت آ جاتا ہے تو ہم اسے پوری طرح تباہ کر ڈالتے ہیں۔" (بنی اسرائیل ۱۷:۱۶)

جب ایک قوم برے اور منفی راستوں پر پڑ جاتی ہے اور دیکھنے اور سمجھنے کی اہلیت کھو بیٹھتی ہے اور اسی لیے صحیح فیصلے نہیں کر سکتی، تو یہ اپنے مقاصد اور ہدف متعین نہیں کر سکتی اور ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ اس نازک مرحلے میں خدا ایک پیغمبر بھیجتا ہے جو اس قوم کے افراد کو سچائی اور نیکی طرف بلاتا ہے جسے وہ نہیں پہچان پاتے اور اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا جو پیغام ہے وہ انہیں مصیبت میں ڈال دیتا ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ انہیں خدشہ ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ خاص کر وہ جنہیں عیش و آرام کی زندگی کے ذرائع میسر نہیں ہوتے اسے قبول کر لیں گے۔ چنانچہ وہ اس کے مقابلے میں مزاحمت کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ ایسی ایسی چالوں اور طریقوں سے کام لیتے ہیں جنہیں قرآن 'مکر' کہتا ہے جو ایسی چال کو ظاہر کرتا ہے جو کشمکش کے عمل میں اختیار کی جائے ''اور اس طرح ہم نے ہر بستی (معاشرے یا تہذیب میں) بڑے بڑے مجرم پیدا کیے کہ وہ اس میں مکاریاں کرتے پھریں۔ لیکن وہ جو مکاریاں کرتے ہیں ان کا نقصان انہی کو ہوتا ہے مگر وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (الانعام ۶:۱۲۴) اور ان کی یہ کوششیں کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچاتیں، اس لیے کہ خدا سب سے اچھا چال چلنے والا ہے'' (آل عمران ۳:۵۴، الانفال ۸:۳۰، یونس ۱۰:۲۱، النمل ۲۷:۵۰) ''اگرچہ ان کی چالیں ایسی غضب کی ہوتی ہیں کہ پہاڑوں کو بھی ہلا دیں'' (ابراہیم ۱۴:۴۶)

تو پھر اصلی چال کیا ہے؟ اصلی چال یہ ہے کہ دیکھنے بھالنے اور صحیح فیصلہ کرنے کی قوت کو مرنے نہ دیا جائے اور اخلاقی ذمہ داری (تقویٰ) کے احساس کی شدت کو زندہ رکھا جائے۔ یہی مقصد ہے گزری ہوئی قوموں کی تقدیر کا مطالعہ کرنے کا:

> ''کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے ان کو تباہ کر ڈالا کہ وہ نافرمان تھیں۔ سو وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں، ان کے کنویں بیکار ہو گئے ہیں اور بلند و بالا قصر کھنڈر بنے پڑے ہیں۔ کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کے نہیں دیکھا تا کہ ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان سے وہ سمجھ سکتے اور ان کے کان ایسے ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔ اس لیے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں۔'' (الحج ۲۲:۴۵،۴۶)

معلومات کے طبیعی ذرائع بالکل ٹھیک رہیں، بلکہ وہ بہت زیادہ بہتر ہو جائیں لیکن "دل" جو دیکھنے بھالنے اور احساس کرنے کا آلہ ہے وہ کند ہو جاتا ہے۔ کمپیوٹروں میں داخل کیا جانے والا ڈیٹا اور ان سے باہر نکلنے والا ڈیٹا اپنے عمل میں لگا رہتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی کارکردگی میں زیادہ تیز ہو جاتا ہے، صرف یہ ہے کہ صحیح سوالات، انسانوں سے متعلق سوالات پوچھنے کی صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ جب ایک قوم پر زوال آ جاتا ہے اور اس کی تہذیب درماندہ ہو جاتی ہے تو وہ اس زمین پر جہاں سے وہ کبھی بڑے خوشنما وعدوں کے ساتھ نمو پذیر ہوئی تھی، ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ یہ مختلف تدبیریں اختیار کر کے اپنی زندگی کا زمانہ قدرے طویل کر سکتی ہے۔ لیکن ان کا منظر سے ہٹ جانا ناگزیر ہوتا ہے "اس لیے کہ کوئی بھی خدا کو عاجز نہیں کر سکتا" (الانفال ۸:۵۹، الحج ۲۲:۵۱، سبا ۳۴:۵، ۳۸، التوبہ ۹:۲، ۳، الانعام ۶:۱۳۴، یونس ۱۰:۵۳، ھود ۱۱:۲۰) یہ فینا مینا جو ایک طرح کی ناگزیریت لیے ہوئے ہے (اگر ہم قرآن سے اندازہ لگائیں) مجموعی طور پر اچھا ہے، اگرچہ اس سے انسانیت کو کچھ نقصان پہنچتا ہے اس لیے کہ یہ کوشش اور جدوجہد ایسی ہے جو ایک عمر رسیدہ انسانیت کی رگوں میں تازہ خون دوڑا دیتی ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے ایک مردہ زمین زندہ ہو اٹھی ہو اور پھر سے پھل پھول لانے لگے۔ اچھے اور برے، تازہ اور باسی، جدید اور بوسیدہ کے درمیان نیز شباب کی تازگی اور قوت اور کہن سالی کے خلل دماغ کے درمیان جو کشمکش واقع ہوتی ہے وہ اپنے اندر مثبت فائدہ رکھتی ہے، اس وجہ سے کہ یہ دوامی اخلاقی قدروں کو زندہ رکھتی ہے:

> "اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعے، عیسائیوں کے گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں، جن میں خدا کا بہت ذکر کیا جاتا ہے، گرائی جا چکی ہوتیں۔ لیکن جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد ضرور کرے گا اور خدا توانا اور غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے اور تمام امور کا انجام تو خدا کے ہی اختیار میں ہے (مطلب یہ کہ اس کا حکم بالاخر کامیاب ہو کے رہتا ہے) الحج ۲۲:۴۰-۴۱)

یہ آیات اس موقع کی ہیں جب مسلمانوں کے عرب کفار کے خلاف جہاد کرنے کا پہلا اعلان کیا گیا- اسی طرح دیکھیے سورہ البقرہ ۲، آیت ۲۵۱-

؎ اوپر جو کہا گیا اس سے یہ نہ گمان کرنا چاہیے کہ دولت اور اس کا کمانا بذات خود بری چیز ہے- ہم یہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور اب اس پر مزید زور دینے کی ضرورت ہے- جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ انسان دولت حاصل کرنے کی جستجو کیسے کرتا ہے اور اسے قبضے میں کیسے رکھتا ہے- ہم سورہ الروم کی آیت ۷ اور سورہ النجم کی آیت ۳۰ کا اس مقصد سے حوالہ دے چکے ہیں کہ مکہ کے تاجر "زندگی کی ظاہری باتوں کو بہت اچھی طرح جانتے تھے" لیکن اس کے مقاصد کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی اور یہ "ان کے علم کی انتہا تھی"- درحقیقت قرآن زور دے کر کہتا ہے کہ جب ایک معاشرہ اخلاقی طور پر زوال پذیر ہو جاتا ہے تو اس کی خوش اقبالی بھی اس کو چھوڑ جاتی ہے اور جتنی دیر وہ خدا کے پیغام کا گہرا ادراک برقرار رکھتا ہے وہ ترقی کرتا ہے "جو بھی میری نصیحت سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے-" (طٰہٰ ۲۰:۱۲۴) پھر قرآن کہتا ہے:

> "اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل اور جو کچھ بھی ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوا ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا) وہ اپنے اوپر سے بھی اور پاؤں کے نیچے سے بھی کھاتے-" (المائدہ ۵:۶۴-۶۶)
>
> "اور اگر بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے-" (الاعراف ۷:۹۶)

تہذیبوں کے ارتقاء اور تسلسل پر بات کرتے ہوئے ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ اگرچہ قرآن تہذیبوں کے عدم تسلسل کی بات کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں لوگوں کی بالکل "نئی نسل" کے ساتھ ایک نیا آغاز کرنے کی بات، تاہم یہ مجموعی طور پر مستقبل کے بارے میں پرامید ہی رہتا ہے، اس لیے کہ "زمین کی وراثت اچھے لوگوں کے سپرد کی جاتی ہے-" تہذیبیں اپنے بعد والوں کے لیے جو ترکہ چھوڑ جاتی ہیں ان کے بارے میں بھی کچھ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے- یہاں پھر دو مخالف

سمتوں میں ایک کشمکش دیکھنے میں آتی ہے۔ایک طرف تو تہذیبوں کی تاریخ متواتر اضافوں کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے اور ارتقائی ہوتی ہے، اس لیے کہ "جب اوپر کا جھاگ زائل ہو جاتا ہے تو جو چیز انسانوں کے لیے فائدہ مند ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے" (الرعد ۱۳: ۱۷) اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں لوگوں کے کردار کا منفی پہلو جاتا رہتا ہے، اس کا تعمیری پہلو نوع انسانی کے لیے ایک مثبت ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔دوسری طرف پہلے لوگوں کی بری میراثیں بعد میں آنے والے لوگوں کی کارکردگی کے معیار کو ضرور متاثر کرتی ہیں۔ایک لحاظ سے ہر پہلی تہذیب بعد کی تہذیبوں کا یا تو پیش خیمہ ہوتی ہے یا ان کے لیے ایک مثال، اسی لیے مستقبل کی تہذیبوں پر ایک بڑی ذمہ داری آ پڑتی ہے۔یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا یہ اثر اس وجہ سے ہوتا ہے کہ بعد کی تہذیبیں پہلی تہذیبوں سے واقعی کچھ سیکھتی ہیں، اور ان کے احمقانہ اعمال سے بلند تر ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔یا یہ کہ ان کی چھوڑی ہوئی باتیں بعد کی تہذیبوں کے لاشعور میں جڑ پکڑ لیتی ہیں اور گویا کہ ان کے اخلاقی کونیوں (Genes) کا حصہ بن جاتی ہیں۔ان حالات میں یہ اثر متواتر بڑھتا رہتا ہے اور پوری تاریخی حرکت ایک مرغولے (spiral) جیسی ہوتی ہے نہ کہ ایک دائرے کی سی۔قرآن یہ ضرور بتاتا ہے کہ بعد کو آنے والی امتیں اپنے سے پہلے آنے والے لوگوں پر یہ الزام لگائیں گی کہ اُن کا ان پر برا اثر پڑا تھا:

> "جب بھی ایک امت وہاں (جہنم میں) داخل ہوگی، وہ اپنی جیسی دوسری امت پر لعنت بھیجے گی۔اور جب وہ سب اس میں داخل ہو جائیں گے تو بعد کی جماعت پہلی کے متعلق کہے گی۔اے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس ان کو آتش جہنم کا دہرا عذاب دے۔خدا کہے گا، تم سب کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔" (الاعراف ۷: ۳۸، اسی طرح دیکھئے ص ۳۸: ۵۹)

انسانیت کا ایک حصہ جو دوسروں پر اپنی مثال کے ذریعے دباؤ ڈال کر یا تعلیم کی راہ سے اثر انداز ہوتا ہے، وہ قرآن میں بار بار چھیڑا جانے والا موضوع ہے۔اس لیے کہ وہ لوگ جو دوسروں کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں، انہیں تعلیم دیتے ہیں اور انہیں بناتے یا بگاڑتے ہیں، وہ ان کے رویے کے بارے میں راست انداز میں جواب دہ ہوتے ہیں "اور کافر کہیں گے اے ہمارے رب ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تاکہ ہم انہیں اپنے پاؤں

تلے روند ڈالیں، اور وہ (جہنم کے باسیوں میں) سب سے نچلے درجے والے بن جائیں" (حم السجدہ ۴۱:۲۹) یہ اسی پس منظر میں ہے کہ اس طرح کی بکثرت استعمال ہونے والی قرآنی اصطلاحیں جیسے کہ "ہدایت"، "صحیح راہنمائی"، "سچائی"، "صحیح طریقہ"، "سیدھا راستہ"-- ان کے اندر ان کی پوری اہمیت سمٹ آتی ہے- انسان کی پوری تقدیر، کہ وہ کامیاب ہوگا یا برباد ہو جائے گا، اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ صحیح راستہ اختیار کرسکتا ہے اور کرتا ہے، ایک ایسی بات جسے بہت سے لوگ بہت غیر سنجیدگی سے لیتے ہیں جیسے کہ اس سے انسانیت کے مستقبل پر کوئی فرق نہ پڑتا ہو-

ایک خاص طور پر بار بار چھیڑے جانے والا موضوع یہ ہے کہ طاقتور عناصر ہمیشہ کمزور عناصر کو متاثر کرنے یا ان پر یہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک خاص طرح کا رویہ اختیار کریں، جو خود ان کے اپنے بہتر فیصلے کے خلاف ہو- اس موضوع کی ابتدا بے شک مکہ کے معاشرے سے ہوئی، جہاں عام طور پر (لیکن ہمیشہ نہیں، دیکھئے ضمیمہ دوم) آنحضرت کا ساتھ دینے والے معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور لوگ تھے، جن پر اونچے طبقوں (الملاء) کی طرف سے برابر یہ دباؤ رہتا تھا کہ وہ پیغمبر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں-

> "اور جو کافر ہیں وہ مومنوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے راستے پر چلو، ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے- حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بھی بوجھ اٹھانے والے نہیں ہیں- وہ بالکل جھوٹے ہیں، یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی اٹھائیں گے (کہ انہوں نے معاشرے کے کمزور افراد کو بھی فریب دیا)" (العنکبوت ۲۹:۱۳، نیز الاعراف ۷:۷۵)

قرآن ان الزامات کا پوری صفائی سے نقشہ کھینچتا ہے جو قیامت کے روز کمزور قومیں طاقتور اور موثر قوموں کے خلاف لگائیں گی:

> "وہ جو کمزور ہیں وہ ان لوگوں سے جنہیں انہوں نے بڑا سمجھا تھا کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہو جاتے، تو جن لوگوں نے اپنے آپ کو بڑا سمجھا تھا ان لوگوں سے جنہیں انہوں نے کمزور سمجھا تھا کہیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت سے جب کہ وہ تمہارے پاس آچکی تھی . روکا تھا؟ بلکہ

تم خود ہی مجرم تھے تو کمزور لوگ طاقتور لوگوں سے کہیں گے کہ یہ تمہاری
رات دن کی چالیں تھیں (جنہوں نے ہمیں ایمان لانے سے باز رکھا)
جب تم نے ہمیشہ ہمیں ایمان نہ لانے کا حکم دیا۔'' (سبا ۳۴: ۳۱-۳۳)

مذہبی راہنماؤں کی بدعنوانی اور بگاڑ، جن سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ روحانی قوت اور تخلیق نو کا سرچشمہ ہوں گے، ایک امت کے زوال کی طرف آخری قدم ہوتا ہے۔ ان کا اخلاقی بگاڑ جو قدرتی راستہ اختیار کرتا ہے وہ ضمیر کی وہ کمزوری ہے جس سے وہ امراء یا معاشرے کی سرپھری خواہشات کے ساتھ سچائی کا سودا کر لیتے ہیں۔ کسی بھی حالت میں وہ پہلے تو دباؤ کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں اور اس کے بعد ان کے ضمیر کمزور ہونے لگتے ہیں اور وہ دولت یا شہرت یا دونوں کے ساتھ مفاہمت کر لیتے ہیں۔ ہم ان آیات کا حوالہ دے آئے ہیں جن کے مطابق مذہبی راہنما غلط کار امت کو صحیح ہدایت اس لیے نہیں دیتے کہ وہ غیر ہردلعزیز ہو جائیں گے۔ قرآن اکثر یہودی مذہبی راہنماؤں اور کبھی کبھی عیسائی راہنماؤں پر اخلاقی بگاڑ کا الزام لگاتا ہے۔ یہودی ربانیوں اور احبار کے خلاف عام الزام یہ ہے کہ وہ ''خدا کی آیات کو معمولی قیمت پر بیچ دیتے ہیں'' (البقرہ ۲: ۴۱، ۷۹، ۱۷۴، آل عمران ۳: ۷۷، ۱۸۷، النحل ۱۶: ۹۵)

''پھر ان کے (یعنی قدیم یہودیوں) کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے، جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے معمولی فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاع دنیا پھر ان کے سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔''
(الاعراف ۷: ۱۶۹)

آگے قرآن کہتا ہے:

''اے وہ جو ایمان لائے، بہت سے یہودی علماء اور عیسائی درویشوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگوں کے اموال غلط طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔'' (التوبہ ۹: ۳۴)

قرآن کو اس پر اصرار ہے کہ ہر امت یا قوم وہی کچھ حاصل کرتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ اپنے ان اعمال کی بنا پر جو "ان کے ہاتھوں نے کمائے ہوتے ہیں"۔ "اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے، اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو" (النساء۴:۱۴۷) "تمہارا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں (یعنی تہذیبوں اور امتوں) کو جبکہ وہاں کے باشندے اصلاح پسند ہوں ازراہ ظلم تباہ کر دے" (ھود۱۱:۱۱۷، اسی طرح دیکھئے الانعام ۶:۱۳۲) خدا اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ ان غیر متبدل قوانین کو عمل میں لاتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال کا سبب بنتے ہیں۔ "خدا اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے" (الرعد۱۳:۱۱، الانفال ۸:۵۳) یہ بات مذہبی اعتبار سے صحیح ہے کہ ہر چیز کو وجود میں لانے والا خدا ہے، اس لیے کہ خدا ہی اس تمام عالم فطرت میں اضافی بُعد ہے۔ لیکن ایک عام محاورے میں یہ کہنا بجا ہے کہ انسان ہی اپنے ساتھ اور اپنی خاطر ہر چیز کرتا ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہے۔

اسی پس منظر میں مسلم امت کو وجود میں لایا گیا جس کی، ہجرت کے اٹھارہ مہینے بعد، رسمی طور پر مدینے میں داغ بیل ڈالی گئی اور جہاد کی اجازت کا اعلان کیا گیا۔

> "اور خدا کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چن لیا ہے اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی۔ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر قائم ہو جاؤ۔ اللہ نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی! تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کا دامن پکڑ لو، جو تمہارا مولا ہے۔ وہ بہت ہی اچھا مولا ہے اور بہت ہی اچھا مددگار!" (الحج ۲۲:۷۸)

تقریباً اسی موقع پر قرآن کہتا ہے "اور اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا (یعنی یہودیت کی غیر اثر پذیری اور عیسائیت کے دیوالیہ پن کے درمیان کی امت) تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر تم پر گواہ بنیں" (البقرہ۲:۱۴۳) مسلم امت کی تعریف اس طرح کی گئی کہ "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔" (آل عمران۳:۱۱۰، اسی طرح آیت ۱۰۴) اور ان کا منصب یہ تھا کہ وہ ایسے ہوں کہ "اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھے کاموں کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے۔" (الحج ۲۲:۴۱) قرآن نے

اس امر کی بھی وضاحت کی کہ "نماز" سے اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ انسان کعبے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جائے اور جسم اور زبان کے ساتھ کچھ حرکات اور اشارے کر دے۔ اگرچہ نماز یقیناً ایک مسلمان کے بنیادی فرائض میں شامل ہے، وہ اسلام کے مجموعی مقصد اور منشا کے بغیر ایک مذاق بن کر رہ جاتی ہے۔

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر اور خدا کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لے آئے اور اپنا مال باوجود اسے عزیز رکھنے کے، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جو جب عہد کرتے ہیں تو اسے وفا کرتے ہیں اور جو تنگی اور مصیبت کے وقت اور معرکہ کارزار میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ یہی لوگ (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں" (البقرہ ۲:۱۷۷)

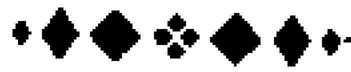
مسلم امت کے فریضے کی نوعیت متعین کرتے ہوئے "امر بالمعروف' نہی عن المنکر، نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی' کے الفاظ بار بار آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ مسلمان اس زمین پر ایک ایسا سیاسی نظام قائم کریں جس کا مقصد انسانی مساوات پر قائم ایک عادلانہ اخلاقی معاشرتی نظام وجود میں لانا ہو۔ اسی طرح کا نظام، اپنی تعریف کی روشنی میں، فساد فی الارض کا قلع قمع کر دے اور اس کرہ ارضی میں اصلاح لے آئے۔ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے، جس کی سب لوگ جن کی نگاہ نہ تو محدود ہے اور نہ مڑی تڑی ہے کم از کم زبانی طور پر تائید کرتے ہیں، قرآن نے جہاد کا وسیلہ سجھایا ہے بلکہ سورہ الحج کی آیت ۴۱ جس میں مسلم امت کا یہ فریضہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد وہ آیت آتی ہے جس میں پہلی بار قرآن میں جہاد کا اصول بیان ہوا ہے۔

قرآن کے سامنے یہ بات بھی تھی یا کم از کم اس نے اس کی طرف دعوت دی کہ ایک ہی طرح سوچنے والی امتوں کے درمیان تعاون ہونا چاہیے۔ "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں" (آل عمران ۳:۶۴)

یہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ یہ تجویز کہ ''ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں'' یہ اس مشترک پلیٹ فارم کا بیان ہے، نہ کہ اس فریضے کا بیان جو کہ زمین پر ادا کیا جاتا ہے- اور جس کی تفصیلات اس پلیٹ فارم سے یا 'ایک خدا کی بندگی' کے فارمولے سے نکل کر سامنے آتی ہیں- یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ یہ جو دعوت دی گئی ہے یہ ایک قسم کے اخلاقی اور معاشرتی دنیوی نظام کی تعمیر کرنے میں تعاون کے لیے ہے، اور یہ موجودہ دور کی صلح کل تحریک (ecumenism) کی کوئی شکل نہیں ہے- جس میں ہر مذہبی امت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ خوش خلقی کا سلوک کرے گی اور ''نجات'' کے لیے اپنا خاص نمونہ جہاں تک ممکن ہو گا دوسروں تک پہنچائے گی- اسلام میں کسی خاص ''نجات' ' کا تصور نہیں ہے- اس میں یا تو 'فلاح' ہے یا 'خسران' (ناکامی) ہے اس دنیوی نظام کی تعمیر کی راہ میں جو ہم بیان کر رہے ہیں- یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ صلح کل تحریک کی صورت میں بھی عیسائیت جس کے ہاں معاشرتی نظام کا کبھی کوئی تصور نہیں پایا گیا، ہمیشہ اپنے ہی انداز سے سوچتی ہے اور اعتراف باہمی کے تعلقات انہی حدود کے اندر رکھنا چاہتی ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے مسلک کے گرد واقع ہیں-

لیکن جب ہم ان معنوں میں جن میں ہم نے قرآن کو سمجھا ہے، انسان کی مذہبی اور معاشرتی جدوجہد کا تصور کرتے ہیں، تو جہاد ایک حتمی ضرورت بن جاتی ہے- یہ ذریعہ استعمال کیے بغیر اس طرح کا مثالی نظم دنیا میں کیسے وجود میں لایا جا سکتا ہے؟ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مغربی عیسائی پروپا گنڈا نے لوگوں میں یہ نعرہ پھیلا کے کہ ''اسلام ایک تلوار کا مذہب ہے'' اس سارے معاملے کو الجھا کر رکھ دیا ہے- تلوار کے ذریعے جو چیز پھیلی وہ اسلام کا مذہب نہیں تھا، بلکہ اسلام کی سیاسی عمل داری تھی، تاکہ اسلام دنیا میں وہ نظام قائم کرنے کے لیے کام کر سکے جو قرآن کا مقصد ہے- یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ بعد کے مسلمانوں نے جہاد کو اکثر غلط استعمال کیا، کہ ان کا مقصد اولین علاقائی توسیع تھا، نہ کہ وہ عقائد و نظریات جن کو رواج دینے کے لیے ان سے کہا گیا تھا- یہاں یہ بھی مان لینا چاہیے کہ جہاد کے ذرائع مختلف ہو سکتے ہیں- بلکہ مسلح جہاد تو صرف ایک صورت ہے -لیکن یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ ''اسلام تلوار کے زور پر پھیلایا گیا'' اسلامی تاریخ میں کوئی ایک متوازی مثال بھی مثلاً اس واقعے کی نہیں ملتی کہ شارلمان کے ہاتھوں جرمن قبائل کو مجموعی طور پر زبردستی عیسائی بنا دیا گیا، اور پہلے مذہب کی طرف واپس چلے جانے والوں کو بار بار عقوبتی مہمات کا نشانہ بنایا گیا- اگرچہ مقامی طور پر اور کبھی کبھی اس طرح کی تبدیلی مذہب کے اکادکا واقعات ضرور پیش آئے ہوں گے-

جہاد دراصل ایک مکمل کوشش ہے، ایک جامع جدوجہد "اپنے مال اور اپنی جانوں کے ساتھ" جیسا کہ قرآن عموماً کہتا ہے تا کہ اس سے "خدا کا مقصد پورا ہو" (التوبہ۹:۴۰) ہم باب ششم میں کھول کر بتائیں گے کہ اس کوشش کی نوعیت کیا ہے اور اس حکم کا منشا کیا ہے، اگرچہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا اس کوشش کے آخری مقصد (یعنی آخرت) کا تصور قرآنی فکر کے پورے نظام کے لیے محور کی طرح ہے۔ آخرت کے تصور کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو صرف معاشی مساوات درکار نہیں، بلکہ معاشی مساوات ایک بلند مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ انسان جانوروں کی طرح ایک گھڑی سے دوسری گھڑی تک نہیں جیتا، یا ایک دن سے دوسرے دن تک زندہ نہیں رہتا، بلکہ اسے اپنی بصیرت سے اپنے اعمال اور مقصد کے نتائج کے اندر جھانک کر دیکھنا ہوتا ہے جو دراصل معنی ہے مثبت انسانی کوشش کا۔ یہ ایسا مقصد ہے جو جہاد کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے کہ وہ بغیر انسان کی محنت اور کوشش کے اچھے نتائج سامنے نہیں لائے گا ورنہ وہ جو جدوجہد کرتے ہیں اور وہ جو جدوجہد نہیں کرتے ایک دوسرے سے ممیز نہیں کیے جا سکیں گے۔ (آل عمران ۳:۱۴۲، النساء ۴:۹۵، التوبہ ۹:۱۶، ۲۴، ۸۶، العنکبوت ۲۹:۱-۲، ۱۱، محمد ۴۷:۳۱)



باب چھارم

نیچر

قرآن کی تکوینیات (Cosmogony) مختصر ترین ہیں۔تخلیق کی مابعد الطبیعیات کے بارے میں قرآن بس اتنا کہتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے اندر خدا نے جو کچھ بھی تخلیق کرنا چاہا وہ اس کے اس حکم سے وجود میں آ گیا کہ "ہو جا" (البقرہ۲:۱۱۷، آل عمران۳:۴۷، ۵۹، الانعام۶:۷۳، النحل۱۶:۴۰، مریم۱۹:۳۵، یٰس۳۶:۸۲، المومن۴۰:۶۸) چنانچہ خدا اس کائنات کا تنہا مالک اور اس کا ایسا حاکم ہے جس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح وہ اس کا مہربان رب ہے۔اپنی اس غیر مشروط فرماں روائی کی وجہ سے جب خدا نے آسمانوں اور زمین کو وجود میں لانا چاہا تو اس نے ان سے کہا "دونوں ادھر آ ؤ، خوشی سے یا ناخوشی سے" (حم السجدہ۴۱:۱۱) اور صورت یہ ہے کہ جیسے ہم آگے چل کر زیادہ تفصیل میں دیکھیں گے ساری کائنات ایک "خود کار ارادے" کے ساتھ خدا کا حکم بجا لاتی ہے۔سوائے انسان کے جس کو یہ موقع میسر ہے کہ وہ چاہے تو حکم بجا لائے اور چاہے تو حکم عدولی کرے۔

اسی لیے قران تمام کائنات کو "مسلم" قرار دیتا ہے، اس لیے کہ اس میں ہر چیز نے (سوائے انسان کے جو "مسلم" ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی) اپنے آپ کو "خدا کے حکم کے تابع کر لیا ہے" (آل عمران۳:۸۳) اور ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے (الحدید۵۷:۱، الحشر۵۹:۱، الصف۶۱:۱، اسی طرح دیکھیے بنی اسرائیل۱۷:۴۴، النور۲۴:۴۱) اس کائنات کو ظہور میں لانے کے بارے میں قرآن میں جو واحد اشارہ ملتا ہے وہ یہ ہے "کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین (یعنی تمام فضائے بسیط) باہم ملے ہوئے تھے، تو ہم نے انہیں جدا جدا کر دیا" (الانبیاء۲۱:۳۰) کہا گیا

ہے کہ تخلیق کا یہ سارا سلسلہ عمل "چھ دن" میں پورا ہوا (الاعراف ۷:۵۴، یونس ۱۰:۳، ھود ۱۱:۷، الفرقان ۲۵:۵۹) جس کے بعد خدا عرش پر متمکن ہو گیا ((الاعراف ۷:۵۴، یونس ۱۰:۳ وغیرہ)

اپنے عرش سے خدا اس دنیا کے معاملات چلاتا ہے- وہ اپنے احکام فرشتوں کے اور روح کے ذریعے بھیجتا ہے اور یہ واپس اوپر جا کر اسے رپورٹ کرتے ہیں- قرآن اس دہری حرکت کا اکثر ذکر کرتا ہے (السجدہ ۳۲:۵، المعارج ۷۰:۴، سبا ۳۴:۲، الحدید ۵۷:۴، اسی طرح القدر ۹۷:۴) وقت قرآن کے لیے یقیناً اضافی چیز ہے جس کا انحصار تجربے کی نوعیت پر اور اس بات پر ہے کہ موضوع متعلق کے وجود کی صورت حال کیا ہے- سورہ السجدہ کی آیت ۵ میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے صعود کا ایک دن "زمینی" وقت کے ایک ہزار سال کے برابر ہے، جبکہ سورہ المعارج آیت ۴ میں یہ عرصہ عام تجربے کے پچاس ہزار سال کے برابر بتایا جاتا ہے[1]- یہ اکثر کہا گیا ہے (مثلاً البقرہ ۲:۲۵۹، بنی اسرائیل ۱۷:۵۲، طٰہٰ ۲۰:۱۰۴، نیز المومنون ۲۳:۱۱۲-۱۱۴) کہ قیامت کے روز گناہ گار یہ خیال کریں گے کہ اس دنیا میں انہوں نے جو وقت گزارا، یا روز قیامت تک جو وقت گزارا، وہ بس چند دن ہی تھے اور کچھ لوگ جو چند سال یا چند صدیاں سوئے رہنے کے بعد جاگے (جیسا کہ سورہ کہف میں "غار کے نوجوانوں" کے ساتھ ہوا) تو انہوں نے سمجھا کہ ان کی نیند، 'ایک گھنٹہ' یا 'ایک دن' یا اس کا کچھ حصہ رہی تھی- تاہم ان مشکل آیات کی مناسب تعبیر کی جانی چاہیے، عام وقت کے ایک ہزار یا پچاس ہزار سال کے ایک دن کے برابر ہونے کو یقیناً لفظی معنوں نہیں لینا چاہیے-

لیکن اگر قرآن تکوینیات کے بارے میں بہت کم بات کرتا ہے تو وہ کائنات اور کائناتی فینامینا کے بارے میں بار بار اور متواتر بیان دیتا ہے، اگرچہ ان بیانات میں کائنات کا تعلق ہمیشہ یا تو خدا سے جوڑا جاتا ہے یا انسان کے ساتھ یا پھر دونوں کے ساتھ! ایسی آیات میں اکثر خدا کی لامحدود طاقت اور جاہ و جلال کا ذکر ہوتا ہے اور انسان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لے آئے، یا وہ خدا کی بے پایاں رحمت کا اظہار کرتی ہیں اور انسان سے اس کا شکر گزار ہونے کو کہتی ہیں- ان دونوں

(1) نولدیکے اور بلاشیر (Blackere) کا خیال ہے کہ سورہ المعارج کی آیت ۴ بعد میں شامل کی گئی ہے- نولدیکے تو یہ تک کہتا ہے کہ یہ آیت "درحقیقت ایک حاشیہ لگتی ہے" اگر ان مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت بعد کے مسلمانوں نے قرآن میں شامل کی تھی، تو وہ یقیناً غلطی پر ہیں- رچرڈ بیل (The Quran، ایڈنبرا 1937) میں کہتا ہے: آیات ۴ اور ۵ ایک ایسا اضافہ ہیں جس کا مقصد اس واقعے کے ظہور میں ہونے والی تاخیر کی مشکل کو دور کرنا ہے- جو آیت ا میں مذکور "پیش آنے والے عذاب" سے متعلق ہے- اور جس کی بقول بیل سورہ الطور آیت ۷،۸ میں وعید سنائی گئی ہے- بیل کا نظریہ اس مفروضے پر قائم ہے (جسے میں غلط سمجھتا ہوں) کہ آیت ا میں اس عذاب کا ذکر کیا گیا ہے جو اہل مکہ کو اس زمین پر دیا جانا تھا نہ کہ روز آخرت میں جہنم کا عذاب! جس کا آیات ۱۵-۱۸ میں واضح طور پر ذکر آیا ہے- اس لیے اس امر کی کوئی یقینی شہادت نہیں ہے کہ آیت ۴ بعد کا اضافہ ہے-

حالتوں میں کائنات کی وسعت اور جسامت اور انسان کے لیے اس کی منفعت اور اس کے ساتھ نیچرل فینامینا کے استحکام اور باقاعدگی پر زور دیا جاتا ہے۔ اگر تم بیج بو دو اور پودے کی نگہداشت کرو تو تم فصل کاشت کرنے کی امید رکھ سکتے ہو، ورنہ نہیں۔ اگر تم ایک جہاز بنا لو اور اسے سمندر میں ڈال دو اور ہوائیں بھی موافق ہوں تو تم ایک فائدہ مند تجارت کی توقع کر سکتے ہو، ورنہ نہیں۔ چنانچہ قدرتی اسباب کا عمل ناگزیر ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم قدرتی سلسلہ تسبیب (causation) کے ساتھ ساتھ ایک اور حتمی سلسلہ تسبیب بھی ہے، جو قدرتی سلسلہ ہائے عمل کو ان کی مکمل صورت میں، ایک ایسی اہمیت اور معقولیت و معنویت عطا کرتا ہے جو یہ قدرتی سلسلہ ہائے عمل اگر الگ سے دیکھے جائیں تو ان میں وہ بات نہیں پائی جاتی۔ حتمی اور اعلیٰ تسبیب، قدرتی تسبیب کا نہ تو منفی ہے اور نہ یہ اس پر اضافہ ہے۔ یہ اسی کے اندر کام کرتی ہے اور اگر اسے مختلف سطح سے دیکھا جائے اور اس میں صحیح معنی داخل کیے جائیں تو یہ اس سے ہو بہو ملتی ہے۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے قرآن قدرتی تسبیب کی زبان اور الوہی تسبیب کی یا مذہبی زبان مختلف سیاق و سباق میں استعمال کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ مختلف مقاصد کو واضح طور پر سامنے رکھتا ہے۔

خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان سب سے بنیادی تفاوت یہ ہے کہ جہاں خدا لا نہایت اور مطلق ہے، مخلوق چاہے کوئی بھی ہو محدود ہے۔ تمام چیزوں کے امکانات ہوتے ہیں لیکن امکانات چاہے کتنے ہی ہوں وہ کسی محدود شے کو اپنی حدود سے تجاوز کر کے لامحدود اور لا نہایت نہیں بنا سکتے۔ قرآن کا یہی مطلب ہوتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ خدا کے سوا تمام چیزوں کی ایک قدر مقرر ہے۔ اس لیے اس کا خدا پر انحصار ہے اور جب بھی کوئی مخلوق پوری طرح خود مکتفی ہونے یا آزاد ہونے (استغناء، استکبار) کا دعویٰ کرتی ہے تو یہ دراصل لامتناہیت کا اور خدا کے ساتھ شریک ہونے کا دعویٰ کر رہی ہوتی ہے۔ جب خدا کسی چیز کو پیدا کرتا ہے تو وہ اس کے اندر اس کی قوتیں، اور زندگی کرنے کے قوانین رکھ دیتا ہے جنہیں وہ "ہدایت"، "حکم" یا "قدر" کہتا ہے جن کی بدولت وہ چیز باقی کائنات میں ٹھیک طرح سے فٹ ہو جاتی ہے "اس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور پھر اس کو راستہ دکھایا" (طہ۲۰:۵۰) "وہ جس نے (چیزوں کو) بنایا اور انہیں بہت اچھا بنایا، جس نے ان کا اندازہ ٹھہرایا اور ان کو ہدایت دی" (الاعلیٰ ۸۷:۲،۳) "دیکھو، تخلیق بھی اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے" (الاعراف ۷:۵۴) اور "ہم نے ہر چیز ایک مقرر انداز کے ساتھ پیدا کی

ہے" (القمر ۵۴:۴۹، دیکھیے الحجر ۲۱:۱۵) اگر چیزیں اپنے قانون توڑ دیں اور اپنی قدر سے باہر نکل جائیں تو ایک منظم کائنات باقی نہیں رہے گی بلکہ ایک افراتفری مچ جائے گی- قرآن اکثر اس کائنات کے کامل اور بے عیب نظام کی بات کرتا ہے یہ بتانے کے لیے کہ یہ نہ صرف خدا کے وجود کا ثبوت ہے بلکہ اس کی وحدانیت کا بھی ثبوت ہے (الانبیاء ۲۱:۲۲، اسی طرح دیکھیے النمل ۲۷ کی ۶۰ سے ۶۴ تک کی پر اثر آیات)

یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ 'اندازہ مقرر کرنا" جہاں تک نمونوں، مزاجوں اور میلانات کا تعلق ہے، ایک طاقتور کلی رجحان رکھتا ہے- اس کے نتیجے میں جو کارکردگی سامنے آتی ہے اس کا خاص واقعات اور اعمال کے لحاظ سے تصور نہیں کیا جا سکتا- چنانچہ یہ کوئی پیش فیصلے (predetermination) کا نظریہ نہیں ہے، اگرچہ اس کا مطلب ایک طرح کی "کلی جبریت" ضرور ہے- یہ بات ان آیات سے واضح ہوتی ہے جن میں "اندازہ قائم کیا ہوا" کے معنی "پیش فیصلہ شدہ" کے نہیں ہیں بلکہ "محدود" اور "مقید" کے ہیں- مندرجہ ذیل آیات کو اسی روشنی میں سمجھنا چاہیے-

> "اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے- یہ غالب اور علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے- اور چاند، اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے- نہ تو سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور وہ سب کے سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں" (یٰس ۳۶:۳۸-۴۰)

یہ 'قدر' یا 'اندازہ' انسانی اخلاقی اعمال کے دائرے میں بھی ایک کلی سطح پر کام کرتا ہے- جو اپنی تعریف کے اعتبار سے آزاد ہوتے ہیں- مثلاً تاریخ میں فیصلہ کسی قوم کی مجموعی کارکردگی پر ہوتا ہے- روز حشر کے فیصلے میں بھی یہ افراد کی مجموعی کارکردگی ہوگی جس کا جائزہ لیا جائے گا- انسان اور کائنات کے درمیان فرق یہ ہے کہ انسان کے ہاں جو اخلاقی اعمال ہوتے ہیں وہ آزاد انتخاب کے نتیجے میں ہوتے ہیں-

کائنات دراصل اس طرح سے مربوط ہے اور اتنی باقاعدگی کے ساتھ چلتی ہے کہ یہ خدا کا سب سے بڑا معجزہ ہے جس کا قرآن میں بار بار ذکر آتا ہے- خدا کو چھوڑ کر کوئی بھی ہستی اسی طرح کا وسیع و مستحکم ایوان (edifice) تعمیر نہیں کر سکتی تھی-

> "وہ جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے- تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی

طرح کی بے ربطی نہ پاؤ گے- پھر پلٹ کر دیکھو، کیا تمہیں اس میں کوئی خلل دکھائی دیتا ہے؟ پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد واپس لوٹ آئے گی- (الملک ۶۷:۳-۴)

"تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ وہ جامد ہیں مگر (اس روز) یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے- یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہوگا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے-" (النمل ۲۷:۸۸)

اس طرح کے فینا مینا کے حوالے کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کس باقاعدگی سے آتے ہیں اور ایک خشک موسم کے بعد جس میں زمین سوکھ کر مردہ ہو جاتی ہے کس طرح بارش کے موسم میں وہ زندہ اور تروتازہ ہو اٹھتی ہے- قرآن کے صفحات پر جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں-

یہ عظیم الشان کارخانہ، یعنی کائنات اپنے تمام تسبیحی سلسلوں کے ساتھ، اپنے خالق کی سب سے بڑی نشانی ہے- اس بے حساب طاقت والی، رحمت والی اور بامعنی ہستی کے سوا کون تھا جو ایک ایسی چیز کو وجود میں لاتا جس کی ابعاد (dimensims) اتنی وسیع اور جس کا نظم اور ڈیزائن اتنا پیچیدہ اور نازک ہے- اس کے باوجود قرآن بار بار یہ شکوہ کرتا ہے کہ انسان جب تک قدرتی اسباب اس کے لیے کام کرتے رہیں، عام طور پر خدا کو بھولا ہی رہتا ہے- ہاں جب قدرتی اسباب اس کے لیے اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں تو اسے خدا کا خیال آتا ہے- یہ کیسا سطحی پن اور کم نگاہی ہے- ایک آدمی صحرا میں پیاس سے نڈھال، مایوسی کی حالت میں پانی ڈھونڈ رہا ہے اور سراب کو پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے- جب وہ اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اس کا خیال تھا کہ پانی ہوگا، اسے پانی نہیں ملتا، بلکہ کچھ بھی نہیں ملتا- لیکن اسی لمحے جب از الہ سحر ہوتا ہے تو وہ خدا کو پالیتا ہے (النور ۳۹:۲۴) یہ صورت حال ان کفار کے لیے ایک کہانی کی صورت میں بیان کی گئی ہے جو سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ریکارڈ بہت وزنی اور نتیجہ خیز کارناموں سے بھرا ہوا ہے- یہ کارنامے آخری تجزیے میں ایک سراب سے زیادہ ثابت نہیں ہوتے- اسی طرح جب لوگ ایک جہاز میں بیٹھ کر سمندر کا سفر کرتے ہیں، اور پانی پرسکون ہوتا ہے اور ہوا موافق ہوتی ہے تو وہ اپنے عیش و نشاط میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی خدا بھی ہے- لیکن اچانک وہ ایک طوفان کی زد میں آ جاتے ہیں اور تیز ہواؤں کے اثر سے بپھری ہوئی موجیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں چنانچہ نجات کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی- اس کامل بے بسی کے لمحے میں وہ خدا کو بڑے خلوص سے پکارتے ہیں- جب خدا

انہیں اس مصیبت سے نجات دے دیتا ہے تو وہ پھر سے باغی بن جاتے ہیں اور غلط کام کرنے لگتے ہیں (یونس ۱۰: ۲۲ اور مابعد، العنکبوت ۲۹: ۶۵ اور مابعد)

لوگ خدا کا مرتبہ کم کرتے ہیں، یا اسے نظر انداز کرتے ہیں یا اس کے خلاف بغاوت تک کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نیچر جس طرح سے کام کرتی ہے اس کے اپنے اسباب ہوتے ہیں جنہیں وہ عام حالات میں حتمی اور آخری قرار دیتے ہیں- وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کائنات ایک علامت ہے جو اپنے ماورا کسی اور چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہے، ایک ایسی چیز کہ جس کے بغیر یہ کائنات اپنے تمام قدرتی اسباب کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوگی اور کچھ بھی نہیں ہو سکے گی-

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ لوگ اس منظم کائنات کو بطور نشانی یا معجزے کے بالکل نہیں لیتے، بلکہ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اس قدرتی نظام میں کوئی رکاوٹ ہو یا رخنہ پیدا ہو تو پھر وہ خدا کے معجزوں سے آشنا ہوں گے- دوسرے یہ کہ اور یہ کہیں زیادہ اہم ہے، یہ کائنات بطور ایک نشانی کے بالکل معدوم ہو جاتی ہے جب وہ "خدا سے الگ" رکھی جاتی ہے- اس لیے کہ خدا سے الگ کسی چیز کو بھی وجود رکھنے کا جبلی حق نہیں ہے- یہ امر کہ زمین لوگوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور بیٹھ نہیں جاتی، نیز آسمان جو اس بے پایاں فضا کو سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کی دھجیاں نہیں اڑتیں- یہ بذات خود معجزے ہیں (سبا ۳۴: ۹، ق ۵۰: ۶، و مابعد الذاریات ۵۱: ۴۷ و مابعد، اسی طرح الرعد ۱۳: ۲، اور وہ تمام آیات جن میں آسمانوں اور زمین کے باہم مربوط اور پختہ صورت میں بنے ہوئے کا ذکر آیا ہے) حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا کی رحمت کا یہ اولین اور اساسی عمل نہ ہوتا تو کائنات میں ایک خالی خولی نیستی (nothingness) پائی جاتی، نہ کہ ہستی کی یہ فراوانی اور کاملیت، بالکل خلاء اور فقدان ہوتا نہ کہ وجود کی یہ زرخیزی اور رونق! اس لیے نیچر کی یہ فراوانی بذات خود "فوق الفطری انداز سے" معجزانہ ہے اور ان لوگوں کے لیے سب سے بڑا معجزہ ہے "جو خلوص کے ساتھ غور کرتے ہیں اور اپنے کانوں کو سننے پر لگا دیتے ہیں-" رحمت خدا کی اتنی ہی مطلق صفت ہے جتنی کہ اس کی طاقت اور ایک قطعی معنی میں تخلیق کے مترادف ہے- جہاں کائنات ان معنوں میں خود مختار ہے کہ یہ اپنے آپ ہی جبلی قوانین کے مطابق کام کرتی ہے یہ یقیناً مطلق العنان نہیں ہے اس لیے کہ یہ اپنے اندر اپنی حتمیت (ultimacy) یا اپنی علت غائی (rationale) اپنے وجود کے ایک جزو لازم کے طور پر نہیں رکھتی-

کائنات کو اپنی ناقابل ادراک وسعت اور باضابطگی کی وجہ سے انسان کے لیے خدا کی نشانی

کا کام کرنا چاہیے- اس لیے کہ صرف غیر محدود اور یکتا ہستی ہی اسے تخلیق کر سکتی تھی- اسے ''قدرتی نشانی'' (natural sign) کہنا چاہیے- تاہم اگر کچھ یا زیادہ تر لوگ کائنات کے عام عمل سے اس کی ترغیب نہیں پاتے تو خدا کے پاس یہ طاقت ہے کہ وہ قدرتی سباب کا رخ موڑ دے، انہیں دبا دے یا ان کی افادیت کو عارضی طور پر معطل کر دے- اس طرح کے عجوبہ واقعات جیسے سیلاب، طوفان باد و باران، شدید زلزلے یا جہاں عموماً بارش نہیں ہوتی وہاں موسلا دھار بارشیں، یہ غیر معمولی طور پر مخصوص نشانیاں ہیں، جو اکثر ایسے وقت ظاہر ہوتی ہیں جب کوئی قوم عمل کے ایک فاسقانہ راستے پر اس طرح چل پڑتی ہے کہ اس سے ہٹائی نہیں جا سکتی- یہی وجہ ہے کہ جب اہل مکہ پیغمبر سے اس طرح کی فیصلہ کن نشانیاں مانگتے تھے تو قرآن ان سے کہتا تھا کہ ان کی امید نہ رکھو، اس لیے کہ جب وہ ظاہر ہوتی ہیں تو وہ لوگ جن کے لیے انہیں ظاہر کیا جاتا ہے انہیں کوئی امن و سکون نصیب نہیں ہوتا (الانبیاء ۲۱:۴۰، السجدہ ۳۲:۲۹، الانعام ۶:۸) اس طرح کی نشانیاں کائنات کے مقررہ دستور کے خلاف نہیں ہوتیں لیکن یہ اتنی غیر معمولی ہوتی ہیں کہ انہیں ''بدشگون نشانیاں'' یا ''تاریخی اہمیت کی نشانیاں'' کہا جا سکتا ہے-

دوسری علامتیں بظاہر کائنات کے مقررہ دستور کے خلاف ہوتی ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تو وہ ان کے لیے ٹھنڈی اور محفوظ ہو گئی یا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدہا بن گیا- ان کو ''مافوق الفطرت معجزے'' کہا جا سکتا ہے- یہ نشانیاں اونچے درجے کے معجزے ہوتے ہیں جن کا ظہور خدا کے کسی پیغمبر کے ہاتھوں ہوتا ہے اور ان کا مقصد پیغمبر کے دعوے اور اس کی تعلیم کی سچائی کی تائید کرنا ہوتا ہے- قرآن یہ بات زور دے کر کہتا ہے کہ کوئی پیغمبر الوہی اجازت اور عملی مدد کے بغیر معجزے نہیں دکھا سکتا- ''کسی پیغمبر کا یہ مقدور نہیں ہے کہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لائے-'' (المومن ۴۰:۷۸) چنانچہ حضرت عیسیٰ کے تمام معجزات کے متعلق کہا گیا کہ وہ خدا کی اجازت سے واقع ہوئے (آل عمران ۳:۴۹) یہ بات محض آنحضرتؐ کے دفاع میں نہیں کہی گئی جب وہ اس طرح کے معجزات دکھانے کے قابل نہیں لگتے تھے- قرآن کے اس طرح کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ لوگ نیچرل واقعات کے ظہور کو غلطی سے صرف ان کے نیچرل اسباب سے منسوب کرتے ہیں اور ان کے اندر خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے جب ایک ''مافوق الفطرت معجزہ'' واقع ہوتا ہے تو وہ ایسا ہونا چاہیے کہ بغیر کسی شبہے کے یہ لگے کہ یہ خدا کی طرف سے واقع ہوا ہے-

قدرتی اور مافوق الفطرت نشانیوں اور معجزوں پر بات کو آگے بڑھانے سے پہلے بہتر ہوگا کہ

ہم یہ دو نکات ذہن میں رکھ لیں- پہلا یہ کہ اگر چہ مذہبی معنوں میں ایک ''نشانی'' اپنے سے ماورا اپنے موجد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس معنی میں یہ تغیر احوال عقلی یا کم از کم معقول ہوتا ہے، تاہم یہ عقلی ثبوت کے برابر نہیں ہوتا- کسی نشانی کے معنی متعین کرنے کے لیے انسان کے پاس عقل کے ساتھ ساتھ، ایک خاص افتادِ مزاج یعنی ایمان کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے- یہی وجہ ہے کہ بہت سے نیچریوں کے نزدیک یہ کائنات کوئی ایسی نشانی نہیں ہے جو اپنے سے ماورا کسی طرف اشارہ کرتی ہو، بلکہ وہ آخری اور انتہائی حقیقت ہے (''یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور اور گردش ایام (وقت) کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو'' الجاثیہ ۴۵:۲۴) درحقیقت قرآن ہمیشہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ نشانیوں کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور قرآن کو سمجھنے کے لیے ذہنی کے ساتھ ساتھ مخصوص روحانی رویے کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان ''صحیح طرح سن سکے، صحیح طرح دیکھ سکے، اور صحیح طرح سمجھ سکے'' چنانچہ نشانیاں قرآن کی نظر میں اس لیے موضوعی نہیں قرار پاتیں کہ بہت سے لوگ انہیں ''دیکھ'' نہیں سکتے- جس طرح سورج موضوعی نہیں قرار پاتا کہ اندھیرے کے عادی جانور اسے دیکھ نہیں سکتے-

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر چہ بہت سے لوگوں نے نشانیوں کو، خاص طور پر مافوق الفطری یا وحی سے متعلق نشانیوں (قرآنی آیات) کو جادو یا شعبدہ بازی کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے لیکن یہ دونوں ایک نہیں ہیں- بلکہ پہلی صحیح اور اصلی ہے جبکہ دوسری فریب اور دھوکا- پہلی قسم کی نشانی کارگر ہونے کے بعد ایک مستقل کیفیت اپنے اندر رکھتی ہے جبکہ دوسری قسم کی نشانی سوائے اپنی نفسیاتی بُعد کے ایسی کوئی چیز اپنے اندر نہیں رکھتی- چنانچہ جادو ایک بُرا عمل ہے اس لیے کہ یہ اصلیت کو چھپاتا اور اسے مسخ کر دیتا ہے جبکہ ایک نشانی اصلیت اور حقیقت کو اس کی پوری کاملیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے- جب فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ کی مخالفت کر رہے تھے تو انہوں نے صرف لوگوں کی نگاہوں کے ساتھ دھوکا کیا تھا (الاعراف ۷:۱۱۶) ''یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے موسیٰ علیہ السلام کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں'' (طٰہٰ ۲۰:۶۶) جادو ایک طرح کا دھوکا ہے (طٰہٰ ۲۰:۶۴، ۶۹) جس کے لیے کچھ تربیت اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے (الاعراف ۷:۱۰۹، ۱۱۲، یونس ۱۰:۷۹) لیکن اپنے اس تمام جھوٹ کے باوجود جادو کا نفسیاتی اثر ضرور ہوتا ہے جو حقیقی ہوتا ہے- جیسے مثلاً دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت (البقرہ ۲:۱۰۲)

کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ایسا جادو سکھاتے تھے جس سے وہ شوہروں کو اپنی بیویوں سے جدا کر دیتے تھے- یہ اثر البتہ "خدا کی اجازت کے ساتھ" ہوتا تھا-

مکہ کے لوگوں (اور بعض اوقات مدینہ کے یہودیوں) نے پیغمبر سے مطالبہ کیا کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ ایسے معجزے سامنے لائیں جیسے ان سے پہلے کے پیغمبروں نے دکھائے تھے- اس پر قرآن میں متعدد قسم کے ردعمل سامنے آتے ہیں- آسمانوں سے لے کر زمین تک نیچر کا یہ سارا انتظام کار، خشکی اور سمندر پر نظر آنے والے متعدد مظاہر، خود انسان کا ذہن- بلکہ تمام مجرل فیناعینا- ان کا ذکر کر کے بتایا جاتا ہے کہ یہ اصل اور خالص نشانیاں ہیں- یہ دعوی اس مفروضے کا سہارا لیتا ہے یا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہی خدا جس نے کائنات کو پیدا کیا اور اس میں اتنی وضاحت کے ساتھ اپنی حکمت اور دانائی کا اظہار کیا، اسی نے قرآن کی آیات بھی (جن کا معنی ہے "نشانیاں") نازل کیں-

یہ بات نمایاں ہو جائے گی اگر مخالفین نیچر پر اور خدا پر سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ غور کر لیں- جس طرح صرف خدا ہی کائنات کو پیدا کر سکتا تھا اسی طرح صرف خدا ہی قرآن کو نازل کر سکتا تھا- قرآن کے مخالفین کو بعض اوقات چیلنج کیا جاتا ہے کہ "وہ قرآن کی صرف ایک سورت بنا کر پیش کر دیں" اور اس یقین کا اظہار کیا جاتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکیں گے چاہے اس کے لیے وہ کتنا ہی مل کر کوشش کر لیں اور دوسرے ذرائع سے بھی مدد لے لیں (البقرہ ۲: ۲۳، یونس ۱۰: ۳۸، ھود ۱۱: ۱۳، بنی اسرائیل ۱۷: ۸۸، الطور ۵۲: ۳۴) جس طرح کائنات خدا کے کبھی نہ ختم ہونے والے "کلمات" کی نمائندگی کرتی ہے اسی طرح قرآن (الکہف ۱۸: ۱۰۹) بھی ان کلمات کا نمائندہ ہے، اس لے کہ کائنات کی طرح قرآن بھی خدا کی اجازت سے پیغمبر کے ذہن کے اندر جاری رہتا ہے اور گر خدا ایسا چاہے تو پیغمبر کے دل پر وحی کے اترنے کا سلسلہ بند کر سکتا ہے- (الشوری ۴۲: ۲۴)

قرآن کی تنزیل اور کائنات کی تخلیق میں جو متوازی پن (بلکہ مماثلت) ہے اس کی طرف قرون وسطی کے متعدد مصنفین نے اشارہ کیا ہے جنہوں نے قرآن کی بہت سی ایسی آیات نوٹ کی ہیں جن کے اندر قرآن کی تنزیل اور کائنات کی تخلیق کو یکجا بیان کیا گیا ہے- یہ صحیح ہے کہ دوسرے موقعوں پر بھی بعض آیات میں ان دونوں کا ذکر کیا گیا ہے، مثال کے طور پر قرآن کی تنزیل پہلے صحیفوں کی تنزیل کی مناسبت سے!

اصل نکتہ جو میرے خیال میں بالکل صحیح نکالا گیا ہے- یہ ہے کہ قرآن اور کائنات کا اتنی بار

اکٹھا ذکر آنا کوئی اتفاقی امر نہیں ہے، بلکہ یہ ان دونوں کے درمیان ایک قریبی تعلق کی وجہ سے ہے جیسا کہ ہم سورہ آل عمران ۳ کی آیت ۱۰۸ و مابعد میں دیکھتے ہیں جہاں مختصر طور پر یہ بتانے کے بعد کہ بدکردار اور نیک لوگوں کے ساتھ قیامت کے روز کیا ہوگا، قرآن کہتا ہے: "یہ خدا کی آیتیں ہیں جنہیں ہم تم کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں---اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب خدا کا ہی ہے۔"

"بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوش مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا" (آل عمران ۳:۱۹۰ و مابعد)

"یہ قرآن کی آیات ہیں، اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، یہ خدا ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں۔ پھر وہ اپنے عرش پر جلوہ فرما ہوا اور سورج اور چاند کو پابند کیا کہ ان میں سے ہر ایک ایک معین میعاد تک گردش کر رہا ہے---" (الرعد ۱۳:۱ و مابعد، اسی طرح دیکھئے اس طرح کی دوسری آیات مثلاً یونس ۱۰:۱-۳ یوسف ۱۲:۱۰۲، ۱۰۵، طہٰ ۲۰:۱-۶)

قرآن کی آیات نشانیاں ہیں اس لیے کہ وہ اسی خدا کی طرف سے آتی ہیں جس نے کائنات تخلیق کی ہے لیکن قرآن اپنی آیات کو تبیین الآیات کہتا ہے یعنی خدا کی نشانیوں کی وضاحت یا انہیں ذہن میں جاگزین کرنے کی بات کرتا ہے جیسے کہ "ہم بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں" (الانعام ۶:۶۵) یا "ہم نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں" (الانعام ۶:۹۷-۹۸)

اکثر ہم پڑھتے ہیں "ہم ان کے لیے اپنی نشانیاں (جو پہلے سے موجود ہیں) وضاحت کے

ساتھ بیان کرتے ہیں'' (مُبَیّن الآیات) جیسا کہ سورہ البقرہ ۲: آیات ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۶۶ میں، اسی طرح آل عمران ۳: ۱۱۸، اور المائدہ ۵: ۷۵ میں آیا- جب 'آیات' کا لفظ قرآن کی آیتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو ان کے بارے میں ''ہم پڑھتے ہیں، یہ پڑھی جاتی ہیں'' کے جملے استعمال ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ ''آیات بینات'' (واضح آیتیں) ہیں- یہ اصطلاح قرآنی سورتوں کے علاوہ دوسری نشانیوں کے لیے صرف تین مرتبہ استعمال ہوئی ہے- ایک دفعہ ''کھلی نشانی'' کا ذکر کرتے ہوئے، یعنی لوط کی قوم کی تباہی کے ضمن میں (العنکبوت ۲۹: ۳۵) اور دو دفعہ حضرت موسیٰ اور یہودیوں سے متعلق تاریخی یا مافوق الفطری نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے (البقرہ: ۲۱۱، بنی اسرائیل ۱۰۱) یہ لفظ لگتا ہے کائنات کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا، قیاساً اس لیے کہ کائناتی نشانیاں قدرتی نظام علت و معلول کے نیچے دبی رہتی ہیں، یہاں تک کہ قرآنی آیات انہیں نکال کر باہر لاتی ہیں اور ان کو خدا کی نشانیوں کے طور پر پیش کرتی ہیں-

پس (اگرچہ اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے) جہاں قدرتی معجزے ان معنوں میں، نوع انسانی کی اکثریت کے نزدیک کمزور ہوتے ہیں اور قرآن میں انہیں صرف ''آیات'' کہا جاتا ہے وہاں تاریخی (اعجوبہ) معجزات، مافوق الفطرت معجزات اور اس سے بھی زیادہ خاص طور پر وحی کو آیات بینات یا صرف بینات کہا جاتا ہے، یعنی ''صاف، واضح اور مسلمہ نشانیاں''

تاہم اکثر لوگ ایسے ضدی ہوتے ہیں کہ اتنی ''مسلّم نشانیاں'' بھی انہیں ایمان کی طرف لانے کے لیے کافی نہیں ہوتیں، حالانکہ وہ قدرتی آیات سے کہیں زیادہ یقین دلانے والی ہونی چاہئیں- ''بینہ'' البتہ ان لوگوں کے لیے بہت کارگر علامت ہے جنہوں نے اسے شروع میں اور راست انداز سے دیکھا (مثلاً پیغمبر لوگ) چنانچہ ان کا پختہ یقین انہیں واضح طور پر اور ہمیشہ کے لیے کفار سے الگ کر دیتا ہے (الانعام ۶: ۵۷، الانفال ۸: ۴۲ اور خاص طور پر ھود ۱۱: ۱۷، ۲۸، ۶۳، ۸۸) قرآن پوچھتا ہے: ''کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے صاف صاف ثبوت رکھتا ہو، اس انسان کی طرح ہو سکتا ہے جس کے لیے اس کے بُرے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں؟'' (محمد ۴۷: ۱۴) چنانچہ بینہ ایک انسان کی سچائی کو جسے یہ دی گئی ہے اس کے مخالف کے جھوٹ اور فریب سے اچھی طرح ممیز کر دیتی ہے، اگرچہ یہ جھوٹ اور فریب کفار کو سچائی ہی دکھائی دیتا ہے- بات یہ ہے کہ جو چیز غلط طور پر سچائی نظر آتی ہے وہ زائل ہو جائے گی، لیکن ایک ''بینہ'' باقی رہے گی- پھر ایک آیت یا تو محسوس کی جاتی ہے یا نہیں کی جاتی- ایک بینہ یا تو اسے ٹھیک طرح سے محسوس کیا

جاتا ہے، یا اسے غلط سمجھا جاتا ہے، اور اسے خواہ مخواہ جادو یا کسی اور طرح کی شعبدہ بازی قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا- سورہ البینۃ ۹۸، آیات ۱ تا ۴ میں قرآن کے ساتھ خود پیغمبر کو بھی بینہ قرار دیا گیا ہے- یہ مختصر سورت جس کا نام ''البینۃ'' ہے- یہ خیال بھی ظاہر کرتی ہے، جو قرآن میں دوسری جگہ بھی دہرایا گیا ہے کہ مذہبی اختلافات اور فرقے بینات ہی سے بنتے ہیں جب لوگ، جو ان کا انکار نہیں کر سکتے، ان کی صحیح نوعیت، ان کے ماخذ اور معنی کے بارے میں مختلف الرائے ہوتے ہیں-

بینہ سے بھی زیادہ پر زور لفظ 'برہان' ہے جس کا مطلب ہے مدلل ثبوت اور جو اپنے اندر ناقابل تردید عقلیت کا عنصر رکھتا ہے- یہ بینہ کے قریب ہے اور اسی کی طرح اعجوبہ باتوں، مافوق الفطرت معجزوں اور وحی اور عقل، بلکہ وحی اور عقل کے امتزاج کے اندر رہتا ہے- لیکن جہاں بینہ واضح اور صاف ہے اور ان معنوں میں ناقابل مزاحمت! وہاں برہان عقلی اور نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو منوانے والی ہے- خود قرآن کو برہان کہا گیا ہے (النساء ۴:۱۷۵) سورہ البقرہ ۲، آیت ۱۱۱ سورہ الانبیاء ۲۱، آیت ۲۴، المومنون ۲۳، آیت ۱۱۷، النمل ۲۷:۶۴ اور القصص ۲۸:۷۵ میں اس لفظ کے معنی ہیں ایک قائل کرنے والا (عقلی) بیان جو کافروں اور اصنام پرستوں سے ان کے مذہبی موقف کی حمایت میں طلب کیا جاتا ہے- برہان کا ایک نہایت ہی دلچسپ استعمال سورہ یوسف آیت ۲۴ میں ملتا ہے کہ حضرت یوسف مصری خاتون کے ساتھ ناجائز جنسی تعلق قائم کرنے سے باز رہے اور اس عورت کے طاقتور حسن و جمال کے سامنے بالآخر اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا، جبکہ ان دونوں کی باہمی جنسی کشش سے ہیجان پیدا ہو چلا تھا، صرف اس لیے کہ ''یوسف نے اپنے رب کی برہان دیکھ لی تھی-'' چنانچہ برہان ایک طرح کا عقلی ثبوت ہے (جو صرف منطقی نہیں)، جو حد درجہ طاقتور اندرونی تحریک کو ضبط میں لانے اور اس کا رخ موڑ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے-

لیکن سب سے طاقتور قسم کی آیت یا ''نشانی'' جو اپنے استعمال میں برہان کے بھی قریب ہے- ''سلطان'' ہے جس کے لفظی معنی ''اقتدار'' یا ''طاقت'' کے ہیں- لیکن قرآن میں وہ ایک طرح کی نشانی یا ثبوت کے لیے استعمال ہوتی ہے جسے ایک ''غالب اور چھانے جانے والا ثبوت'' کہا جا سکتا ہے- جہاں ایک ''بینہ'' ایک کھلے اور غیر متعصب ذہن کے لیے واضح اور ناقابل تعرض ہوتی ہے اور ایک ''برہان'' کی اثباتی قوت بعض تعصبات پر غالب آ سکتی ہے وہاں ایک ''سلطان'' میں ایسی قوت ہوتی ہے جو نفسیاتی طور پر قریب قریب جابرانہ ہوتی ہے، وہ یوں کہ وہ ان لوگوں کو

جو سچائی کو رد کرنے پر کافی حد تک تلے ہوئے ہوتے ہیں، اس بات پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اسے کسی طرح مان لیں۔ یہاں اس بات پر زور دیا جانا چاہیے کہ ان تمام اصطلاحوں میں جو فرق ہیں وہ زیادہ تر تاثیر کی قوت کی مقدار یا درجے کے ہیں۔

سلطان کا غالباً بہترین ترجمہ یہ ہے کہ ''وہ چیز جو غالب اور حاوی ہو جاتی ہے، اور اپنا کوئی حقیقی متبادل نہیں چھوڑتی''۔ اس کا مادہ اپنی دوسری فارم میں جب قرآن میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے (یعنی سلّط کے) معنی ہیں، کسی ایک کو کسی دوسرے پر جسمانی طاقت سے غلبہ دلا دینا (النساء۴:۹۰، الحشر ۵۹:۶) اور یہ طاقت خدا کی طرف سے سمجھی جاتی ہے۔ سورہ الرحمان ۵۵ کی آیت ۳۳ (اے گروہ جن وانس اگر تم آسمانوں اور زمین کی سرحدوں سے نکل کر بھاگنے کی طاقت رکھتے ہو تو بے شک بھاگ کر دیکھ لو۔ لیکن تم نہیں بھاگ سکو گے بغیر سلطان کے یعنی علم کی طاقت کے) کی تفسیر کرتے ہوئے طبری کہتے ہیں کہ سلطان کے اصل معنی ہیں ایک واضح ثبوت یا دلیل (بینہ، حجہ) لیکن یہ لفظ ان معنوں میں بھی آتا ہے: مادی ملکیت یا مجبور کر دینے والی طاقت! اس لیے کہ طاقت کی یہ آخری قسم کسی طرح کا ''واضح ثبوت'' مہیا کرنے کا کام بھی دیتی ہے۔ [۲]

جہاں یہ کہنا صحیح ہے کہ سورہ الرحمٰن آیت ۳۳ میں ''سلطان'' کے معنی ہیں واضح ثبوت یا دلیل جس کی جڑ یقینی علم میں ہو، وہاں قرآن کے عام استعمال میں اس کا ماحصل بالکل دوسری طرح کا دکھائی دیتا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی یقیناً مادی اور غالب طاقت کے ہو سکتے ہیں جیسا کہ خود طبری کو اس کا اعتراف ہے۔ روز آخرت شیطان ان لوگوں کو جو اس پر انہیں اس دنیا میں گمراہ کرنے کا الزام لگائیں گے، جواب دے گا ''مجھے تم پر کوئی طاقت (سلطان) حاصل نہیں تھی۔ میں نے تمہیں برائی کی طرف بلایا اور تم نے میری دعوت قبول کر لی۔'' (ابراہیم ۱۴:۲۲) اسی طرح کی گفتگو قیامت کے روز ان لوگوں کے درمیان جو اس دنیا میں کمزور تھے اور جو طاقتور اور امیر تھے، واقع ہو گی، اور کمزور لوگ، طاقتور لوگوں پر یہ الزام دھریں گے کہ انہوں نے انہیں گمراہ کیا تھا (الصافات ۳۷:۲۷-۳۰) لفظ ''سلطان'' کے ان تمام استعمالات کے معنی گویا خالص مادی طاقت کے ہیں۔ یہ معنی منطقی اعتبار سے بھی مقدم ہونے چاہئیں، اس لیے کہ یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کس طرح غالب مادی طاقت، غالب عقلی یا روحانی طاقت میں تبدیل کی جا سکتی ہے لیکن اس کا الٹ شاید ٹھیک نہ ہو۔

تاہم قرآن کی اکثر دوسری آیتوں میں ''سلطان'' کے معنی ایک طاقتور اور غالب ثبوت،

(۲) ابو جعفر محمد ابن جریر الطبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن (قاہرہ: ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء جلد ۲۷: صفحہ ۷)

دلیل یا نشانی (معجزے) کے ہی ہیں۔ یہ ایک مافوق الفطری معجزے کی صورت اختیار کر سکتا ہے (المومنون ۲۳:۴۵) یا ایک ایسی وحی کی جسے پڑھا جا سکے یا جس کی تلاوت کی جا سکے (سورہ الصافات ۳۷:۱۵۶ و مابعد) اس کے معنی ایک ایسے سبب کے بھی ہو سکتے ہیں جو سزا کی کاروائی کو جائز قرار دے۔ ''جو شخص بھی مظلومانہ قتل کیا گیا ہو۔ اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق (سلطان) عطا کیا ہے (یا انتقام لینے کا جواز)'' (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) ''کیا تم اپنی (بداعمالیوں سے) چاہتے ہو کہ خدا کو اپنے خلاف ایک صریح حجت (سلطان) دے دو؟'' (النساء ۴:۱۴۴) یا عقوبتی کاروائی کا دفاع کرتے ہوئے ایک مضبوط سبب بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت سلیمان نے ہدہد کے متعلق کہا ''میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ (سلطان) پیش کرنی ہوگی'' (النمل ۲۷:۲۱)

اگر چہ ہم اکثر قرآن میں دیکھتے ہیں کہ ''سلطان'' کا یا تو پیغمبروں سے تقاضا کیا جاتا تھا یا یہ ان کو عطا ہوتی تھی، اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مختلف مواقع پر خود قرآن کو بھی ''سلطان'' کہا گیا۔ زیادہ عام استعمال اس لفظ کا وہاں دکھائی دیتا ہے جہاں پیغمبروں کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے مخالفین پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ خدا کے علاوہ ''ایسی چیزوں کی عبادت کر رہے ہیں جن کے بارے میں خدا نے کوئی سند (سلطان) نہیں اتاری۔'' یا جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کے سوا جن چیزوں کو پوجتے تھے ''وہ صرف نام ہی تھے جو ان پوجنے والوں نے اپنے خداؤں کو دے رکھے تھے، بغیر اس کے کہ ان کے حق میں خدا کوئی سند (سلطان) نازل کرتا'' (آل عمران ۳:۱۵۱، الانعام ۶:۸۲، الاعراف ۷:۳۳، ۷۱، یوسف ۱۲:۴۰، النجم ۵۳:۲۳) منٹگمری واٹ (۳) نے رچرڈ بیل (۴) کا تتبع کرتے ہوئے سورہ النجم کی آیت ۲۳ کی یہ تعبیر کی ہے کہ بعض جاہلی خدا ''صرف نام'' ہی تھے جو پوجنے والوں نے اپنے خداؤں کو دے رکھے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اس بات پر زور دینا چاہتا ہے کہ جاہلی لوگ جن بتوں کی عبادت کرتے تھے ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ واٹ اور بیل دونوں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جاہلی خداؤں کے بارے میں قرآن کا یہ آخری موقف تھا جبکہ اس سے پہلے اس کا نظریہ یہ رہا تھا کہ جن چیزوں کو اہل جاہلیت خدا سمجھ کر پوجتے تھے وہ

(۳) رچرڈ واٹ کی کتابیں: Mohammad at Mecca (p : 104) and Companion to the Quran (p : 245)

(۴) The Quran, page 541.

دراصل فرشتے تھے-ایک ایسا نظریہ جس کے بارے میں خیال یہ ہے کہ سورہ النجم ۵۳ کی آیت ۲۷ میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے-

یہ تعبیر مجھے ایک فاش غلطی لگتی ہے جو بظاہر اس لیے گھڑی گئی ہے کہ یہ بیل کے اس نظریے کو تقویت دے کہ پیغمبر نے قرآن پر بار بار نظر ثانی کی-''اگرچہ الوہی ہدایت کے مطابق-'' قرآن نے کسی جگہ یہ نہیں کہا کہ جاہلی خدا محض نام تھے اور کچھ نہیں تھے-قرآن جو کچھ اہل جاہلیت سے کہہ رہا ہے- نہ صرف محمدؐ کے ذریعے، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور دوسروں کے ذریعے- وہ یہ ہے کہ جب انہوں نے متعدد اشیاء کو خدا مان لیا تو وہ صرف نام پکار رہے تھے، بغیر کسی سچائی یا جواز کے- یہ امر کہ کفار کے خدا محض لاشے ہونے کی بجائے اصل میں حقیقی وجود (Objects) تھے- چاہے انسانی یا دوسری طرح کے- یہ قرآن کے متعدد حصوں میں بہت وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے- مثلاً جب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے قیدی ساتھیوں سے کہتے ہیں:

> ''اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق خدا بہتر ہیں، یا ایک غالب خدا؟ اس کے سوا تم جن چیزوں کو پوجتے ہو، وہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، جن کے لیے خدا نے کوئی سند (سلطان) نازل نہیں کی-'' (یوسف ۱۲: ۳۹ و مابعد)

آنحضرتؐ کے مخالفین ان سے جن ''نشانیوں'' یا معجزات کا تقاضا کرتے تھے ہم ان کا ذکر جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن کا حسب معمول ردعمل یہ ہے کہ وہ کائنات کی پیچیدگی، باقاعدگی اور اس کے مکمل نظم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے یہ از خود وجود میں نہیں آسکتے تھے، اور نہ وہ محض لہو ولعب کے لیے پیدا کیے گئے، بلکہ ایک سنجیدہ مقصد کے لیے (آل عمران ۳: ۱۹۱، ص ۳۸: ۲۷) یہ جواب اوپر سے لگتا ہے کہ پیغمبرؐ کے پیغام کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے اتنا نہیں ہے جتنا کہ خدا کی مطلق طاقت کو اور اس کے بامقصد ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ہے- تاہم قرآن کی آیات اور کائنات کی آیات (نشانیوں) کے درمیان تعلق ہونے کی وجہ سے قرآن کا کائنات سے متعلق جو جواب ہے وہ خود قرآن کی سچائی سے براہ راست جڑ جاتا ہے-

اس بات کی شہادت موجود ہے کہ قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بعض 'تاریخی' یا 'اعجوبہ' نشانیاں

پیغمبر کے پیغام کی تائید کرتی ہیں- چنانچہ ہم پڑھتے ہیں ''لوگ (یعنی اہل مکہ) کہتے ہیں: وہ اپنے رب سے نشانی لے کر کیوں نہیں آتا؟ کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کی نشانی نہیں آئی-'' (طہ ۲۰:۱۳۳) ''بے شک یہ اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے- کیا ان (اہل مکہ) کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس بات کو جانتے ہیں'' (الشعراء ۲۶:۱۹۶ او مابعد)

ایک واضح اعجوبہ نشانی سور۔ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۱ میں بیان ہوئی ہے ''جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے- یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو'' مقصد یہ ہے کہ اہل مکہ کے مصائب (قحط، لڑائیاں وغیرہ) ایک نمونہ ہیں اس چیز کا جو بطور الوہی عقوبت اور سرزنش کے انہیں آگے پیش آنے والی ہے- مفسر طبری مختلف سندوں کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور پر ان مصائب و آفات کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اہل مکہ کو اس وقت پیش آئی تھیں جب مسلمانوں نے ان کے کاروانوں پر حملے کئے تھے، جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ نکلا کہ مکہ نے بالاخر اسلام کے سامنے سپر ڈال دی (۵)- اس تعبیر کے مطابق یہ آیت اپنی پیش گوئی میں سورہ الروم ۳۰ کی آیات ۱ تا ۶ سے ملتی جلتی ہے جس میں بازنطین پر فارسی غلبے کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی (مثلاً اس بیان میں کہ ''یہ اللہ کا وعدہ ہے'') کہ جنگ کا پانسہ پلٹ کر رہے گا-

لیکن اہل مکہ اور یہودی آنحضرتؐ سے خاص طور پر جس چیز کا تقاضا کرتے تھے وہ مافوق الفطرت معجزات تھے، اسی طرح کے جو پہلے پیغمبروں کے تھے مثلاً وہ یہ کہتے تھے کہ اس کی طرف ایک فرشتے کو اتارا جائے یا یہ کہ وہ دیکھتے دیکھتے بہت امیر ہو جائے یا اس کے پاس بڑے بڑے باغات ہو جائیں، یا یہ کہ وہ آسمانوں کو نیچے لے آئے یا خود آسمانوں کی طرف صعود کرے اور وہاں سے ایک ایسی کتاب لے آئے جسے وہ پڑھ سکیں وغیرہ وغیرہ- (الانعام ۶:۸، ۵۰، ھود ۱۱:۳۱، الفرقان ۲۵:۷، اسی طرح دیکھئے بنی اسرائیل ۱۷:۹۰ و مابعد) قرآن جواب میں کہتا ہے کہ فرشتے پیغمبر کی طرف ضرور بھیجے جاتے اگر وہ لوگ جن کو پیغام پہنچایا جا رہا ہے خود فرشتے ہوتے، پھر یہ کہ محمدؐ نے کبھی خزانوں کا مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا- وہ تو کہتا ہے میں خدا کا ایک پیغام بر ہوں- نیز یہ کہ خدا خود اگر چاہتا تو پیغمبر کے ہاتھوں یہ چیزیں ظاہر کرا دیتا- لیکن ایک پیغمبر از خود اس طرح

---

(۵) الطبری: ایضاً جلد ۱۳: ۸۹-۹۱

کی چیزیں نہیں کر سکتا- (الانعام ۶:۹، ۷:۳۷، ۱۱۰، ۱۱۱، بنی اسرائیل ۱۷:۹۵، الاعراف ۷:۱۸۸، ھود ۱۱:۱۲) لیکن ان سوالوں کے دوسرے جواب بھی ہیں: یہ کہ پہلی قوموں کو ان کے پیغمبروں کے ہاتھوں بالکل وہی معجزے دکھائے گئے تھے جو انہوں نے طلب کئے تھے لیکن لوگوں نے پھر بھی پیغمبروں کو مان کے نہ دیا- اور اگر محمدؐ اہل مکہ کے لیے یا یہودیوں کے لیے ہزاروں معجزے لے آتے تو یہ ان کو کوئی فائدہ نہ دیتے، اور اگر محمدؐ آسمانوں سے ایک کتاب لے کے آتے جسے یہ دیکھ اور چھو سکتے، تو یہ پھر بھی انہیں قبول نہ کرتے (آل عمران ۳:۱۸۳، و مابعد، الانعام ۶:۷ وغیرہ) بلکہ سورہ بنی اسرائیل ۱۷ کی آیت ۵۹ تو صاف صاف کہتی ہے: ''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا سوائے اس کے کہ اگلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا'' بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو اس سے کہیں بڑے معجزات دکھانے کو کہا تھا جو یہ لوگ محمدؐ سے مانگ رہے تھے- اس لیے کہ وہ موسیٰ سے کہتے تھے کہ ہمیں خدا کو ظاہر (یعنی آنکھوں سے) دکھاؤ-

اس بات کا ایک سبب کہ آنحضرتؐ کے پاس قدیم زمانے کے فوق الفطرت معجزات نہیں تھے، یہ تھا کہ وہ معجزات پرانے ہو چکے تھے اور ان کا رواج باقی نہیں تھا- تاہم پیغمبرؐ کو یہ خیال بے چین ضرور کرتا تھا کہ ان کو فوق الفطرت معجزات نہیں دیئے گئے تھے- اس پر قرآن ذرا صاف صاف انداز میں کہتا ہے:

> ''ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس سے تمہیں رنج ہوتا ہے- لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیات (نشانیوں) کا انکار کرتے ہیں- تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، لیکن انہوں نے اپنے جھٹلائے جانے پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں، صبر کیا- یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد آ پہنچی ------ تاہم اگر ان لوگوں کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے تو اگر تم میں طاقت ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ لو، یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کو کوئی نشانی (معجزہ) لا دینے کی کوشش کرو، اگر خدا یہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا لہذا تم کبھی نادان نہ بننا-'' (الانعام ۶:۳۳-۳۵)

ایک طرف نیچر کی باقاعدگی اور خود مختاری کے تصورات اور دوسری طرف اس کے غیر حتمی ہونے کے تصورات قرآن میں الگ اور امتیازی صورت میں (exclusively) ظاہر نہیں ہوتے اور اس سے اہم یہ کہ معجزات کے عقیدے کے ضمن میں بھی نہیں، بلکہ یہ دو دوسرے مقاصد کے لیے سامنے آتے ہیں: نیچر کے غیر حتمی ہونے کی دلیل اکثر اس کی انہدام پذیری اور بعد میں اس کی دوبارہ تخلیق کے امکان کے لیے استعمال کی جاتی ہے جب انسان کا آخری حساب لیا جائے گا اور اس کے اعمال کا فیصلہ ہوگا - وہ لوگ جن کے لیے اس نیچرل فینامینا کا استحکام، مکمل اخلاقی ذمہ داری اور آخری فیصلہ تسلیم کرنے کے خلاف ایک محفوظ جائے پناہ مہیا کرتا ہے، ان کو پتا ہونا چاہیے کہ خدا جس کی بڑی نشانی یہ کائنات ہے وہ دوسری طرح کی زندگی اور زندہ رہنے کی صورتیں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس شعور کا پیدا ہو جانا کہ یہ زندگی، زندگی کی ان لاتعداد صورتوں میں سے ایک ہے جو خدا پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ نیچر کے اس پردے کو ہٹانے کا جو انسان کو خدا سے جدا کرتا ہے، ایک طاقتور عامل ہے، حتیٰ کہ غبی اور کند ذہنوں کے لیے بھی! حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں زندگی کی متعدد اور گوناگوں صورتیں ایک ایسی ہستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کی طاقت اور دانائی لانہایت ہے۔ اگر خدا اس کائنات کو اور جو کچھ اس میں ہے اسے پیدا کر سکتا ہے تو وہ اسے زندگی کی ایک دوسری سطح سے بھی بدل سکتا ہے جہاں لوگوں پر ان کے اعمال کے مطابق حکم لگایا جائے گا جو انہوں نے اس دنیا میں کیے ہوں گے اور انہیں ان کے صحیح مقدر تک پہنچایا جائے گا۔

قرآن متعدد سورتوں (مثلاً سورہ تکویر ۸۱ اور سورہ زلزال ۹۹) میں بہت واضح اور کھلے انداز میں اس ابتری کا نقشہ کھینچتا ہے جو اس وقت کے خاتمے پر واقع ہوگی جب خدا نیچر کے ان قوانین کو معطل کر دے گا جو اس نے تخلیق کے وقت قائم کیے تھے۔ خدا کی طاقت کے سامنے، جو انصاف اور رحمت کے لیے کام میں لائی جاتی ہے، کوئی چیز بھی نہیں ٹک سکتی۔ روز حشر، پوری زمین اس کے قبضہ قدرت میں ہوگی اور آسمانی فضا کی بے پایاں وسعت اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹی ہوگی۔ (الزمر ۳۹:۶۷) کیا خدا اپنی پہلی تخلیق کے بعد اتنا تھک گیا ہے کہ وہ دوسری تخلیق نہیں کر سکتا (ق ۵۰:۱۵) تباہی صرف تباہ کرنے کے لیے نہیں ہوگی۔ بلکہ مادی اور اخلاقی عناصر اور عوامل کو دوبارہ ترتیب دینے اور تخلیق کی ایک نئی سطح قائم کرنے کے لیے ہوگی۔

اسی طرح نیچر کے باقاعدہ ہونے کی جو دلیل ہے وہ اکثر انسان کے لیے نیچر کی افادیت کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے- یہ نیچر انسان کے لیے ہے اور وہ اس کا اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے- جبکہ انسان کا اپنا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خدا کے احکام بجا لائے، اس کا شکر گزار رہو اور صرف اسی کی عبادت کرے- انسان کے لیے کائنات کی افادیت، اس کا انسان کے مقاصد کی تکمیل کرنا اور انسان کا اسے استعمال کرنا- ان سب کا متعدد آیات میں ذکر آتا ہے:

''یہ وہی ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں''(البقرہ۲:۲۹)

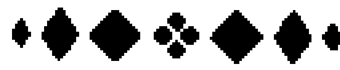
''کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے-''(لقمان۳۱:۲۰)

''یہ خدا ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تا کہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو- اور اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، اپنے ارادے سے، اس میں بڑی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں (الجاثیہ۴۵:۱۲ و مابعد، اسی طرح ابراہیم۱۴:۳۲ و مابعد، النحل ۱۶:۱۲-۱۴، الحج ۲۲:۶۵، العنکبوت ۲۹:۶۱، لقمان ۳۱:۲۹، فاطر۳۵:۱۳، الزمر۳۹:۵، الزخرف۴۳:۱۲ و مابعد)

اگرچہ یہ تمام آیات خدا کی طاقت کو ظاہر کرتی ہیں، ان کا بنیادی مقصد یہ دکھانا ہے کہ خدا اپنی قوت انسان کی بھلائی کے لیے کس طرح استعمال کرتا ہے- انسان کو اس امر کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کا یہ موقع اچھائی کے لیے استعمال کرے اور ''فساد فی الارض'' نہ کرے- یہ ٹکڑا قرآن میں بار بار استعمال ہوا ہے- کائنات کی تخلیق ایک سنجیدہ معاملہ تھا، یہ کوئی کھیل نہیں تھا اور نہ کوئی ادنیٰ یا خفیف چیز ''اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے- یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا یا جو ناشکر گزار ہیں'' (ص۳۸:۲۷، دیکھیے آل عمران۳:۱۹۱) نیچر قادر مطلق کا عظیم شاہکار ہے، لیکن یہ اس لیے نہیں

ہے کہ وہ خدا کی طاقت اور قدرت کو ظاہر کرے- یہ اس لیے ہے کہ یہ انسان کی خدمت کرے اور اس کی تمام اہم ضروریات کی تکمیل کرے-

انسان کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں اچھے کام کرے، اپنے آپ کو خدا کی جگہ پر نہ رکھے اور یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق اور اپنے خودغرضانہ اور محدود مقاصد کے لیے اخلاقی قانون بنا سکتا ہے اور پھر اسے توڑ سکتا ہے- مادی قوانین اور اخلاقی قوانین میں یہی فرق ہوتا ہے کہ ایک کو استعمال کر کے اس سے کام لیا جاتا ہے جبکہ دوسرے کی اطاعت اور غلامی کی جاتی ہے- اس لیے خدا کہتا ہے: ''تو پھر کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم (ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے) ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے'' (المومنون ۲۳:۱۱۵)



باب پنجم

رسالت اور وحی

باب اول میں ہم نے رسالت اور وحی کی ضرورت کے بارے میں عام انداز میں بات کی تھی، جس کی بنیاد خدا کی عام رحمت اور اخلاقی شعور اور تحریک میں انسان کی ناپختگی پر ہے۔ پیغمبر غیر معمولی لوگ ہوتے تھے جو اپنی حساس اور ناقابل تسخیر شخصیات اور اپنی قبولیت اور الوہی پیغام کی ثابت قدم اور بے باک تبلیغ کے ذریعے لوگوں کے ضمیروں کو ان کی روایتی حالت اطمینان سے جھنجوڑ کر ایک ایسی چوکسی کی حالت میں لے آتے تھے جہاں وہ صاف طور پر خدا کو بطور خدا کے اور شیطان کو بطور شیطان کے دیکھ سکتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے ابواب میں بار بار کہا، قرآن اس بات کو ایک عالمگیر فینامینا سمجھتا ہے: ساری دنیا میں خدا کے پیغمبر آتے رہے ہیں، چاہے قرآن نے ان کا نام لیا ہو، یا نہ لیا ہو (المومن ۴۰:۷۸، النساء ۴:۱۶۴) یہ پیغمبر یا رسول پہلے "اپنے لوگوں کی طرف" بھیجے جاتے ہیں لیکن جو پیغام وہ دیتے ہیں وہ صرف مقامی نہیں ہوتا۔ اس کی ایک عالمگیر اہمیت ہوتی ہے اور ساری انسانیت کو اسے ماننا پڑتا اور اس کی پیروی کرنی ہوتی ہے۔ پیغمبری کے ناقابل تقسیم ہونے کا یہی مطلب ہے۔

یہ لازمی امر ہے کہ پیغمبر کو اپنے لوگوں کی تائید ضرور حاصل ہونی چاہیے ورنہ اس کے پیغام کے لیے بہت کم امکان اس بات کا رہتا ہے کہ وہ دوسروں تک پہنچ سکے اور اگر یہ پہنچ بھی جائے تو ہو سکتا ہے کہ بہت حد تک اس کی شکل مسخ کر دی جائے۔ اس لیے پیغمبروں پر یہ ذمہ داری ڈالی جاتی ہے کہ اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہوں کریں۔ قرآن اکثر ایک مکالمے کا ذکر کرتا ہے جو قیامت کے روز پیغمبروں اور ان کے لوگوں کے درمیان سننے میں آئے گا "ہم یقیناً ان لوگوں سے پوچھیں گے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے تھے اور اسی طرح ہم پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔ پھر اپنے علم سے ان کے حالات بیان کریں گے (کہ ان کے درمیان کیا کچھ کھل کر سامنے آیا) اور ہم بھی غائب نہ تھے" (الاعراف ۷:۷) آنحضرتؐ سے زور دے کر کہا

جاتا ہے کہ وہ اپنے پیغام کا ''کھلے دل کے ساتھ'' اعلان کریں (الاعراف ۷:۱) اور اپنی بات ''علی الاعلان اور بغیر کسی کا لحاظ کیے ہوئے'' لوگوں تک پہنچائیں (الحجر ۱۵:۹۴، اسی طرح دیکھیے المائدہ ۵:۶۷ اور حضرت عیسیٰ کا اپنے لوگوں کے آمنے سامنے ہونا، المائدہ ۵:۱۱۶-۱۱۷) ہر امت سے ایک ''گواہ'' یعنی وہ پیغمبر جو ان کی طرف بھیجا گیا سامنے لایا جائے گا (النحل ۱۶:۸۴، ۸۹، القصص ۲۸، ۷۵) آنحضرتؐ اعلان کریں گے ''اے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا۔'' (الفرقان ۲۵:۳۰)

اسلام کے شروع زمانے سے مسلمانوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے پیغمبروں کے آنے کا یہ سلسلہ پیغمبر محمدؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ''محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں۔ لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور پیغمبروں کی مہر ہیں'' الاحزاب ۳۳:۴۰) یہ تعبیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک باہر کے آدمی کے لیے یہ اعتقاد تحکم کے زمرے میں آتا ہے اور عقلی توجیہ کا تقاضا کرتا ہے۔قرون وسطی کے مسلم مفکرین، متکلمین، فلاسفہ اور مورخین نے اس مقصد کے لیے متعدد دلائل مہیا کیے ہیں، جو زیادہ تر دو مختلف لیکن ملی جلی بنیادوں پر استوار ہیں: ایک یہ کہ مذہب میں ایک ارتقاء واقع ہوا ہے جس کی آخری شکل اسلام ہے دوسرے یہ کہ مذاہب میں شامل تعلیمات کا تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلام سب سے زیادہ کافی اور اکمل مذہب ہے۔ ایک موضوع جو بذات خود پیچیدہ اور متنوع ثبوت اپنے اندر رکھتا ہے۔

متعدد مسلم جدیدیت پسندوں نے جوش و خروش کے ساتھ یہ عقیدہ رکھا ہے کہ اسلام کی وجہ سے اور اس کی آسمانی کتب کی راہنمائی میں انسان عقلی پختگی کو پہنچ گیا ہے، اس لیے مزید وحی بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تاہم اس امر کے پیش نظر کہ انسان ابھی تک اخلاقی پراگندگی کا شکار ہے اور یہ کہ اس کے اخلاقی شعور نے سائنس میں اس کی ترقی کا ساتھ نہیں دیا جبھی یہ یکساں حالت میں اور بامعنی نہیں رہا (اس دلیل میں یہ بھی شامل کر لیا جائے کہ انسان کی اخلاقی پختگی مشروط ہے اس بات سے کہ وہ آسمانی کتابوں اور خصوصاً قرآن سے برابر ہدایت لیتا رہے) یہ ماننا پڑے گا کہ انسان ان معنوں میں پختہ نہیں ہو گیا کہ وہ الوہی ہدایت کے بغیر کام چلا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ الوہی ہدایت کی کافی سمجھ بوجھ کا انحصار اب ''منتخب'' شخصیات پر نہیں رہا، بلکہ اب یہ ایک اجتماعی وظیفہ ہو گیا ہے۔

آنحضرتؐ کے مشن کے آخری ہونے کے دعوے کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام کے بعد کوئی عالمی مذہبی تحریک ابھر کر سامنے نہیں آئی - یہ بات نہیں کہ اس کے دعوے دار نہیں رہے بلکہ یہ کہ کامیاب دعوے دار نہیں رہے- تاہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خدا کا آخری پیغمبر ہونا اور قرآن کا آخری وحی ہونا ان لوگوں پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دیتا ہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں- یہ دعویٰ اگر غور سے دیکھیے تو اتنا استحقاق نہیں جتنا ایک فریضہ ہے اس کے باوجود مسلمانوں نے اسے انعام واستحقاق سمجھ رکھا ہے-

خدا نے انسان کی طرف جو قاصد بھیجے قرآن ان کے لیے ''نبی'' اور ''رسول'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے- نبی یعنی ''خبروں کا دینے والا-'' اس کے معنی قرآن میں یہ نہیں ہیں (جیسا کہ اکثر انجیل میں ملتے ہیں) کہ ''وہ مستقبل کے متعلق خبریں دیتا ہے'' بلکہ یہ کہ ''وہ جو خدا کی خبر دیتا ہے'' وہ خدا کی طرف سے آتا ہے تا کہ برائی سے خبردار کرے اور ان لوگوں کو اچھی خبر دے جو اچھے کام کرتے ہیں- چنانچہ بشیر (اچھی خبریں دینے والا) اور نذیر (ڈرانے والا) کی اصطلاحیں قران میں، خصوصاً شروع کے زمانے میں، بار بار استعمال ہوتی ہیں- ''رسول'' کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں، وہ جسے خدا نے بنی نوع انسان کے پاس بھیجا ہو- اگر چہ قرآن میں، جیسا کہ ہم اسی باب میں دیکھیں گے، یہ لفظ کبھی کبھی وحی کے فرشتے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے- جسے خدا پیغمبر کے پاس بھیجتا ہے- روایتی طور پر قرآن کے مسلم مفسرین نے ان دونوں لفظوں کے درمیان یہ کہہ کر امتیاز کیا ہے کہ نبی کا مطلب ہے ایک الوہی سفیر بغیر کسی قانون کے، اور از راہ قیاس بغیر کسی کتاب کے، جبکہ رسول کے معنی ہیں وہ پیغامبر جس کے پاس قانون بھی ہو اور وحی کی ہوئی کتاب بھی!

اگر چہ اس طرح کے واضح امتیازات بعض اوقات اتنے قطعی نہیں رہتے، اس لیے کہ قران بعض مذہبی شخصیتوں کو نبی بھی کہتا ہے اور رسول بھی (الاعراف ۷:۱۵۸، مریم ۱۹:۵۱، ۵۴) تاہم کوئی شک نہیں کہ بعض موقعوں پہ یہ امتیاز جان بوجھ کر رکھا گیا ہے- مثال کے طور پر اس آیت میں کہ ''ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا-'' (الحج ۲۲:۵۲) یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ لفظ نبی کا استعمال مکہ کے آخری زمانے سے بڑھنے لگتا ہے اور مدنی دور تک رہتا ہے- مجموعی طور پر یوں سمجھیے کہ 'رسول' کسی ایسی ہستی کی علامت ہے جو 'نبی' سے زیادہ باوزن ہے- اس لیے کہ ایک نبی ایک رسول کا معاون ہو سکتا ہے جیسا کہ ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھے- (مریم

۱۹:۱ا،۵۲) اگر چہ ایک سے زیادہ رسول (یا ٹھیک طرح کہا جائے تو مرسلین) ایک ہی وقت میں بھیجے جا سکتے ہیں (یٰس ۳۶:۱۳،۱۶) اور اگر چہ پیغمبروں کے درمیان فرق قائم نہیں کیا جا سکتا (البقرہ ۲:۱۳۶) تاہم تمام پیغمبر برابر نہیں ہوتے اس لیے کہ ''ہم نے بعض رسولوں کو دوسروں پر فضیلت دی'' (البقرہ ۲:۲۵۳،اسی طرح دیکھئے بنی اسرائیل ۱۷:۵۵،اور آنحضرت کو تلقین کی جاتی ہے کہ ''جس طرح دوسرے عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں، اسی طرح تم بھی صبر کرو'' (الاحقاف ۴۶:۳۵)

سب سے مشہور و معروف پیغمبر وہ ہیں جن کی اپنی اور ان کی قوموں کی کہانیاں قرآن میں بار بار بیان کی گئی ہیں- ان میں انجیل کی شخصیات: حضرت نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام (مدین کے پیغمبر) ---- خاص طور پر پہلے چار---- شامل ہیں اور دو عربی تاریخ سے: قبیلہ ثمود سے صالح علیہ السلام اور عاد کے ہود علیہ السلام! دراصل عرب کے دو قدیم قبیلوں کو عرب 'العرب العاربہ' کہتے تھے جس کا مطلب ہے: اولین عرب- پیغمبروں کی یہ مخلوط تاریخ قیاس کہتا ہے، اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھی- اگر چہ یہ نہیں معلوم کہ وہ انہوں نے کہاں سے لی اور اس روایت کی تشکیل کا عرصہ کتنا ہے- لیکن اس روایت کا موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ عربوں نے پیغمبروں کی تاریخ کا ایسا علم حاصل کر لیا تھا جو انجیلی روایت سے الگ تھا- بڑے پیغمبروں کی تاریخ وار ترتیب، جیسا کہ سورہ اعراف ۷ اور سورہ ھود ۱۱ میں دیکھی جا سکتی ہے ____ جو ان کے احوال ایک ترتیب سے بیان کرتی ہیں، خصوصاً سورہ ھود میں تو ایک ترقی یافتہ اور خاص نمونے کا انداز ہے ____ یہ ہے: نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام (جن کے ہمعصر لوط علیہ السلام ہیں) شعیب علیہ السلام (جو ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام سے کوئی زیادہ دور نہیں رکھے گئے، ھود ۱۱:۸۹) موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام- حضرت نوح علیہ السلام کو چھوڑ کر دو عرب پیغمبر (یعنی صالح علیہ السلام اور ہود علیہ السلام) تمام انجیلی روایت سے زیادہ قدیم ہیں-

تمام پیغمبروں نے ایک ہی پیغام کی تبلیغ کی ہے: کہ خدا ایک ہے اور یکتا ہے- اسی کا حکم بجا لانا چاہیے اور اسی کی عبادت کی جانی چاہیے- اور انجام کار وہی ہے جس سے محبت کرنی چاہیے اور اسی سے ڈرنا چاہیے- دوسرے تمام ''جھوٹے خدا'' ہیں جو خدائی میں شریک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے- دوسری جتنی مخلوق ہے وہ خدا کی عبد ہے اور لازمی طور پر وہ اس کے حکم اور قانون کے

تابع ہے- یہ توحید کا قرآنی نظریہ ہے جسے ہم نے باب اول میں کھول کر بتانے کی کوشش کی ہے- پڑھنے والے کو تاکید کی گئی ہے کہ اس نظریئے کے معنی کو جو قرآن میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے جہاں تک ممکن ہو سمجھنے کی کوشش کرے، اس نظریئے کے بغیر اسلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا- لیکن یہ غیر مسلموں اور مسلموں دونوں کے ہاں بگڑ کر ایک میکانکی فارمولا بن کے رہ گیا ہے اور احساس کی گہرائی اور شدت تو ایک طرف رہی جو اس نظریئے کی تعلیم سے حاصل ہونی چاہیے، یہ بہت سا مافیہ بھی کھو چکا ہے- بدقسمتی سے غیر مسلموں کے لیے قرآن کی توحید کو ٹھیک طرح سے سمجھنے اور اس کی قدر پہچاننے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ گھڑا گھڑایا اعتقاد ہے کہ قرآن نے اسے یہودیوں سے لیا ہے- گویا کہ یہ بالکل غیر متعلق سی بات ہے کہ انسان توحید کی ایک صورت کا مطالعہ کرتا ہے یا دوسری صورت کا!

آنحضرتؐ تمام دوسرے پیغمبروں کی طرح بشیر (اچھی خبر سنانے والا) اور نذیر (ڈرانے والا) ہیں اور ان کا مشن یہ ہے کہ وہ باقاعدہ اور پیچھے ہٹے بغیر تبلیغ کرتے جائیں- چونکہ یہ پیغام خدا کی طرف سے ہے اور لوگوں کو سلامت رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے اس کی اشد ضرورت ہے، انسان کو چاہیے کہ اسے قبول کرے اور اس پر عمل کرے- چنانچہ ان کی تلقین کوئی رواجی قسم کا وعظ یا تقریر نہیں ہے، بلکہ اسے اہم اور ضروری پیغام لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنا ہوتا ہے- اگر پیغام قبول نہیں کیا جاتا اور مشن کامیاب نہیں ہوتا تو تبلیغ کرنے والے نے شاید اپنا فرض ادا کر دیا ہو، لیکن خدا یقیناً ناکام ہو جاتا ہے اور انسانیت اپنے بُرے انجام کو پہنچ جاتی ہے- لیکن اگر خدا کے مقاصد پورے نہیں ہوتے اور انسانیت بُرے انجام کو پہنچتی ہے تو ''کیا تبلیغ کرنے والے نے اپنا فرض ادا کر دیا؟'' اس کا فرض اللہ کے پیغام کو نافذ کرنے میں کامیاب ہونا ہوتا ہے تاکہ وہ روئے زمین پر اصلاح لا سکے اور اس میں فساد کا خاتمہ کر دے اور اخلاق پر منحصر ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کر دے جس میں ''معروف کا حکم دیا جائے گا اور برائی سے روکا جائے گا'' اور ''خدا کی حاکمیت کو سربلند رکھا جائے گا''

یہ رجحان، قرآن کے اندر بھی اور اس کے باہر بھی، آنحضرتؐ کے بنیادی اقدام اور اصل امنگ کی نمائندگی کرتا ہے- انہیں ہمیشہ حرکت میں رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے لوگوں کو الوہی پیغام قبول کرنے پر اکسا سکیں- ''اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ'' (الشعراء ۲۶:۲۱۴) قرآن انہیں صحیح حکمت عملی سمجھاتے ہوئے کہتا ہے- وہ ایسا ہی کرتے ہیں، لیکن دوسرے لوگوں کو متاثر

کرنے کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے- خاص طور پر قریش کے بزرگ مدبروں کی حمایت حاصل کرنے کا موقع، جو اگر ان کے نصیب العین کی طرف آ جائیں تو ان کے حق میں سارے حالات بدل سکتے ہیں- وہ ایک ایسے پیغام بر ہیں جو بے تحاشا جلدی میں ہیں کیونکہ وہ اپنے معاشرے کو ایک مایوس کن صورت حال میں دیکھ رہے ہیں ''دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں'' (المزمل ۷۳:۷) قرآن ان سے کہتا ہے ''اور ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں'' (المزمل ۷۳:۵) اس لیے پیغمبر کو چاہیے کہ ''وہ رات کو---سوائے اس کے ایک تھوڑے حصے کے---نماز میں کھڑے رہا کرے'' (المزمل ۷۳:۲) یہ ''بھاری کلام'' اس بوجھ کی جگہ لے لیتا ہے ''جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی'' (الانشراح ۹۴:۲-۳) یعنی ان کے معاشرے میں خصوصاً اور انسانی معاشرے میں عموماً جو سنجیدہ مسائل تھے ان کا تکلیف دہ احساس اور غار حرا میں جا کر عبادت اور غور وفکر کے ذریعے ان کا حل تلاش کرنا- ''اور اس نے تمہیں ناواقف راہ پایا، تو تمہیں سیدھے راستے کی طرف موڑ دیا'' (الضحیٰ ۹۳:۷)

خدا کے پیغام کو آگے پہنچانے کی ان تھک کوشش میں پیغمبر کو ایک دفعہ قرآن نے تنبیہ بھی کی- وہ یوں کہ جب وہ مکہ کے ایک با اثر سردار ولید بن مغیرہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے تو ان کے پاس ایک نابینا ابن ام مکتوم، جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا آیا اور ان سے کوئی سوال کیا- پیغمبرؐ اس دخل اندازی پر برافروختہ سے ہو گئے اور اس نابینا آدمی کی طرف توجہ نہ کی- اس پر قرآن نے کہا:

> ''وہ ترش ہوا اور بے رخی برتی، اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا- اور (اے محمدؐ!) تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکیزگی حاصل کرے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے مفید ہو- جو شخص بے پروائی کرتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے- اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے، اور وہ خدا سے ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رخی برتتے ہو- ہرگز نہیں یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے! جس کا جی چاہے اسے قبول کرے- یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں (یعنی وحی کے فرشتوں کے ہاتھوں میں) (عبس ۸۰:۱-۱۵)

اس مضطرب اور مسلسل حرکت پذیر مہم نے بعض ایسے جاں نثار پیروکاروں کو اپنی طرف کھینچا، جو اکثر نچلے اور رائے دہی کا حق نہ رکھنے والے طبقے سے تعلق رکھتے تھے- لیکن ان میں سے کچھ لوگ کھاتے پیتے تاجروں اور دینی اعتبار سے حساس شخصیات میں سے بھی تھے، جن میں سے بعض پہلے ہی روحانی ہیجان اپنے اندر محسوس کر رہے تھے- لیکن چونکہ محمدؐ کا پیغام مکہ کے تاجر امراء کے مفادات کے لیے بظاہر خطرہ تھا---- اقتصادی میدان میں بھی اور مذہبی دائرے میں بھی--- ان میں سے اکثر نے اسے رد کر دیا- اور اس پیغام کی کھلم کھلا تبلیغ کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا جانے لگا-

نئی امت میں کمزور طبقے خاص طور پر آزمائشوں اور دباؤ کے حربوں کا شکار بنے، نئے پیغام نے بہت سے حالات میں خاندانوں کو بھی تقسیم کر دیا اور بھائی کو بھائی کے خلاف اور بیٹے کو باپ کے خلاف کھڑا کر دیا، جو کہ عربوں کے قبائلی معاشرے میں سب سے تباہ کن چیز تھی، اس لیے کہ ان کے اتحاد کی بنیاد ہی خون کے رشتوں اور الحاق کے معاہدوں پر تھی- جوں جوں یہ کشمکش بڑھتی گئی، اہل مکہ زیادہ پریشان اور متفکر ہونے لگے اور انہوں نے آنحضرتؐ کے چچا ابو طالب کو، جنہوں نے اپنے بھتیجے کا پیغام قبول نہیں کیا تھا، البتہ اسے حفاظت دے رکھی تھی، اس بات پر اکسایا کہ یا تو وہ محمدؐ کو اس کام سے باز رکھیں یا پھر ان سے اپنی حمایت واپس لے لیں- تاہم بار بار کی جانے والی یہ تمام کوششیں ناکام ہو گئیں-

بعض اوقات یہ صورت حال قدرتی طور پر پیغمبرؐ کی اپنی اندرونی زندگی کو متاثر کرتی تھی اور انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ اس ساری کوشش کا کوئی فائدہ بھی ہے، یا ان کی کامیابی کے کوئی واقعی امکانات ہیں- ایک طرف تو یہ کامل ایمان تھا کہ پیغام خدا کی طرف سے ہی ہے اور انہیں اس کو پہنچانا اور منوانا چاہیے، ورنہ ان کا پورا معاشرہ تباہ ہو کے رہے گا- دوسری طرف اصل صورت حال اتنی حوصلہ شکن اور کامیابی کے امکانات اتنے مشکوک تھے کہ اگر کسی مخمصے کے واقعی سینگ ہوتے تو یہ مخمصہ واقعی اسی طرح کا تھا- ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرتؐ کوئی جارحانہ مزاج نہیں رکھتے تھے، نہ وہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے والے تھے- بلکہ ان کے کردار کے دقیق مطالعے سے ایک طبعاً سوچ میں رہنے والا، دور بیں، شرمیلا اور الگ تھلگ رہنے والا انسان سامنے آتا ہے جس میں اس وقت کی انسانی صورت حال نے ایسا اندرونی جوش اور ولولہ پیدا کیا جس نے اس کو تاریخی عمل کے عرصۂ کارزار میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا- اس سے یہ بات سمجھ

میں آتی ہے کہ قرآنی سورتوں میں، خاص طور پر ابتدائی زمانے میں، سٹا کیٹونی طرز کا (Staccato-like) ناگہانی پن ہے اور ان میں بہت چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ کوئی آتش فشاں اچانک پھٹ رہا ہے یا ایک بڑا دریا کسی گھاٹی میں سے گزر رہا ہے۔ وحی کا فرشتہ سیدھا محمدؐ کے دل سے خطاب کرتا تھا۔

تناؤ کے ان غیر معمولی حالات میں قرآن مختلف صورتوں میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ اہل مکہ کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کو کوئی سمجھ نہیں ہے۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے (البقرہ ۲:۸، ۱۸، ۱۷۱، الانعام ۶:۳۹، الانفال ۸:۲۲، یونس ۱۰:۴۲، النمل ۲۷:۸۰) اور انہی معنی میں دوسرے ڈرامائی کلمات (مثلاً سورہ یٰس ۳۶:۸-۹) ''یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے'' (الاعراف ۷:۱۷۸) ''ہم نے بہت سے انسان اور جن دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں'' (الاعراف ۷:۱۷۹) قرآن کے لیے اظہار کا ایک دوسرا وسیلہ جاہلی مکہ کی صورت حال کا اگلے پیغمبروں کی قوموں اور آبادیوں کے ساتھ موازانہ کرنا ہے، جو اپنے انجام کو پہنچے جب انہوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت کے مطابق اپنے طور طریقوں کو بدلنے سے انکار کر دیا۔

ایک تیسرا اہم طریقہ مایوسی، کوفت اور ظاہری بے بسی کی اس مزاجی کیفیت سے نمٹنے کا وہ تسلی و تشفی ہے جو قرآن دیتا ہے ''ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ'' (طٰہٰ ۲۰:۲) ''اچھا تو اے محمدؐ شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے'' (الکہف ۱۸:۶) اسی طرح مدینے میں ''تو تم ان نافرمان لوگوں کے حال پر افسوس نہ کرو'' یا ''ان کافروں کے حال پر افسوس نہ کرو'' (المائدہ ۵:۲۶، ۶۸) مکہ کے آخری دور میں حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: ''اے قوم! میں نے تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور تمہیں متنبہ بھی کر دیا، اب میں اس قوم پر کیوں افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے'' (الاعراف ۷:۹۳) آنحضرت کو بتایا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک ''خبردار کرنے والے'' ہیں ایک ''یاد دلانے والے''، ''تمہارا کام صرف دعوت دینا ہے''، ''تم ان پر کوئی داروغہ نہیں ہو''، ''تم ان کو مجبور نہیں کر سکتے''، ''بے شک اللہ جسے چاہتا ہے سنواتا ہے، مگر اے نبی! تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں (ھود ۱۱:۱۲، الغاشیہ ۸۸:۲۱، آل عمران ۳:۲۰، المائدہ ۵:۹۲، ۹۹، الغاشیہ ۸۸:۲۲، ق ۵۰:۴۵، الفاطر ۳۵:۲۲) ''اگر خدا ایسا چاہتا

تو تم سب کو ہدایت دے کر ایک امت بھی بنا سکتا تھا'' (المائدہ ۵:۴۸، الانعام ۶:۳۵، یونس ۱۰:۹۹) غیر معمولی برہمی کے لمحوں میں قرآن پیغمبر سے کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اور اپنے طور طریقے نہیں بدلتے تو ان کا انجام بہت برا ہو گا، خواہ ان کے سامنے یا ان کے موت کے بعد! ''جن برے نتائج سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں، ان کا کچھ حصہ ہم تمہیں جیتے جی دکھا دیں گے یا اس سے پہلے ہی تجھے اٹھا لیں گے'' (یونس ۱۰:۴۶، اور اسی رو میں الرعد ۱۳:۴۰، المومن ۴۰:۷۷، الزخرف ۴۳:۴۱-۴۲)

لیکن یہ لمحے گزر جاتے ہیں، اور خدا کے مقصد کی ناگزیر کامیابی کا بنیادی ولولہ اور حق کا ثبوت اپنے آپ کا پھر سے یقین دلاتے ہیں- الوہی مدد اور آخری فتح خدا کے پیغمبروں کی ہوتی ہے اور ان لوگوں کی جو ان کی حمایت کرتے ہیں- ''ہم اپنے پیغمبروں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں- دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے'' (المومن ۴۰:۵۱) سورہ انبیاء میں، جو پہلے زمانے کے پیغمبروں کے احوال میں ہے، ایک کے بعد دوسرے پیغمبر کا نام لیا جاتا ہے اور اس کی حمایت کا حال بتایا جاتا ہے- حضرت نوح علیہ السلام (جن سے پیغمبروں کے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے) کے متعلق کہا جاتا ہے: ''ہم نے ان کی مدد کی ان لوگوں کے خلاف جو ہماری نشانیوں کی تکذیب کرتے تھے'' (الانبیاء ۲۱:۷۷) اسی طرح موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کی بابت کہا گیا ''ہم نے ان کی مدد کی اور وہی غالب ہو گئے'' (الصافات ۳۷:۱۱۶)

پہلے پیغمبر مایوسی اور عاجزی کے اسی طرح کے حالات سے گزرے تھے، یہاں تک کہ وہ پکار اٹھے ''اللہ کی مدد کب آئے گی؟ تو سن لو کہ خدا کی مدد آیا چاہتی ہے'' (البقرہ ۲:۲۱۴) خدا کی مدد کا انحصار یقیناً پیغمبر کی اور اس کے پیروکاروں کی کوشش پر ہے جو کہ ان کی طرف سے گویا خدا کی مدد کرنا ہے (قرآن اس باہمی مدد کا بار بار ذکر کرتا ہے، مثلاً دیکھئے محمد ۴۷:۷، الحج ۲۲:۴۰) لیکن انجام کار فتح انہی کی ہوگی- ''یہ خدا کی جماعت ہے جو غالب ہوگی'' (الصافات ۳۷:۱۷۳، المائدہ ۵:۵۶) اور جب فتح آنی شروع ہوئی تو قدرتی طور پر اسے پیغمبر کے مشن کی کامیابی کا ثبوت اور پوری کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا گیا (کیونکہ اگر بظاہر بے چارگی کی حالت میں خدا نے آخر میں کامیابی اور تائید کا وعدہ کیا تھا، تو اس امر کا زیادہ جواز بنتا ہے کہ ایک کامیابی کو بعد کی کامیابیوں کا نمونہ یا مثال قرار دیا جائے) نقطہ عروج اس آیت میں بیان ہوتا ہے ''یہ (کفار) چاہتے ہیں کہ خدا

کے نور کو اپنے منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں، لیکن خدا اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں، اگر چہ کافروں کو برا ہی کیوں نہ لگے" (التوبہ ۹: ۳۲ اسی طرح الصف ۶۱: ۸)

بدی پر نیکی کی آخری فتح کے متعلق اس بنیادی فکری رویے کی بدولت ہی قرآن بار بار حضرت نوح علیہ السلام کی براءت اور تائید کا ذکر کرتا ہے، جنہیں سیلاب سے بچا لیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتا ہے جنہیں آگ سے محفوظ رکھا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتا ہے جنہیں فرعون اور اس کے لشکر سے نجات دی گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتا ہے جنہیں یہودیوں کے ہاتھوں مصلوب ہونے سے بچا لیا گیا (اسی لیے قرآن صلیب پر چڑھائے جانے والے قصے کو نہیں مانتا) چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی اسی طرح سے نصرت وتائید کی جائے گی- وہ نہ صرف بچا لیے جائیں گے بلکہ ان کا پیغام کامیاب ہوگا- اس لیے انہیں اپنے پیغام کا زور سے اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اعلان کرنا چاہیے- اگر چہ وہ اپنے مزاج میں پر حجاب اور عزلت پسند ہیں اور پیغام ان کا انقلابی ہے- "پس تم کو جو حکم خدا کی طرف سے ملا ہے اسے علی الاعلان کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروانہ کرو" (الحجر ۱۵: ۹۴) "یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے پس اے محمد! تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو- اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے منکرین کو ڈراؤ" (الاعراف ۷: ۲) "اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ ان لوگوں تک پہنچا دو- اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم اس کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے، اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے" (المائدہ ۵: ۶۷)

آخر میں، اسی انداز کی وہ آیات، اور وہ واقعات ہیں جن میں رسولؐ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی طرح کی مفاہمت کا سوچا تھا جس کے لیے اس کے مخالفین زور دینے لگے تھے- یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ اپنے مشن میں بہت سنجیدہ ہے- اہل مکہ کے دباؤ اور اپنے محافظ چچا ابوطالب کی درخواستوں کے نتیجے میں اس کا میلان سمجھ میں آتا ہے- خاص طور پر جب ان مصائب کا سوچیں جو اس کی تحریک نے بہت سے خاندانوں کے لیے پیدا کر دیئے تھے، اور اس کے مزاج کی حساسیت اور اس کے اندر کی رحمدلی کو سامنے رکھیں جس کی قرآن بھی بہت کھل کر گواہی دیتا ہے "تم اپنے رب کے فضل سے کوئی مجنون نہیں ہو، اور تمہارے لیے تو کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے، اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو" (القلم ۶۸: ۲-۴) "ہم نے تمہیں تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے" (انبیاء ۲۱: ۱۰۷) اگر چہ آپؐ جنگ احد کی شکست پر دل گرفتہ تھے جو

آپ کے صحابہ کی واضح غلطی کی وجہ سے ہوئی تھی- آپ نے فیاضی برتتے ہوئے انہیں معاف کر دیا اور قرآن نے اس پر کہا: ''اے پیغمبر! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جائے-'' (آل عمران ۳:۱۵۹)

اس طرح کی مفاہمت اور مصالحت کے لیے اہل مکہ بار بار کوشش کرتے تھے-

''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کرو تو یہ بھی نرم ہو جائیں'' (القلم ۶۸:۹)

''قریب تھا کہ یہ لوگ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی، تا کہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو- اگر تم ایسا کرتے تو وہ تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے تو تم ان کی طرف کسی قدر مائل ہونے ہی لگے تھے- اگر ایسا ہو جاتا تو ہم تمہیں زندگی میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا- پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے-'' (بنی اسرائیل ۱۷:۷۳-۷۵)

اوپر کی یہ آیتیں پیغمبر کو مکہ سے نکالنے کے ایک منصوبے سے جڑی ہوئی لگتی ہیں، جیسا کہ اس کے فوراً بعد کی آیت سے ظاہر ہے (بنی اسرائیل ۱۷:۷۶) ''اور قریب تھا کہ یہ لوگ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں- اگر یہ ایسا کرتے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ رہ سکتے'' (پیغمبر کو قتل کرنے کے اور اس کے علاوہ دوسرے منصوبے بھی تھے، مثلاً زندہ جلا دینے کا (الانبیاء ۲۱:۶۸، العنکبوت ۲۹:۲۴) یا پتھر مار مار کر ہلاک کرنے کا (الکہف ۱۸:۲۰، یٰس ۳۶:۱۸) یا انہیں نیند میں قتل کر دینے کا (النمل ۲۷:۴۹) کیونکہ یہ ایک یقینی بات ہے کہ آنحضرت کی اپنی صورت حال کا عکس اکثر اگلے پیغمبروں کے حالات میں ملتا ہے- ان منصوبوں کی پیغمبر کے سوانح نگاروں نے تصدیق کی ہے) آگے قرآن اسی رو میں کہتا ہے:

''اور تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی کوئی رسول ایسا بھیجا ہے، نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ پیش نہ آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا- اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے

اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے اللہ علیم ہے اور حکیم'' (الحج ۲۲:۵۲)

''اور کہیں ایسا تو نہیں کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں، اور اس بات پر دل میں تنگی محسوس کرتے ہو کہ وہ کہیں گے ''اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا، یا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا'' (ھود ۱۱:۱۲)

لیکن مفاہمت کے کیسے ہی اندیشے یا خیالات پیغمبر کے ذہن میں آتے، خدا فوراً ان کی تنسیخ کر دیتا یا انہیں مٹا دیتا۔

قرآن کہتا ہے:

''ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی دوسری آیت بھیج دیتے ہیں'' (البقرہ ۲:۱۰۶)

''خدا جن (آیات) کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جن کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے، اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے'' (الرعد ۱۳:۳۹)

''اور جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔ اور خدا جو کچھ نازل فرماتا ہے اسے خوب جانتا ہے۔ تو وہ (کافر) کہتے ہیں کہ تم تو اپنی طرف سے بنا لاتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر نادان ہیں۔'' (النحل ۱۶:۱۰۱)

قرآن کے نزدیک یہ نہ کوئی عجیب بات ہے، نہ دستور کے خلاف اور نہ قابل الزام کہ ایک پیغمبر بطور ایک انسان کے ہمیشہ ایک سا نہ رہے۔ تاہم وہ بطور انسان کے ہی بنی نوع انسان کے لیے مثال بنتا ہے، اس لیے کہ اس کے کردار کی اوسط سطح اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کے لیے ایک قابل قدر نمونہ بن سکتا ہے۔ پیغمبر انسان ہوتے ہیں اور وہ مستقل اندرونی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں لیکن اس اندرونی کشمکش میں بالآخر سچائی اور پارسائی غالب آتی ہے۔ اگر پیغمبر جدوجہد نہ کرتے اور اندرونی مشقت برداشت نہ کرتے تو وہ دوسرے انسانوں کے لیے مثال نہ بن سکتے (محمدؐ اور دوسرے پیغمبروں کی انسانی صفت کے بارے میں مثال کے طور پر دیکھئے آل عمران ۳:۷۹، ابراہیم ۱۴:۱۱، الکہف ۱۸:۱۱۰، الانبیاء ۲۱:۳۴، حم السجدہ ۴۱:۶، بنی اسرائیل

۱۷:۹۳،۹۴) ہمیں بتایا جاتا ہے (البقرہ۲:۲۶۰) کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو تمام پیغمبروں کے لیے مثال تھے، خدا سے کہا: ''اے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا'' اور جب خدا نے ان سے پوچھا: ''کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟'' تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: ''کیوں نہیں، لیکن میں یہ اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے'' اسی طرح ابراہیم علیہ السلام فلکیاتی خداؤں کو ایک ایک کر کے چھوڑتے ہوئے بالآخر خدائے واحد تک پہنچتے ہیں (الانعام۶:۷۷-۸۰) یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ ایک انسان جو خدا ہے یا جو خدا بن جاتا ہے وہ قرآن کے لیے ملعون و مردود ٹھہرتا ہے- کوشش کرنا اور کامیاب ہو جانا- کامیابی کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہوئے- یہ ایک خدا کے بندے کی بڑی نشانی ہے-

ہم بعض آیات کے بدل دیئے جانے کے موضوع کی طرف واپس آتے ہیں- یہ قرآن میں ''نسخ'' کے اصل معنی ہیں- اس کا مطلب نسخ کا وہ فقہی عقیدہ نہیں ہے جو اسلام میں آگے چل کر صورت پذیر ہوا اور جو بعض آیات کے مطالب میں ظاہری اختلافات کو مٹانے کی ایک کوشش ہے- ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے حکم پر یعنی وحی کے ذریعے بعض آیات کی جگہ دوسری آیات لائی گئیں- قرآن اس امر کو واضح کرتا ہے کہ جب اہل مکہ نے پیغمبر سے کہا کہ قرآنی عقیدے میں کچھ ردوبدل کر دیں تا کہ وہ اسے قبول کر سکیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ خدا ہی کر سکتا ہے وہ نہیں کر سکتے-

> ''جب ہماری آیات انہیں صاف صاف انداز میں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے (روز قیامت) ملنے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کی بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں کوئی تبدیلی کر لو- اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل کر لوں- میں تو بس اسی وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس آتی ہے- اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے- اور کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سنا سکتا- نہ خدا تمہیں اس سے واقف کرتا- آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے!'' (یونس۱۰:۱۵،۱۶)

قرآن میں اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ جہاں پیغمبر بعض اوقات ضرور یہ چاہتے

تھے کہ حالات ایک خاص رخ اختیار کریں، وہیں خدا کی وحی ایک دوسرا راستہ اختیار کرتی تھی۔ ''اے نبی! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کا جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ اس لیے جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو تم اس کی قرات کو غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمے ہے۔'' (القیامہ ۷۵:۱۶-۱۹)

یہ امر آنحضرتؐ نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ پیغمبر بن جائیں گے، نہ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کیا تھا، اس کا اظہار بھی متعدد سورتوں میں ہوا ہے:

''اے پیغمبر! جس خدا نے قرآن کے احکام کو فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک اچھے انجام کو پہنچانے والا ہے۔ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔ تمہیں کبھی یہ امید نہیں تھی کہ یہ کتاب تم پر نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے ہوا ہے۔'' (القصص ۲۸:۸۵-۸۶)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تم اس سے پہلے نہ تو یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسے ایسا نور بنا دیا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں۔'' (الشوریٰ ۴۲:۵۲)

''اے نبی! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک میں پڑ سکتے تھے۔'' (العنکبوت ۲۹:۴۸)

یہ بات یقینی ہے کہ محمدؐ کا دینی تجربہ اچانک تھا، یوں جانو جیسے ایک مردہ انسان یک لخت زندہ ہو جائے ''بھلا پہلے جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی کر دی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہوا ہے اور ان سے نکل نہیں سکتا۔'' (الانعام ۶:۱۲۳)

جیسا کہ ہم نے باب دوم اور چہارم میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے، قرآن ساری دنیا کے فینامینا کو بیان کرنے کے لیے نیچرلسٹ اور مذہبی دونوں طرح کے محاورے استعمال کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان تضاد کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برخلاف مذہبی محاورہ نیچرلسٹ

طرز اظہار کا پہلے سے اندازہ لگالیتا ہے اور اسے اکھاڑ کر الگ کرنا تو کجا وہ اسے اپنے اندر سمو لیتا ہے- ہوائیں اور بادل ضرور بارش لے آتے ہیں لیکن یہ خدا ہی ہے جو بارش برساتا ہے اور جو قدرتی اسباب کے اندر رہ کر کام کرتا ہے- جب قدرتی سلسلہ علت و معلول کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں تو مذہبی محاورہ آخری اور قطعی ہوتا ہے- اس لیے ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ نیچرلسٹ مفہوم میں محمدؐ نے ضرور اپنے آپ کو پیغمبری کے لیے تیار کیا (اگرچہ شعوری طور پر نہیں) اس لیے کہ انسان کو جن اخلاقی مسائل کا سامنا تھا ان کے لیے ان کے اندر ایک شدید قدرتی اور پیدائشی حساسیت پائی جاتی تھی- یہ حساسیت زندگی میں اتنا جلد یتیم ہو جانے سے اور بھی بڑھ گئی- قریش کا قبیلہ مکہ میں سب سے زیادہ طاقتور تھا- اس نے پہلے تو ان کی شدت سے مخالفت کی، لیکن جب یہ قبیلہ آگے چل کر آپ کے حق میں ہو گیا تو اسلام صحیح معنوں میں ایک عالمی سطح پر آ گیا-

یہ سارا نیچرلسٹ بیان صحیح ہے- تاہم پیغمبرؐ نے اپنے اندر اتنی ہی قدرتی صلاحیتیں بیدار کی تھیں جتنا کہ کوئی دوسرا فرد کرتا- اس لیے جب تمام قدرتی عوامل باہم مل کر ایک ہی توانا انجام کی طرف جائیں، تو ان کا ماخذ خدا کو ہی سمجھنا چاہیے- اس کے علاوہ جیسا کہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں محمدؐ نے کوئی شعوری کوشش پیغمبر بننے کی نہ کی اور نہ اس کی خواہش رکھی ''اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ کتاب تمہیں سناؤں تو میں کبھی نہ سنا سکتا تھا'' (یونس ۱۰:۱۶) اس وجہ سے جب محمدؐ کے مخالفین نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کیوں پیغمبر بن گئے ہیں اور ''کیوں یہ قرآن دو شہروں (مکہ اور طائف) میں سے کسی ایک کے بڑے آدمی پر نہ اتارا گیا'' (الزخرف ۴۳:۳۱) تو قرآن اس پر دونوں طرح کے جواب دیتا ہے ''کیا یہ لوگ ہیں جو تمہارے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟'' (الزخرف:۳۲) جو ایک مذہبی محاورے میں ادا کیا گیا ہے اور ''خدا سب سے بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کسے عنایت کرے-'' (الانعام ۶:۱۲۵) جو ایک کائناتی محاورے میں ڈھلا ہوا ہے- آنحضرتؐ خود اس امر سے ہمیشہ پوری طرح آگاہ تھے کہ ان کی پیغمبری ان کی اپنی لائی ہوئی نہیں تھی اور یہ کہ ان کی قدرتی صلاحیتیں بھی وحی کا سبب نہیں بن سکتی تھیں، جو صرف خدا کی رحمت ہی تھی ''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے، اگر اللہ چاہے تو (اے محمدؐ!) تمہارے دل پر مہر کر دے'' (الشوریٰ ۴۲:۲۴) پھر قرآن کہتا ہے ''اگر ہم چاہیں تو جو وحی ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے اسے محو کر دیں، پھر تم اس کے لیے ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاؤ گے'' (بنی اسرائیل ۱۷:۸۶)

پیشتر اس سے کہ ہم آنحضرتؐ کے الہامی تجربے کی نوعیت اور کیفیت اور خود قرآن کے بارے میں بات شروع کریں، ہمیں مشہور واقعہ معراج پر گفتگو کرنی چاہیے جو روایت کے مطابق مکی دور کے آخری دنوں میں اور پیغمبر کی مدینہ کو ہجرت سے ذرا پہلے پیش آیا-قرآن میں اس تجربے کا، بلکہ دو تجربوں کا--- بہت مفصل بیان ملتا ہے-

''اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحب حکمت ہے، وہ سامنے آ کھڑا ہوا، جبکہ وہ بالائی افق پر تھا پھر وہ قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا- پھر اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو بھی پہنچانی تھی-نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا-اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے- اس نے دوسری دفعہ بھی دیکھا تھا جب وہ اترا، سدرۃ المنتہی کے پاس، جہاں قریب ہی جنت الماویٰ ہے-اس وقت بیری کے درخت پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا- پیغمبر کی آنکھ نہ چندھیائی، نہ حد سے متجاوز ہوئی، اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں-'' (النجم ۵۳:۵-۱۸)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ (۱) ان میں دو مختلف وقتوں کے تجربات کا حوالہ ہے (۲) ان میں سے ایک تجربے میں پیغمبر نے وحی کے فرشتے کو ''سب سے اونچے افق'' پر دیکھا تھا- اور اس کے پاس غیر معمولی، تقریباً کچل دینے والی طاقت تھی- جبکہ اس سے پہلے کے موقع پر اس نے اس کو سدرۃ المنتہی (سب سے دور کھڑی بیری) پر دیکھا تھا جہاں جنت الماویٰ (ٹھکانے کا باغ) واقع ہے (۳) بجائے اس کے کہ پیغمبر ''چڑھائی'' میں اوپر جاتے، دونوں حالات میں وحی کا فرشتہ نیچے آیا (۴) یہ تجربہ روحانی تھا، جسمانی اور متحرک نہیں تھا اور انہوں نے جو کچھ دیکھا ان کے دل نے اس کے بارے میں جھوٹ نہیں بولا (۵) آخر میں یہ کہ ان مکاشفاتی (revelatory) تجربوں سے پیغمبر کی ذات کی توسیع وابستہ تھی- جس کے ذریعے انہوں نے تمام حقیقت کا احاطہ کر لیا تھا اور جو اپنے پورے پھیلاؤ میں مکمل تھی- ان دونوں واقعات میں حوالہ ایک آخری اور قطعی چیز کا ہے، چاہے وہ سب سے ''بلند افق'' ہو یا سب سے دور کھڑا ''بیری کا درخت!''

اس آخری نکتے کی تصدیق دو دوسری متعلقہ آیات سے ہوتی ہے:

"پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے دور کی اس مسجد تک لے گئی جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔" (بنی اسرائیل ۱۷:۱)

"یہ فی الواقع ایک معزز پیغام بر کا قول ہے جو بڑی توانائی رکھتا ہے، عرش والے کے ہاں اس کا ٹھکانا ہے، وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے، وہ بااعتماد ہے۔ اور (اے اہل مکہ) تمہارا رفیق مجنون نہیں ہے۔ اس نے اس پیغام بر کو روشن افق پر دیکھا ہے اور وہ غیب کے اس علم کو لوگوں تک پہنچانے میں بخیل نہیں ہے۔" (التکویر ۸۱:۱۹-۲۴)

پہلی نص کی طرح یہ دو آیات بھی پیغمبر کے تجربے میں آنے والی کسی آخری اور انتہائی چیز کا ذکر کرتی ہیں: پہلی آیت میں "دور کی مسجد" اور دوسری میں "روشن افق"۔ یہ آخری آیت، آیات کے ان تین ٹکڑوں میں پہلے ٹکڑے کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ وہ یوں کہ دونوں میں وحی کے وسیلے کو ایک طاقتور ہستی بتایا گیا ہے اور "افق" کو تجربے کا آخری مقام کہا گیا ہے۔ ان دو تجربوں کے علاوہ ہوسکتا ہے دوسرے تجربے بھی ہوئے ہوں، اس لیے کہ دور افتادہ مسجد جو ایسی آیت میں بیان ہوئی ہے جو غالباً ان تینوں ٹکڑوں میں سب سے آخر میں نازل ہوئی تھی اس کا ذکر پہلے دو ٹکڑوں میں نہیں ہے۔ چونکہ تجربے اپنی نوعیت کے اعتبار سے روحانی ہیں، ان آیات میں جن چیزوں یا ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی قدرتی طور پر مادی نہیں ہوسکتیں، اگرچہ یہ ضرور خیال رہے کہ جب ایک روحانی تجربہ بڑی شدت کا ہو، جس میں موضوع اور معروض کے درمیان فاصلہ تقریباً ختم ہو کے رہ گیا ہو، "آوازیں"، "سنی" جاتی ہیں اور "صورتیں"، "دیکھی" جاتی ہیں اور اندرونی تجربہ ایک طرح کی ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہم ابھی دیکھیں گے کہ اگرچہ نزول وحی کا عام تجربہ جو پیغمبر کو ہوتا تھا وہ "دل" کا معاملہ تھا، لیکن یہ تجربہ اپنے آپ الفاظ کی صورت اختیار کر لیتا تھا، جیسا کہ بڑی شدت والے تمام روحانی تجربوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

پیشتر اس سے کہ ہم روح یا وحی کے اس ذریعے پر جو آنحضرتؐ پر اترتا تھا، تفصیل میں گفتگو کریں، بہتر ہوگا کہ ہم ان الزامات کی نشاندہی کر لیں جو ان پر ان کے مخالفین کی طرف سے لگائے جاتے تھے۔ ان کو بعض اوقات کاہن کہا جاتا تھا (الطور ۵۲:۲۹، الحاقہ ۶۹:۴۲) قبل از اسلام عرب میں اس پیشے کے ارکان سے لوگ بعض اہم معاملات پر الہامی قسم کے بیانات طلب کرتے تھے

(قرآن تو اسے رد ہی کرتا ہے) زیادہ تر انہیں شاعر کہا جاتا تھا (یٰس ۳۶:۶۹، الانبیاء ۲۱:۵، الصافات ۳۷:۳۶، الطور ۵۲:۳۰، الحاقہ ۶۹:۴۱) بہت سے عرب یہ سمجھتے تھے کہ ایک شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس پر کوئی روح آئی ہوتی ہے، اس روح کی ٹھیک ٹھیک نوعیت معلوم نہیں، لیکن اس کے پیچھے غالباً شعور کا کوئی اضطراب یا فوق الفطری شعور کا حائل ہو جانا کارفرما ہوتا ہے (شعور کے مادہ کے معنی ہیں: عام معاملات سے ماوراادراک یا آگاہی) قرآن اس کا سختی سے انکار کرتا ہے اور شاعروں پر تنقید کرتا ہے:

''ہم نے اسے شعر کہنا نہیں سکھایا، نہ یہ اس کے شایاں ہے- یہ تو محض نصیحت اور صاف صاف قرآن ہے (یٰس ۳۶:۶۹)

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟ وہ ہر جعل ساز بدکار پر اترا کرتے ہیں- وہ انہیں غور سے سنتے ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں- رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلتے ہیں- کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور ایسی بات کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں ہیں- سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے-'' (الشعراء ۲۶:۲۲۱-۲۲۷)

''ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں'' میں غالباً بے لگام اور غیر محدود شاعرانہ تخیل کی طرف اشارہ ہے، اور اس طرف بھی کہ جاہلی شعرا اپنی جنسی آزادی کا بے جھجک راگ الاپتے تھے- چنانچہ یہ آیات تمام شاعری کی مذمت نہیں کرتیں بلکہ صرف بے مہار تخیل کو برا کہتی ہیں- قرآن خود بہت شاعرانہ ہے، خاص طور پر اپنے چمکیلے اور طاقتور اسلوب بیان میں، اور اپنی صورت گری کی ماہرانہ فنکاری اور اظہاریت میں! لیکن یہ اس طرح کی شاعری نہیں ہے جسے کفار اس کے لیے مذموم سمجھتے تھے-

ان الزامات کے علاوہ کہ وہ کاہن یا شاعر تھے (جو قرآن میں مذکورہ تمام انبیاء میں صرف محمدؐ ہی پر لگائے گئے) ان کو ساحر بھی کہا گیا یا سحر کا شکار (مسحور)، ایسا آدمی جس میں ایک بدروح سمائی ہوئی تھی (مجنون) ان میں سے آخری دو الزام آنحضرتؐ پر لگائے جانے کے علاوہ قدیم انبیاء پر بھی ان کے لوگوں نے لگائے تھے (الذاریات ۵۱:۵۲) فرعون نے خاص طور پر حضرت موسیٰ کو ایک جادوگر کہا (اسی طرح ایک دفعہ بدروح کا شکار یعنی مجنون بھی) (الشعراء ۲۶:۲۷) اور دو دفعہ

یہودیوں نے بھی بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہی۔ (المائدہ ۵:۱۱۰، الصف ۶۱:۶)
لیکن محمدؐ کے علاوہ صرف حضرت موسیٰ کو ہی مجنون کہا گیا اور وہ بھی صرف ایک دفعہ۔ آنحضرتؐ کے خلاف یہ بھی زور دے کر کہا جاتا ہے کہ وہ بعض پہلی آسمانی کتابوں سے اتنا اچھی طرح واقف تھے کہ ان سے یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ "تم نے یہ باتیں اچھی سیکھی ہیں" (الانعام ۶:۱۰۶) اور یہ کہ "وہ اچھی طرح پڑھایا ہوا دیوانہ ہے۔" (الدخان ۴۴:۱۴)

قرآن ضرور سختی سے اس طرح کے الزامات کی تردید کرتا ہے "تو کیا یہ جادو ہے یا تم کو نظر ہی نہیں آتا" (الطور ۵۲:۱۵) "اور (اے اہل مکہ) تمہارا رفیق دیوانہ نہیں ہے۔ بے شک اس نے پیغام برکو روشن افق پر دیکھا ہے اور وہ غیب کی خبریں دینے کے معاملے میں بخیل نہیں ہے۔ نہ یہ کسی شیطان مردود کا قول ہے۔ پھر تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے نصیحت ہے" (التکویر ۸۱:۲۲-۲۷) اپنے جی سے گھڑنے کے الزام پر ہم بعض قرآنی سورتوں کی تبدیلی کے سلسلے میں بحث کر چکے ہیں اور اس کی طرف ہم باب ہشتم میں پھر لوٹیں گے۔ ایک خاص طور پر زچ کر دینے والا جواب قرآن کی طرف سے یہ ہے "کیا وہ سمجھتے ہیں کہ تم نے اسے اپنے دل سے بنا لیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر میں نے اسے دل سے گھڑ لیا ہے تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر ہے اور جو گناہ تم کرتے ہو ان سے میں بری الذمہ ہوں۔" (ھود ۱۱:۳۵) ذیل میں اکثر الزامات کا خلاصہ ہے اور اس پر قرآن نے جو کچھ کہا وہ بھی دیا جاتا ہے:

> "اور جن لوگوں نے نبی کو ماننے سے انکار کیا وہ کہتے ہیں یہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ یہ لوگ ایسا کہہ کر بڑے ظلم اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں اس شخص نے لکھوا لیا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ اے محمد! ان سے کہہ دو کہ اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور نہ ماننے والوں کو ڈراتا۔ یا اس کے لیے کوئی خزانہ اتارا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہوتا

جس سے یہ اپنی خوراک حاصل کرتا اور ظالم کہتے ہیں ''تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو- اے پیغمبر دیکھو تو یہ تمہارے بارے میں کس کس طرح باتیں بنا کر پیش کرتے ہیں، پس وہ بہک گئے ہیں اور راستہ نہیں پا سکتے-'' (الفرقان ۲۵:۴-۹)

تو اہل مکہ خود پیغمبرؐ کے ساتھ کسی روح کو وابستہ کرتے تھے (اگر چہ وہ روح نقصان دہ ہوتی تھی) تاہم وہ روح جس کا پیغمبرؐ کے ساتھ تعلق تھا وہ بے شک اس طرح کی نہ تھی جس طرح کی ان کے مخالفین سمجھتے تھے- یہ وہی روح ہے، وحی کی لانے والی، جسے پیغمبر نے سب سے بلند یا روشن افق پر دیکھا تھا اور جو اس کی طرف قرآن لائی تھی- ہم آگے چل کر اس روح کی نوعیت پر، وحی لانے کے طریقے پر، پیغمبر کو یقین دلانے میں اس وحی کے اثر اور اس وحی کے نتیجے یعنی قرآن پر بات کریں گے-

''فرشتے'' کا لفظ اگر دیکھا جائے تو آنحضرتؐ کی طرف وحی لانے والے ایجنٹ کے لیے کوئی زیادہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ قرآن کم از کم آپ کی طرف وحی لانے والے کے لیے ''فرشتے'' کا لفظ استعمال نہیں کرتا، بلکہ اسے روح یا روحانی پیغام رساں کہتا ہے- فرشتے (ملک جمع ملائکہ) کا لفظ قرآن میں بہت دفعہ بطور ملکوتی ہستیوں کے استعمال ہوتا ہے جو خدا کے کارندے ہیں، جو ہر طرح کے کام کرتے ہیں، انسانوں کی زندگیاں لینے سے خدا کا عرش سنبھالنے تک، وہ نبیوں کے پاس بھی بھیجے جا سکتے ہیں (مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سورہ ھود ۱۱:۶۹، اور لوط کی طرف ھود:۸۱) اور وہ سچے مومنوں پر بھی، ان کو حوصلہ دینے کے لیے، اتارے جا سکتے ہیں (حم السجدہ ۴۱:۳۰) لیکن قرآن ان کو وحی کے لانے والے نہیں کہتا- درحقیقت خدا خود فرشتوں کی طرف بھی وحی بھیج سکتا ہے جب وہ مصیبت میں گرفتار مومنوں کو حوصلہ دینے کے لیے بھیجے جاتے ہیں ''جب (بدر کی لڑائی میں) خدا فرشتوں کو وحی (اشارہ) کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ہمت دلاؤ'' (الانفال ۸:۱۲) آنحضرتؐ سے پہلے بڑے پیغمبروں- نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام- کے معاملے میں لگتا ہے کہ خدا ان سے براہ راست ہم کلام ہے، اگر چہ ایک عام انداز کا بیان ہے کہ ''وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اپنے حکم سے اس کی طرف روح بھیجتا ہے'' (المومن ۴۰:۱۵) جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خدا کے پیغمبروں کو خدا کی روح کا فائدہ حاصل تھا جو ان کی طرف وحی لاتی تھی (سورہ النحل ۱۶ کی آیت ۲

بھی دیکھئے) حضرت عیسیٰ کی والدہ مریم (اگر چہ وہ پیغمبر نہیں تھیں، قرآن کسی عورت کا ذکر پیغمبر کے طور پر نہیں کرتا) ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کو "ہماری روح" کے ذریعے حمل ٹھہرا تھا (مریم ۱۹:۱۷، الانبیاء ۲۱:۹۱، التحریم ۶۶:۱۲) اور خدا نے حضرت آدم میں بھی، ان کا مادی جسم تیار کرنے کے بعد، اپنی روح پھونکی (الحجر ۱۵:۲۹، السجدہ ۳۲:۹، ص ۳۸:۷۲) مومن بھی "جن کے دلوں میں خدا نے ایمان ثبت کر دیا ہے" ان کی طرف بھی خدا روح بھیج کر ان کو قوت دیتا ہے (المجادلہ ۵۸:۲۲) حضرت عیسیٰ کی تائید البتہ "روح القدس" سے ہوئی تھی (البقرہ ۲:۸۷، ۲۵۳، المائدہ ۵:۱۱۰) جو قرآنی وحی کی لانے والی بھی ہے (النحل ۱۶:۱۰۲) خود حضرت عیسیٰ کو خدا کا پیغمبر، خدا کا وہ کلمہ جو اس نے مریم کے اندر ڈالا تھا، نیز اس کی طرف سے ایک روح کہا گیا ہے (النساء ۴:۱۷۱) غالباً اس وجہ سے کہ ان کی والدہ کا حمل روح کی وجہ سے ہوا تھا۔

کوئی شک نہیں کہ محمدؐ کی طرف وحی لانے والا ایجنٹ یہی روح ہے۔ اہل مکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اکثر آنحضرتؐ سے تقاضا کرتے تھے کہ ایک فرشتہ تم پر نازل کیا جائے، جس کا قرآن اکثر یہ جواب دیتا کہ فرشتے انسان پیغمبروں کی طرف نہیں بھیجے جا سکتے (بعض اوقات قرآن یہ دھمکی بھی دیتا کہ "ہم فرشتوں کو نازل نہیں کرتے مگر حق کے ساتھ، اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملتی" (الحجر ۱۵:۸) چنانچہ یہ امر یقینی ہے کہ فرشتے پیغمبرؐ کے پاس نہیں آتے تھے ان کی وحی روح القدس کے ذریعے آتی تھی جسے "امانت دار روح" بھی کہا گیا ہے (الشعراء ۲۶:۱۹۳)

تاہم کسی کو یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ روح اور فرشتے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ شاید قریب بہ صحت ہے کہ روح فرشتے کی اعلیٰ صنف ہے اور وہ خدا کے سب سے زیادہ قریب ہے (دیکھئے سورہ التکویر ۸۱ کی آیات ۱۹-۲۱، جو پیغمبر کے معراج پر ہماری گفتگو کے سلسلے میں اوپر دی گئیں) تاہم قرآن فرشتوں اور روح کا متعدد مقامات پر ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے "شب قدر میں فرشتے اور روح اترتے ہیں، اپنے رب کی اجازت سے ہر طرح کے حکم کے ساتھ" (القدر ۹۷:۴) (اس رات کے بارے میں ہم آگے گفتگو کریں گے) "فرشتے اور روح اس کی طرف صعود کرتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہوگا" (المعارج ۷۰:۴) "جس دن روح اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے (النباء ۷۸:۳۸) "وہ فرشتوں کو اپنے امر سے روح کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس کی طرف چاہتا ہے بھیجتا ہے" (النحل ۱۶:۲) ملاحظہ کیجئے کہ آخری آیت میں روح فرشتوں کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جسے فرشتے آگے پہنچاتے ہیں۔

جب اہلِ مکہ نے بار بار یہ تقاضا کیا کہ ایک فرشتہ آنحضرتؐ پر اترے، اور قرآن نے بار بار ان مطالبات کو رد کیا، تو قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے جسے وہ بھی دیکھ اور سن سکیں جبکہ قرآن جس چیز پر مسلسل زور دے رہا تھا وہ یہ تھی کہ لانے والی وہ روح تھی جو پیغمبر کے دل پر اترتی تھی "اس (قرآن) کو امانت دار روح لے کر تمہارے دل پر اتری ہے تا کہ تم لوگوں کو ڈراؤ۔" (الشعراء ۲۶: ۱۹۳) یہ روح دراصل جبریل ہی تھی "کہ دو کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہو (تو وہ جان لے کہ) اسی نے تو یہ کتاب اللہ کے حکم سے تمہارے دل پر نازل کی ہے۔" (البقرہ ۲: ۹۷) یہ بات کہ وحی اور اس کا لانے والا پیغمبرؐ کے لیے روحانی اور اندرونی تھے اس کی بھی کسی دوسری جگہ قرآن نے تصدیق کی ہے "اگر خدا چاہے تو تمہارے دل پر مہر لگا دے (تا کہ تمہاری طرف کوئی وحی نہ آ سکے)" (الشوریٰ ۴۲: ۲۴)

بعض جدید مغربی سکالروں کا یہ نقطہ نظر کہ پیغمبرؐ نے پہلے یہ خیال کیا تھا کہ خدا اس سے براہ راست مخاطب ہے اور پھر بعد میں جا کر اس نے وحی کا ایک درمیانی وسیلہ بیچ میں رکھ دیا، یہ نقطہ نظر بھی رد کر دینا چاہیے اس لیے کہ روح اور فرشتے بہت ابتدائی دور کی سورتوں میں (جیسے سورہ القدر ۹۷: ۴) ظاہر ہوتے ہیں جبکہ بعد کے زمانے میں بھی قرآن ایک ایسی زبان استعمال کرتا چلا جاتا ہے جس میں خدا پیغمبر کو براہ راست مخاطب کرتا ہے، جیسا کہ ابھی کچھ صفحات پہلے قدیم پیغمبروں کی کہانیوں میں ہم نے دیکھا کہ خدا پیغمبروں سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے، لیکن قرآن ان کے معاملے میں بھی روح کے وسیلے کی بات کرتا ہے (المومن ۴۰: ۱۵، النحل ۱۶: ۲) جب ہم وحی کے طریقے کے سوال پر بحث کریں گے تو ہم قرآن کے اس بات سے حتمی انکار کا حوالہ دیں گے کہ خدا انسان کے ساتھ کبھی براہ راست بات کر سکتا ہے۔ ایک قیاس یہ بھی ہے کہ روح ہی وحی کا اصل مافیہ ہے۔ "اور اسی طرح (اے محمد) ہم نے اپنی طرف سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔" (الشوریٰ ۴۲: ۵۲، اسی طرح دیکھئے المومن ۴۰: ۱۵ "وہ اپنے امر کی روح کو جس پر چاہتا ہے اتار دیتا ہے") شاید روح ایک طاقت ہے یا ایک صلاحیت، یا ایجنسی جو پیغمبر کے دل میں نشوونما پاتی ہے، لیکن جو ضرورت پڑنے پر اپنا اصل الہامی عمل اختیار کر لیتی ہے۔ تاہم یہ آغاز میں "اوپر" سے ہی "نازل ہوتی" ہے۔ یہ اس مشہور اسلامی روایت کے بالکل موافق ہے جس کی رو سے پورا قرآن پہلے سب سے پہلے آسمان پر (یعنی پیغمبرؐ کے دل پر، جیسا کہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی بجا طور پر کہتے ہیں) اتارا گیا تھا اور اس کے بعد جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی متعلقہ آیات زبانی طور پر القاء کی گئیں۔

کچھ بھی ہو، ہمیں وحی کے بارے میں قرآن کا جو محاورہ ہے اس کے دوسرے اہم معاملے کی طرف توجہ کرنی چاہیے- پانچ آیتوں میں (النحل ۱۶:۲، بنی اسرائیل ۱۷:۸۵، ۴۰:۱۵، الشوریٰ ۴۲:۵۲، القدر ۹۷:۴) جہاں روح کا اترتے ہوئے یا کوئی چیز یعنی وحی نیچے لاتے ہوئے ذکر ہوتا ہے- اس کو "امر" کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے جس کا ترجمہ ہم نے حکم کیا ہے- سوائے سورہ القدر کی آیت ۴ کے جہاں یہ اصطلاح تنہا استعمال کی گئی ہے- یہ خدا کے حوالے سے استعمال کی گئی ہے- اور ترکیب یہ رکھی گئی ہے: روح من امرنا یا روح من امرہ، اس من کے حرف کو by قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس طرح اس ٹکڑے کے معنی ہوں گے: "روح ہمارے حکم سے" اگرچہ ایسا کرنے کی ترغیب ہوتی ہے (اور قرآن کے مفسرین نے بنی اسرائیل ۱۷ کی آیت ۸۵ کے معاملے میں ایسا ہی کیا ہے: "وہ (یعنی یہود) تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تو کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تم لوگوں کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے" (مفسر الطبری اس کا ترجمہ کرتے ہیں: یہ میرے پروردگار کا ایک معاملہ ہے، یعنی روح کا معاملہ پورے طور پر خدا کے حیطہ اختیار میں ہے اور کوئی دوسرا اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا- یہ ایک امکانی تعبیر تو ہے لیکن دوسرے اسی طرح کے جملوں کو دیکھتے ہوئے جہاں یہ معنی نکالنا ناممکن ہے یہ بمشکل موزوں تعبیر ہو سکتی ہے) چونکہ اس مثال میں جملے کی ساخت دوسری مثالوں میں جملوں کی ساخت کے ہو بہو مشابہ ہے، اس کا ایک ہی معنی ہونا چاہیے "ہمارے حکم کی روح"-

لیکن یہ "امر" کیا ہے جس کا ہم نے اور بہت سے دوسرے لوگوں نے "حکم" ترجمہ کیا ہے- کس کی روح محمدؐ پر نازل ہوتی تھی یا اسے فرشتے محمدؐ کے دل پر اتارتے تھے؟ یہ "حکم" وہ چیز ہونی چاہیے جسے قرآن "لوح محفوظ" یا "ام الکتاب" کہتا ہے- اسے "حکم" کہا جاتا ہے اس لیے کہ اگرچہ اس میں سب چیزیں شامل ہیں اس کا اصل جو ہر انسان کے لیے اس کے احکامات ہیں- یہ اس اولیں کتاب یا "امر" کا جوہر ہی ہے جہاں سے روح یا روح القدس آتی ہے- پیغمبروں کے دلوں میں داخل ہوتی ہے اور ان پر وحی اتارتی ہے، یا جہاں سے روح کو فرشتے لے کر آتے ہیں اور پیغمبروں کے دلوں میں اتار دیتے ہیں- اس تعبیر کی رو سے بھی "لوح محفوظ" اور "ام الکتاب" (جس میں قرآن بھی شامل ہے) فرشتوں سے بلند تر چیز ہے جیسا کہ قرآن عموماً ان کے بارے میں بات کرتا ہے-

تاہم اگر چہ قرآن کے بیانات پر مبنی ہم یہ تکنیکی امتیازات قائم کر سکتے ہیں، لیکن ہم باضابطہ طور پر ان کی پابندی نہیں کر سکتے۔ قرآن جو کچھ لازماً کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے رسولوں یا انسانی پیغام بروں کے پاس کوئی خاص یا غیر معمولی طاقت آتی ہے جو اس سارے وجود کے اساسی منبع سے صادر ہوتی ہے اور ان پیغمبروں کے دلوں میں ایک ایسی چیز بھر دیتی ہے جو نور ہوتا ہے جس کے طفیل وہ چیزوں کو اس طرح دیکھتے اور جانتے ہیں کہ دوسرے اس طرح نہیں دیکھ اور جان سکتے۔ اس کے ساتھ یہ طاقت ان کو عمل کی ایسی راہ پر ڈال دیتی ہے جو پوری پوری قوموں کی زندگی بدل کے رکھ دیتی ہے۔ یہ کبھی نہ مرنے والی اور ہمیشہ تازہ دم روح سوائے تمام وجود اور زندگی کے وسیلے اور واسطے (agency) کے اور کچھ نہیں۔ یہ اس بات کی گارنٹی ہے کہ جب کبھی نوع انسانی اپنی حماقتوں کے سبب اخلاقی دلدل میں پھنس جاتی ہے تو اس کی نجات اور نئی زندگی کی ہمیشہ امید کی جا سکتی ہے۔ اب سوال وحی کے طریقے کا ہے:

> ''کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ خدا براہ راست اس سے بات کرے۔ سوائے وحی کے ذریعے (یعنی روح کے پھونکنے سے) یا پردے کے پیچھے سے۔ یا پھر وہ کوئی پیغام بر بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ وہ برتر اور حکمت والا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ پتا تھا کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسے ایک روشنی بنا دیا ہے جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، اور بے شک (اے محمدؐ!) تم سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر رہے ہو۔'' (الشوریٰ ۴۲: ۵۱-۵۲)

یہاں جو چیز ہمارے لیے خاص اہمیت کی ہے وہ ان آیات کا پہلا حصہ ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کسی انسان کے ساتھ کبھی براہ راست کلام نہیں کرتا لیکن وہ پیغمبر کے ذہن میں ایک روح پھونک سکتا ہے (جیسا کہ دوسری آیت آنحضرتؐ کے بارے میں بتاتی ہے)

(۱) جو اسے اس قابل بناتی ہے کہ سچ کو دیکھے اور اس کا اظہار کرے (کہو یہ میرا راستہ ہے میں لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر) یوسف ۱۲: ۱۰۸ ''وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی گئی ہے۔'' النجم ۵۳: ۳

(۲) جوایک واقعی ذہنی آواز پیدا کرتی ہے، جو جسمانی نہیں ہوتی، اور ایک خیال کی صورت لفظ پیدا کرتی ہے نہ کہ مادی طور پر سنا جانے والا لفظ۔

یا (۳) جوایک پیغام بر عامل کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو پیغمبر تک ''وحی'' پہنچاتا ہے۔

تاہم وحی کا وسیلہ کچھ بھی ہو، وحی کا اصل عامل خدا ہی رہتا ہے اس لیے کہ یہ وہی ہے جو ہمیشہ صیغہ متکلم میں بات کرتا ہے اور یہ وہی ہے جو ان آیات میں بھی بات کر رہا ہے اور پیغمبر کو مطلع کر رہا ہے کہ اس نے ان کے پاس ''اپنے حکم سے ایک روح'' بھیجی ہے۔

یہ بات کہ پیغمبر واقعی اپنے ذہن سے الفاظ سنتے تھے۔ سورہ القیامہ ۷۵ کی آیات ۱۶-۱۹ سے صاف واضح ہے ''اے نبی! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارا کام ہے۔ سو جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو اس وقت تم اس کی قرات غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمے ہے'' (اسی طرح دیکھئے سورہ طہٰ ۲۰ آیت ۱۱۴) یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس بے چینی میں کہ یہ یاد رہ جائے یا اپنی وحی کرنے والی روح سے مختلف کسی سمت میں اس کی پیش قیاسی نہ کر لے پیغمبر اپنی زبان اپنے عام انسانی ارادے سے چلاتے تھے، جس کا دخل خدا نے قبول نہ کیا۔ یہ بات لازمی طور پر وحی کے لانے والے کے ''مختلف وجود'' ہونے پر دلالت کرتی ہے یعنی وحی کے عمل میں محمد کی باشعور شخصیت سے مختلف! لیکن یہ بات بھی اتنی ہی واضح ہے کہ جو لفظ سنے گئے وہ ذہنی تھے، آواز کی صورت میں نہ تھے، اس لیے کہ روح اور آواز کا تعلق ان کے اندرون سے تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں ایک طرف وحی کا صدور خدا سے ہوتا تھا۔ دوسری طرف یہ پیغمبر کی گہری شخصیت کے ساتھ بہت قریبی طرح سے جڑی ہوئی تھی۔ اس لیے وحی لانے والے کی کلی خارجیت کے بارے میں جو واقعہ حدیث میں عام طور پر آتا ہے۔ اسے صحیح تسلیم کرنا آسان نہیں۔

ایک ایسے شخص کے لیے جس کا واسطہ تاریخ کے مواد کے بے حد الجھے ہوئے پیچ و خم اور ایک دوسرے میں گھسی ہوئی تہوں کے ساتھ ہو، اسے موڑ کر ایک صاف اور کھلے راستے میں بدل دینا اور ایسے فیصلے کرنا جو گھڑے گھڑائے ہوں، اتنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ بات ایک مثالیت پسند کے لیے آسان ہے کہ وہ تاریخی قوتوں کی پیچیدگیوں کو زیادہ اہمیت نہ دے یا انہیں نظر انداز کر دے اور تاریخ کو ایک خاص نہج پر موڑنے کی بجائے خود سطحی طور پر تاریخی قوتوں کے ساتھ بہتا چلا جائے۔ ایک غیر مثالیت پسند آدمی کے لیے اس سے بھی زیادہ آسان بات یہ ہے کہ وہ تاریخ کی قوتوں کی

تہوں میں گم ہو جائے اور سامنے کے مفادات کو بہت گراں قدر سمجھے- جہاں اپنے عام لمحات میں آنحضرتؐ اکثر کامیابی کے ساتھ تاریخ کی قوتوں کے ساتھ لڑا کرتے، وہیں یہ وحی والی روح تھی جو انہیں بعض اہم معاملات میں حتمی فیصلے کرنے کے قابل بناتی تھی جن میں جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، وہ ایک عام انسان کی حیثیت سے متزلزل ہو جاتے، باوجود اپنے اعلیٰ قدرتی کردار کے (جس کا خدا نے ان کو ایک واضح سرٹیفکیٹ دیا ہوا تھا) سادہ حقیقت یہ ہے کہ کہیں ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس نے اپنی ذات میں مثالیت پسندی اور واقعیت پسندی دونوں کے پہلو بڑے انوکھے اور موثر انداز میں اس طرح جمع کر لیے ہوں جس طرح آنحضرتؐ نے وحی کی روح کی نرالی کارکردگی کے طفیل جمع کر لیے تھے- اس روح کے ارشادات واضح اور محکم انداز میں نہ صرف اس معاملے میں فیصلہ کرتے تھے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، بلکہ نتیجتہً یہ بھی بتاتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا اور کون سی چیز کو باقی نہیں رہنے دینا- یہی وجہ ہے کہ اس روح کے کام کو فرقان کہا گیا" دو چیزوں کو الگ الگ کر دینے والا خط" (البقرہ ۲:۱۸۵، آل عمران ۳:۴، الفرقان ۲۵:۱) ایک ایسا نام جو کسی حد تک پہلے کی وحیوں اور معجزات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے (الانبیاء ۲۱:۴۸، البقرہ ۲:۵۳)

"بینہ" (فیصلہ کن ثبوت) کی اصطلاح جس طرح کہ یہ معجزے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور ہم اس پر باب چہارم میں بات کر چکے ہیں اسی طرح یہ قرآن میں وحی کی روح کے معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے- یا تو پیغمبر کے اندر ایک الہامی طاقت کے طور پر یا پیغمبر کی طرف بھیجے ہوئے ایک الوہی پیغام بر کے طور پر:

> "بھلا وہ شخص (پیغمبر محمدؐ) جو اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت رکھتا تھا (یعنی جو امکانی وحی کے معنوں میں اپنے اندر الہامی طاقت رکھتا تھا) اس کے بعد ایک گواہ بھی (یعنی الوہی پیغام بر، اس شہادت کی تائید میں) آ گیا اور پہلے موسیٰ کی کتاب راہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی----- (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس کا انکار کر سکتا ہے؟) (ھود ۱۱:۱۷)

مقصد یہ ہے کہ پیغمبر میں ایک مخفی وحی ہوتی ہے، ایک بینہ، اپنے لیے ایک حتمی ثبوت کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے، اور پھر الوہی پیغام بر یا وحی کی روح فعال واقعی اسے پڑھ کر سناتی ہے- اسی سورہ ھود

میں بعض دوسرے پیغمبر اسی طرح کی چیز کا اپنے لیے دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت نوح اپنے لوگوں سے کہتے ہیں "تو دیکھو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن ثبوت (بینہ) رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت عطا کی ہے (یعنی لفظوں میں ڈھالی گئی ایک وحی) اور وہ تم سے مخفی رکھی گئی ہے۔۔۔" (ھود۱۱: ۲۸، اسی طرح صالح کے معاملے میں: آیت ۶۳ نیز دیکھئے آیت ۸۸ جو اسی انداز میں ہے۔)

چنانچہ وحی یا وحی کی روح روشن ثبوت (بینہ) ہے، ہمیں بتایا جاتا ہے:

"اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ باز رہنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آ جائے۔ یعنی خدا کی طرف سے ایک پیغام بر جو انہیں پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن کے اندر اچھی اور قابل قدر تحریریں ہوں۔" (البینہ ۹۸: ۱-۲)

یہ یقین اور غیر متزلزل یقین دہانی (بینہ) ایسی چیز ہے کہ اس کی بنیاد پر عہد نامہ قدیم کی مذہبی شخصیات یہودی اور مسیحی امتوں سے الگ ہو جاتی ہیں اور اسلام انہیں اپنے قریب سمجھتا ہے، اسی طرح جیسے اس کے نزدیک تمام پیغمبر مسلمان رہے ہیں۔ "یا کیا تم اس بات کے قائل ہو کہ ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد یہودی یا عیسائی تھے۔ ان سے کہو، کیا تم زیادہ جانتے ہو یا خدا؟" (البقرہ ۲: ۱۴۰)

یہ ایسی حالتِ یقین سے پیدا ہونے والا ایمان ہے جو 'علم' ہے اور قرآن اکثر اس طرح کے یقین کا ایمان کی دوسری صورتوں کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے (ظن: البقرہ ۲: ۷۸، الجاثیہ ۴۵: ۲۴، آل عمران ۳: ۱۵۴، النساء ۴: ۱۵۷، الانعام ۶: ۱۱۶، ۱۴۸، یونس ۱۰: ۶۶) یا (خرص: الانعام ۶: ۱۱۶، ۱۴۸، یونس ۱۰: ۶۶، الزخرف ۴۳: ۲۰، الذاریات ۵۱: ۱۰) ہم حضرت ابراہیم کے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں کہ ایمان کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایمان میں اوج کمال وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جبکہ دوسری جانب جو لوگ ایمان سے خالی ہوتے ہیں وہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں جیسا کہ بدو لوگ کرتے تھے "یہ بدو لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے، ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، اس لیے کہ ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔" (الحجرات ۴۹: ۱۴) یا بعض یہودیوں کی طرح جنہوں نے ایمان کا روپ بھرا تھا "جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس میں بے یقینی اور

انکار کے ساتھ داخل ہوئے اور اسی کے ساتھ نکل بھی گئے اور جن باتوں کو یہ مخفی رکھتے ہیں خدا انہیں خوب جانتا ہے۔'' (المائدہ ۵:۶۱)

تو جب وحی لانے والی روح کی یہ یقین دہانی آ گئی تو اس کے بارے میں مفاہمت کے خیالات یا اس کی طرف کے اشارے ترک کر دیئے گئے۔ ''کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔۔۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔'' (الکافرون ۱۰۹:۱-۶) ہم سورہ یوسف کی آیت ۱۰۸ پہلے ہی نقل کر چکے ہیں جس میں پیغمبر کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف جانے والے اپنے راستے کی طرف بلاتے ہیں ''ایک واضح علم کی بنیاد پر'' اور سورہ الانعام ۶ آیت ۱۲۳ میں جہاں ان کا بیان ایک ایسے انسان کی صورت میں کیا گیا ہے جو پہلے مردہ تھا لیکن جسے خدا نے نئی زندگی دے دی تھی۔ نیز ''کہہ دو اے لوگو! تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ، میں اپنی جگہ عمل کیے جاتا ہوں'' (آیت ۱۳۵، اسی طرح تقریباً انہی الفاظ میں سورہ ھود ۱۱:۹۳، ۱۲۱، الزمر ۳۹:۳۹) پھر یہ کہ ''ہر شخص اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے، لیکن تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ صحیح راستے پر ہے۔'' (بنی اسرائیل ۱۷:۸۴) اور متعدد بیانات جو مخالفین کو بتاتے ہیں ''تم بھی انتظار کرو (یہ دیکھنے کے لیے کہ کون صحیح ہے) اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں'' (الانعام ۶:۱۵۹، الاعراف ۷:۷۱، یونس ۱۰:۲۰، ۱۰۲، ھود ۱۱:۱۲۲، پھر دیکھیے السجدہ ۳۲:۳۰) اس سے دو راستے بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں صحیح اور غلط! ''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت صاف طور پر ظاہر ہو کر گمراہی سے الگ ہو چکی ہے'' (البقرہ ۲:۲۵۶) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ حق باطل پر فتح یاب ہوگا۔ ''کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل تو مٹنے والا ہی تھا'' (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱) (یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ یہ آخری آیت کافی پیچھے مکی دور تک جاتی ہے)

قرآن سب سے پہلے ماہ رمضان کی ایک رات میں نازل کیا گیا (کم از کم جیسا کہ ہم نے بتایا، ایک مضمر اور ابتدائی حالت میں، جس سے پوری تفصیلات تدریجاً اور موقع کی مناسبت سے سامنے لائی جاتی رہیں)

> ''ہم نے اس (کتاب) کو بڑی برکت والی رات میں نازل کیا ہے،
> کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ وہ رات تھی جس میں

حکمت کے ہر معاملے کا فیصلہ ہمارے حکم سے کیا جاتا ہے- وہ یوں کہ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے تیرے رب کی رحمت کے طور پر--" (الدخان ۴۴:۳-۶)

"رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا تمام انسانوں کی لیے ہدایت کے طور پر اور ہدایت اور فرقان (حق اور باطل کا فرق کھول دینے والی تعلیم) کی روشن دلیلوں کے طور پر!" (البقرہ ۲:۱۸۵)

سورہ الدخان کی آیات ۳-۴ کے الفاظ "ہم نے اسے ایک خیر و برکت والی رات میں اتارا جس میں حکمت کے ہر معاملے کا فیصلہ کیا جاتا ہے" میں سورہ القدر کے ساتھ صاف نظر آنے والی مشابہت پائی جاتی ہے، جس میں سے ہم نے وحی کی روح پر بات کرتے ہوئے کچھ آیات اوپر نقل کیں- پوری سورت یوں ہے:

"ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے، اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے- اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے اذن سے ہر معاملے پر فیصلہ لے کر اترتے ہیں- وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک" (القدر ۹۷:۱-۵)

یہ رات جس کے متعلق خیال ہے کہ یہ ۲۶ اور ۲۷ رمضان کی درمیانی رات ہوتی ہے- اسے مسلمان ہر سال بہت اہتمام سے مناتے ہیں- ان میں سے بہت سے لوگ اسے عبادت میں گزارتے ہیں- چونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے نزول میں تیئیس برس لگے تھے، تو قرآن کے اس رات "نازل ہونے" کا بہت سے مسلم مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ قرآن پورے کا پورا "ساتویں آسمان" پر بھیج دیا گیا تھا اور وہاں سے یہ موقع کی مناسبت سے جستہ جستہ آیات کی صورت میں اترتا رہا- قرآن کے مجموعی حالت میں نازل ہونے کی اس حقیقت کی سورہ انشراح ۹۴ کی آیات ۱ سے ۳ ایک لحاظ سے تصدیق کرتی ہیں "کیا ہم نے تمہارا سینہ نہیں کھول دیا؟ اور تم پر سے وہ بوجھ اتار دیا جو تمہاری پیٹھ توڑے دے رہا تھا" "بوجھ سے نجات" بس ایک ہی دفعہ عطا کی گئی (اگرچہ اس کی جگہ ایک دوسرا بوجھ یعنی اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کا، اس کی جگہ رکھ دیا گیا) گویا وحی کی روح نے آنے والی مکمل وحی کی صورت میں پیغمبر کے ذہن کے ساتھ اپنا تعلق جوڑ لیا تھا-

اگر چہ وحی کا بعد میں ہونے والا کوئی بھی واقعہ آسان نہیں تھا- اس لیے کہ قرآن خود ایک وزنی پیغام تھا، نہ صرف اپنے مضمون کے لحاظ سے بلکہ اپنی ابتدا کے اعتبار سے بھی- ''زمین توڑنے'' کے اس پہلے واقعہ نے یہ بتا دیا کہ بحیثیت مجموعی اس پیغام کی ایک معین اور مربوط صورت تھی- قرآن میں بار بار آنے والے لفظ ''تنزیل'' کے معنی جیسا کہ مفسرین ہمیں یقین دلاتے ہیں، بتدریج اور وقفے وقفے سے کی جانے والی وحی یا ''نیچے بھیجنے'' کے عمل کے ہیں- اہل مکہ کو قرآن کے اس بتدریج اترنے پر اعتراض تھا- ''اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ یہ ایسا ہی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ ہم تمہارے دل کو طاقت دیں اور یہ بھی کہ ہم نے اسے ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے'' (الفرقان ۲۵:۳۲) یعنی یہ مواقع کی مناسبت سے ترتیب دیا گیا ہے- پھر یہ کہ ''ہم نے اسے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے---- ایک ایسا قرآن جسے ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تا کہ تم اسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو سناؤ، اور ہم نے اسے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے'' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۵-۱۰۶)

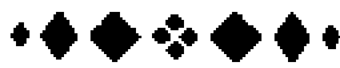
قرآن کچل دینے والے بوجھ اور اپنی دعوت کی طاقت دونوں کی تصدیق کرتا ہے ''اگر ہم نے یہ قرآن پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے ہی دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے- یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ شاید وہ غور کریں-'' (الحشر ۵۹:۲۱) پھر ''اگر کسی قرآن کے لیے یہ مناسب ہوتا کہ اس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی یا مردے بولنے لگتے (تو یہ قرآن ایسا کر لیتا)'' (الرعد ۱۳:۳۱) آخر یہی پیغام تو تھا جو محمدؐ کو زندگی میں واپس لایا (الانعام ۶:۱۲۳) اگر چہ قرآن اکثر اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ بت پرست اس کو مان کر نہیں دیتے لیکن یہ بات بھی وہ زور دے کر کہتا ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے لوگ اس کو سنیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی زوردار اپیل سے متاثر ہو جائیں- ''یہ منکرین حق کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سنو، اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو، شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ'' (حم السجدہ ۴۱:۲۶) قرآن کی اسی طاقت کے پیش نظر کفار کے متعلق کہا گیا ''گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر کے ڈر سے بھاگ پڑے ہیں'' (المدثر ۷۴:۵۰) آنحضرتؐ کے مخالفین اکثر خاموش رہ جاتے تھے ''جب تم انہیں دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں شاندار نظر آتے ہیں اور وہ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے ہو، مگر اصل میں یہ لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہوں-'' (المنافقون ۶۳:۴)

ہم کہہ چکے ہیں کہ پیغمبرؐ قرآن کے الفاظ ذہنی طور پر ''سنتے'' تھے، لیکن وہ ذہنی طور پر دیکھتے بھی تھے کہ وحی لانے والی روح قرآن پڑھ رہی ہے ''پاک صحیفے جن میں بڑی قدر و قیمت والی آیات ہیں'' (البینہ ۹۸:۲) پھر یہ کہ ''کہو یہ قرآن تو نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اس سے نصیحت لے- یہ ایسے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں-'' (عبس ۸۰:۱۱-۱۵) یہ وہ الوہی پیغامات ہیں جو ''لوح محفوظ'' سے قرآن کی صورت میں صادر ہوتے ہیں (البروج ۸۵:۲۱-۲۲) یہ ''لوح محفوظ'' جہاں سے تمام وحی شدہ کتابیں نکل کر باہر آتی ہیں، وہی ہے جسے ''چھپی ہوئی کتاب'' (الواقعہ ۵۶:۷۸) بھی کہا گیا ہے اور ''ام الکتاب'' (سب کتابوں کی ماں) بھی (الرعد ۱۳:۳۹) جہاں سے وحی شدہ آیات (اور کتابوں) کی توثیق یا منسوخی ہوتی ہے-

اسلام میں اعجاز القرآن کے نام سے وسیع لٹریچر موجود ہے- جو ''قرآن کے ناقابل نقل'' ہونے کا نظریہ پیش کرتا ہے، یہ نظریہ خود قرآن سے ہی نمودار ہوتا ہے، اس لیے کہ قرآن اپنے آپ کو محمدؐ کا سب سے بڑا معجزہ بنا کر پیش کرتا ہے- قرآن میں کوئی دوسری آسمانی کتاب معجزے کے طور پر سامنے نہیں لائی گئی، سوائے خود قرآن کے- اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ وحی کی تمام مادی صورتیں معجزے نہیں ہوتے- اگرچہ خود وحی کا واقعہ اپنی جگہ ایک معجزہ ہے- قرآن اپنے مخالفین کو پُر زور طریقے سے چیلنج کرتا ہے کہ ''ان (قرآن) جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ'' (البقرہ ۲:۲۳) ''اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو'' (سورہ یونس ۱۰:۳۸، ھود ۱۱:۱۳، جس کا زمانہ غالباً پہلے ہے) جو لوگ عربی زبان اچھی طرح جانتے ہیں، اور جو زبان کی خوبی اور خصوصیت کی پہچان رکھتے ہیں، وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ جہاں تک زبان اور اسلوب کی خوبصورتی اور قوت اظہار کا تعلق ہے، قرآن ایک بے مثال صحیفہ ہے، اس کی لسانی نزاکتیں ایسی ہیں کہ ان کا ترجمہ نہیں ہو سکتا- اگرچہ جو زبان بھی الہام سے وابستہ ہو اس کا ترجمہ مشکل ہی سے ہو سکتا ہے لیکن قرآن کے معاملے میں تو یہ بات خصوصیت کے ساتھ صحیح ہے-

جیسا کہ ہم باب ہشتم میں اس پر مزید بات کریں گے، قرآن اس بات کا بہت زیادہ شعور رکھتا

ہے کہ یہ ''عربی قرآن'' ہے اور خیالات اور نظریات سے قطع نظر ایسا لگتا ہے کہ قرآن کی معجزانہ نوعیت کے دعوے کا تعلق اسکے لسانی اسلوب اور اظہار سے ہے۔ بدقسمتی سے غیر عرب مسلمان اس بات کا زیادہ ادراک نہیں رکھتے۔ جہاں وہ بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے اس لیے اسے ہر زبان میں سمجھا جانا چاہیے وہاں وہ اپنے آپ کو نہ صرف قرآنی اظہار کے صحیح مذاق اور قدر دانی سے محروم کیے رکھتے ہیں ___ اس لیے کہ معانی کی پوری سمجھ کا دارومدار تو لسانی باریکیوں پر ہوتا ہے ___ وہ قرآن کے موضوعات کے ساتھ بھی پورا انصاف نہیں کر سکتے۔ یہ بہت زیادہ ضروری اور اہم ہے کہ پڑھے لکھے اور سوچنے والے غیر عرب مسلمانوں میں سے جتنے لوگوں کے لیے بھی ممکن ہو اپنے آپ کو قرآن کی زبان سے لیس کر لیں۔



باب ششم

معادیات (روز آخرت سے متعلق عقائد)

قرآن میں معادیات کی عام تصویر جنت کی خوش باشیوں اور دوزخ کی سزاؤں پر مشتمل ہے۔ قرآن ان کے بارے میں اکثر بات کرتا ہے جیسا کہ عمومی طور پر جزا اور سزا کے بارے میں جس میں ''خدا کی رضا اور اس کا غضب'' شامل ہوتے ہیں۔ اور ان سب کے بارے میں ہمیں تفصیل سے بات کرنی ہوگی۔ لیکن آخرت کے متعلق قرآن کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ایک گھڑی (الساعہ) آئے گی جب ہر انسان اپنے اعمال سے خود آگاہ ہونے کے ایک انوکھے اور بے مثل تجربے سے گزرے گا۔ جو کچھ اس نے کیا ہوگا، جو کچھ نہیں کیا ہوگا اور جو کچھ غلط کیا ہوگا وہ سب بے کم وکاست اور صاف صاف اس کے سامنے آ جائے گا اور ان پر جو فیصلہ ہوگا اسے وہ ایک ''لازمی'' انجام کے طور پر قبول کرے گا (''لازمی'' واوین میں اس لیے کہ خدا کی رحمت لامحدود ہے) یہ بات کہ انسان عام طور پر اپنے روزمرہ کاموں میں خصوصاً اپنے مطلب کے، محدود اور مادی معاملات میں اتنا مشغول رہتا ہے کہ وہ آخرت کی پروانہیں کرتا، اس بات کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ہم نے باب سوم میں اس بات پر زور دیا تھا کہ قرآن کے لیے معاشرے میں بسنے والے انسان کا مقصد زمین پر ایک اخلاق پر مبنی نظام قائم کرنا ہے لیکن اگر اس طرح کا نظام قائم کیا جاتا ہے تو اس کے لیے ''تقویٰ'' اور ذمے داری کا صحیح احساس اپنے اندر پیدا کرنا انفرادی انسان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ قرآن بار بار اس امر کا شکوہ کرتا ہے کہ انسان ابھی تک اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

''آخرت'' سچائی کا لمحہ ہے-''پھر جب وہ بڑی آفت برپا ہوگی جس دن انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا'' (النازعات ۷۹:۳۴-۳۵) یہ اس فینا مینا کا ایک بندھا ٹکا بیان ہے- یہ ایسی گھڑی ہوگی جب انسان کے ذہنی مشاغل اور معروضی اخلاقی واقعیت کے درمیان سارے پردے ہٹ جائیں گے ''تم اس سے بالکل غافل تھے لیکن اب ہم نے تجھ پر سے پردہ ہٹا دیا ہے تو آج تمہاری نگاہ تیز ہے'' (ق ۵۰:۲۲) ہر شخص وہاں دیکھے گا کہ اس کا اندرونی نفس خارجی اور فوری مسائل کے ملبے سے نکل کر پوری طرح باہر آ گیا ہے، ایسے مسائل جن میں مقصد کی جگہ ذرائع لے لیتے ہیں، بلکہ اصل ذرائع کی بجائے نام نہاد ذرائع، جہاں نہ صرف حق کی جگہ باطل رکھ دیا جاتا ہے بلکہ وہ فی الواقع حق بن جاتا ہے بلکہ حق سے بھی زیادہ دلکش اور خوبصورت، انسان کا ضمیر خود اتنا منحرف ہو جاتا ہے کہ ایک طویل عرصہ خصوصی قسم کے مفادات کے ساتھ رہتے رہتے اور جھوٹے خداؤں کی مسلسل عبادت کرتے کرتے مقدس غیر مقدس لگنے لگتا ہے اور اس کے برعکس بھی- یہ وہ چیز ہے جسے قرآن ''غرور'' سے تعبیر کرتا ہے یعنی کئی سطح کی خود فریبی! اگر انسان کو اس قبر در قبر جیسی حالت سے آزاد کرنا ہے تو اس کے لیے کم از کم ایک بڑے طوفانی انقلاب اور اخلاقی شخصیت کو تہہ و بالا کر دینے کی ضرورت ہے- اس واقعے کے بارے میں وحی کے پہلے مکی زمانے سے قرآن کا بیان کچھ یوں ہے:

> ''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی اور جب وحشی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے اور جب روحیں جسموں سے ملا دی جائیں گی اور جب دفن کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی؟ اور جب اعمال کے دفتر کھول دیے جائیں گے اور جب آسمان کی کھال کھینچ دی جائے گی اور جب دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی تو اس وقت ہر نفس جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے-'' (التکویر ۸۱:۱-۱۴)

یہ اس ساعت کے کرب اور الم کا مخصوص اظہار اور بیان ہے اگرچہ، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، اعمال کا فیصلہ قوموں اور پیغمبروں دونو کے لیے ہوگا لیکن یہ فیصلہ سب سے پہلے افراد پر لاگو ہو

گا- ہر فرد اس دن تنہا ہوگا اور اس کی مدد کے لیے وہاں نہ رشتہ دار ہوں گے، نہ دوست، نہ خاندان، نہ قبیلے، نہ قومیں!'' اور جس سرو سامان کی یہ بات کرتا ہے وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا اور وہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہوگا-'' (مریم ۱۹:۸۰) جہاں ایک شخص کی دولت اور جائداد اس کے بچوں کو یا دوسرے وارثوں کو جاتی ہے وہاں اس کے اقوال اور اعمال کی اخلاقی قدر خدا کی طرف جاتی ہے اور اس کے پاس محفوظ رہتی ہے- تا آنکہ وہ روز حساب اسے اس شخص کے سامنے لا رکھتا ہے-قرآن کہتا ہے کہ اس دن خدا کہے گا ''تم ہمارے پاس اکیلے ہی آئے ہو جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا'' (الانعام ۶:۹۵، اسی طرح مریم ۱۹:۹۵) یہ حالت جس میں صرف تنہائی نہیں بلکہ ہر دنیوی وابستگی سے محرومی ہے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا جاتا ہے کہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ''اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا- اس لیے کہ اس دن ہر شخص کو ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے کسی کا ہوش نہیں ہو گا'' (عبس ۸۰:۳۴-۳۷، اور سورہ المعارج ۷۰ کی آیات ۱۰ تا ۱۴، جن میں وہ اپنے قبیلے اور قوم کو بھی چھوڑ دے گا)

اس دن انسان یہ چاہے گا کہ کاش وہ پوری زمین جتنا سونا دے کر نجات حاصل کر سکے، لیکن اس طرح کی پیش کشیں قبول نہیں کی جائیں گی (آل عمران ۳:۹۱ اسی طرح المائدہ ۵:۳۶، یونس ۱۰:۵۴، الرعد ۱۳:۱۸، الزمر ۳۹:۴۷، الحدید ۵۷:۱۵، المعارج ۷۰:۱۱) جیسا کہ ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ قرآن سفارش کے تصور کو بھی رد کرتا ہے اور کسی دوسری چیز کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص کی اس کی اس حالت بے چارگی میں مدد کرے، سوائے خدا کی اپنی رحمت کے، جس کے متعلق قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ لامحدود ہے لیکن اگرچہ قرآن، خصوصاً مکہ کے شروع اور درمیانی زمانے میں گناہ گار لوگوں کے لیے روز جزا کی ہولناکیوں کی تفصیلات مسلسل بیان کرتا ہے- تاہم اصل سزا تو یقیناً وہ عذاب ہوگی جو وہ لوگ بھگتیں گے جنہوں نے اس دنیا میں برائی کا ارتکاب کیا تھا، جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ واپسی کا راستہ بند ہے اور وہ اس دنیا کی زندگی میں اچھے کام کرنے کا واحد موقع کھو چکے ہیں- وہ صحیح معنوں میں نقصان اٹھانے والے ہوں گے (یونس ۱۰:۴۵، الحج ۲۲:۱۱، المومن ۴۰:۷۸، الاعراف ۷:۹، ۵۳، الانفال ۸:۳۷، التوبہ ۹:۶۹) آخری نتیجے کے لیے قرآن کے الفاظ جیسا کہ ہم نے باب دوم میں نمایاں کر کے بتائے، نجات اور عذاب کے اتنے نہیں ہیں جتنے فلاح (کامیابی) اور خسران (نقصان) کے ہیں اس زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی!

یہی وجہ ہے کہ قرآن لوگوں کو ترغیب دیتا ہے کہ "کل کے لیے کچھ سامان بھیجو" (الحشر ۵۹:۱۸) اس لیے کہ ایک شخص کو وہاں جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اس کے پچھلے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن اکثر کہتا ہے کہ جب بھی کسی پر ان اعمال کی وجہ سے جو اس نے آنے والی زندگی کے لیے بھیجے ہیں، کوئی مصیبت آتی ہے تو اسے مایوسی گھیر لیتی ہے (مثال کے طور پر دیکھئے سورہ البقرہ ۲:۹۵، آل عمران ۳:۱۸۲، نساء ۴:۶۲، المائدہ ۵:۸۰، الانفال ۸:۵۱، الکہف ۱۸:۵۷، الحج ۲۲:۱۰، القصص ۲۸:۴۷، جو صرف آخرت کے متعلق ہیں، البقرہ ۲:۹۵، الجمعہ ۶۲:۷ النباء ۷۸:۴۰، الانفطار ۸۲:۵) درحقیقت جو آنے والی زندگی ہے اس کا دارومدار یہاں کی زندگی کے مقاصد پر ہے یا زمین پر انسان کی تنگ ودو کے دوررس نتائج پر!

اس کے بالمقابل قرآن جسے "الدنیا" کہتا ہے، وہ یہ دنیا نہیں ہے بلکہ اس میں پائی جانے والی وہ نچلے درجے کی اقدار اور سفلی خواہشات ہیں جو اتنا شوق دلانے والی ہوتی ہیں کہ بہت سے لوگ اکثر انہی کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور اونچے درجے کے اور دوررس مقاصد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ باب دوم میں ہم نے سورہ الرعد ۱۳ کی آیت ۷ انقل کی جس میں کہا گیا ہے کہ پہاڑیوں سے گرتے ہوئے پانی کے دھارے میں جھاگ کی ایک سطح بن جاتی ہے لیکن پانی کا یہ دھارا جب میدانوں میں سے گزرتا ہے تو یہ موٹی تہہ والی جھاگ اس طرح گم ہو جاتی ہے کہ اس کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ جبکہ وہ چیز جو انسانوں کو مستقل طور پر فائدہ دیتی ہے یعنی دریائی مٹی تو وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔ اس جھاگ کا منظر "دنیا" ہے اور باقی رہنے والی سیلابی مٹی "آخرت" ہے۔ (ہم نے وہاں وہ آیت بھی نقل کی جس میں مکی تاجروں کی دولت کمانے کی مہارت پر اس لیے تنقید کی گئی کہ انہوں نے زندگی کی اعلیٰ اقدار کو یعنی زندگی کے مقاصد کو نظر انداز کر دیا۔ "ان کو اس زندگی کے ظاہری امور کا پتا ہے لیکن وہ آخرت کی طرف سے غافل ہیں۔" (الروم ۳۰:۷)

یہ مقصد سے وابستہ اقدار کی وجہ سے ہے کہ انسانوں کے اعمال کا وزن غایت درجے کی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہاں بے شک مکی تاجروں پر طنز ہے کہ آخرت میں اعمال تولے جائیں گے۔ سونا، چاندی اور دوسرا تجارتی سامان نہیں، بعد میں معتزلی متکلمین نے اعمال کے وزن کئے جانے کا بالکل لفظی مطلب لے لیا اور صحیح صحیح معاوضے کا ایک کڑا نظریہ قائم کر لیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ان لاینحل مشکلات میں ڈال دیا جن کا تعلق ٹھیک ٹھیک سزا و جزا کے نظریے سے تھا۔ بجائے خدا کی لامحدود رحمت کو حقیقی ماننے کے اور یہ سمجھنے کے کہ وہ اعمال کے ٹھیک ٹھیک معاوضے

کے نظریئے میں تبدیلی لاسکتی ہے انہوں نے مذہب کو سمجھنے اور سمجھانے اور اس کے بارے میں وضاحتیں دینے کی کوشش میں، اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی- کوئی شک نہیں کہ قرآن صاف صاف وزن کرنے یا تولنے کا ذکر کرتا ہے اور اس امر کا بھی کہ لوگوں کے اعمال نامے ان کے سامنے پھیلا دیئے جائیں گے (جیسا کہ آگے آنے والے اقتباس سے ظاہر ہوگا) لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ ایک کلی نظریہ ہے، نہ کہ ٹھیک ٹھیک معاوضے کی بات- اس طرح کے بہت حوالے ہیں کہ اعمال تولے جائیں گے اور یہ آیت اس کی ایک کافی مثال ہے "پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند زندگی میں ہوگا، اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی (القارعہ ۱۰۱:۶-۹) نیک لوگوں کو اپنے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں ملیں گے جبکہ بُرے لوگ اپنے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں وصول کریں گے:

> "تو جس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا "لو دیکھو، پڑھو میرا نامہ اعمال- میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے- پس وہ دل پسند زندگی میں ہوگا، ایک عالی مقام جنت میں جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑے ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے دنوں میں آگے بھیجے تھے- اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا جاتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے- اے کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی) فیصلہ کن ہوتی- آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، میرا سارا اقتدار خاک میں مل گیا-" (الحاقہ ۶۹:۱۹-۲۹، اسی طرح دیکھئے الواقعہ ۵۶:۲۷-۵۶، بنی اسرائیل ۱۷:۱۷ ومابعد، المدثر ۷۴:۳۹)

اعمال نامے جو بولیں گے (المومنون ۲۳:۶۲، الجاثیہ ۴۵:۲۹) اور جن کا لوگ انکار نہیں کر سکیں گے، عمل کرنے والوں کے حق میں یا خلاف کافی شہادت بہم پہنچائیں گے- اس کے علاوہ یہ کہ لوگوں کے ذہن کھل کر سامنے آجائیں گے، چنانچہ وہ اپنے خیالات چھپا نہیں سکیں گے، جس طرح کہ قبریں اپنے مردے نکال باہر کریں گی (العادیات ۱۰۰:۹-۱۰) حتیٰ کہ انسان کے جسمانی اعضاء بھی گواہی دیں گے-

''اور اس دن کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن اکٹھا کرنے کے دوزخ کی طرف لائے جائیں گے، اور پھر انہیں پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا- پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں، وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی؟ اور وہ جواب دیں گی- ہمیں اس خدا نے گویائی دی ہے جس نے سب کو گویا کر دیا ہے------تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو اس خیال سے نہیں کہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف گواہی دیں گی، نہیں، بلکہ تمہارا خیال یہ تھا کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس میں سے بہت کچھ اللہ نہیں جانتا- تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تمہیں لے ڈوبا اور تم خسارے میں پڑ گئے- اب اگر یہ صبر کریں گے تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہی ہے اور اگر یہ معافی چاہیں گے تو ان کو معافی بھی نہیں دی جائے گی- (حم السجدہ ۴۱:۱۹-۲۴)

اصل میں ایک ایسی صورتحال کے مقابلے میں کوئی جائے پناہ نہیں ہو سکتی جہاں انسان کا ذہن بالکل شفاف حالت میں سب کے سامنے آ جائے اور جہاں اس کے اپنے جسمانی اعضاء اس کے خلاف گواہی دینے لگے جائیں- لیکن پھر یہی وہ ٹھیک ٹھیک ذہنی حالت ہے جو قرآن چاہتا ہے کہ انسان یہ زندگی بسر کرتے ہوئے اپنائے- یہی وہ چیز ہے جسے تقویٰ کہتے ہیں- ایک پبلک اور پرائیوٹ زندگی کا یکساں ہونا- اور یہی وہ چیز ہے جو پیغمبر نے اپنی مثال سے ظاہر کی، جبکہ وہ مدینے میں رہتے تھے، جو عوامی زندگی سے قریب ترین ایک چیز تھی جو وہ اپنے صحابہ کے درمیان گزارتے تھے لیکن دوسروں سے وہ اپنی کوئی چیز نہیں چھپاتے تھے- دل کا یہ شفاف پن ہے جو قرآن چاہتا ہے کہ انسان حاصل کرے اگر اسے کامیابی سے ہم کنار ہونا ہے اور جہنم کی آگ میں نہیں جلنا-

اس سے آگے یہ کہ اس دن بہت زیادہ سوال کیے جائیں گے اور جواب دیئے جائیں گے- جہنم کے داروغے اپنے ہاں آنے والوں سے پوچھیں گے کہ وہ وہاں کیوں آئے ہیں اور کیا ان کے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے جو انہیں سر پر منڈلانے والی آفت سے ڈراتے:

"اور جن لوگوں نے انکار کیا، جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے جب وہ وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا ہو- وہ کہیں گے: ہاں آئے تھے- لیکن عذاب کا فیصلہ کافروں کے حق میں دیا جا چکا- ان سے کہا جائے گا: داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں- یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، یہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کے لیے- اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے بچتے رہے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو ان کے منتظمین ان سے کہیں گے تم پر سلام ہو، تم بہت اچھے ثابت ہوئے، پس اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ- وہ جواب میں کہیں گے: شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا- اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنا مکان بنا سکتے ہیں- پس اچھے عمل کرنے والوں کے لیے بہترین اجر ہے- (الزمر ۳۹: ۷۱-۷۴)

ان آیات کا آخری حصہ قابل ملاحظہ ہے یعنی "خدا نے ہمیں زمین وراثت میں دی ہے ہم اس کی جنت میں جہاں چاہیں گے اپنا مکان بنائیں گے" اگرچہ یوم آخرت کے متعلق قرآن کے بیانات عام طور پر موجودہ کائنات کو پوری طرح تہہ و بالا کرنے کی بات کرتے ہیں اور یہ کہ زمین اور آسمان اپنی جگہ سے ہلا دیئے جائیں گے اور زمین کو پوری طرح جھنجھوڑ دیا جائے گا بلکہ "قیامت کے دن، زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے" (الزمر ۳۹: ۶۷) اور "انسانیت بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوگی اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوں گے-" تاہم ان تمام بیانات سے اصل میں خدا کی مطلق طاقت کا اظہار مقصود ہے- جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ زمین اور آسمان--- یعنی کائنات خود بخود پیدا ہوئے ہیں ان کو تخلیق میں لانے والا کوئی نہیں اور وہ آخری اور حتمی وجود ہیں انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ساری قدرت رکھنے

والا، طاقتور اور مطلق خدا ہے جو اپنی خاص رحمت سے اس کائنات کو وجود میں لایا ہے- اس لیے کہ کوئی چیز بھی اس کے نظم وضبط اور اس کی حکمرانی سے باہر نہیں جا سکتی- قرآن اس کائنات کی تباہی کی بات نہیں کرتا بلکہ اس کی صورت بدلنے، اور اسے نئی ترتیب دینے کی بات کرتا ہے تاکہ زندگی کی نئی صورتیں اور وجود کی نئی سطحیں پیدا کی جا سکیں- جب یہ کہتا ہے کہ "ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے" (القصص ۲۸:۸۸) یا یہ کہ "جو مخلوق بھی زمین پر ہے وہ فنا ہو جائے گی اور تمہارے پروردگار کی ذات، جو صاحب جلال وعظمت ہے، ہمیشہ باقی رہے گی" (الرحمان ۵۵:۲۶،۲۷) یہ آیت اولاً کائنات بحیثیت مجموعی کی بات نہیں کرتی، بلکہ اس کے مشمولات کی بات کرتی ہے- اور دوسرے یہ خدا کے قطعی اور دوامی جاہ وجلال کا نقشہ سامنے لاتی ہے-

یقیناً ان آیات سے جن پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، یہ بات بالکل عیاں ہے کہ یہ زمین ایک جنت میں بدل دی جائے گی، جس کا لطف اس کے وارث اٹھائیں گے- یہ امر کہ قرآن زمین کی مکمل تباہی کی بات نہیں کرتا بلکہ اس کے تبدیل کیے جانے کی بات کرتا ہے (سوائے اس کے کہ ہر نئی تخلیق یا تبدیلی کے لیے کچھ نہ کچھ تباہی تو کرنی ہوتی ہے) یہ بھی اس طرح کی آیات سے واضح ہے کہ "جس دن یہ زمین اور آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے (یعنی ان کی ماہیت اس سے مختلف ہو جائے گی جواب ہے) ابراہیم ۱۴:۴۸) قرآن تخلیق کی ایک نئی صورت یا نئی سطح کی بھی بار بار بات کرتا ہے "ہم نے تمہاری تقدیر میں موت لکھ دی ہے اور ہم اس بات سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے- اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟ (الواقعہ ۵۶:۶۰-۶۲) "پھر خدا ہی دوسری تخلیق کرے گا" (العنکبوت ۲۹:۲۰، پھر دیکھئے النجم ۵۳:۴۷) "اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے" (الرعد ۱۳:۵، السجدہ ۳۲:۱۰، سبا ۳۴:۷) "اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو تباہ کر دے اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے" (ابراہیم ۱۴:۱۹، الفاطر ۳۵:۱۶) "کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم تھک گئے تھے؟ نہیں، بلکہ ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں" (ق ۵۰:۱۵ اور وہ تمام آیات جو پہلی تخلیق کا اور پھر نئی تخلیق کا ذکر کرتی ہیں (نبدا الخلق ثم نعیدہ)

اسی طرح دوسری دنیا کی عورتیں (حوریں) اور مرد بھی نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے (الواقعہ ۵۶:۳۵) پھر دوزخ کے بارے میں کہا جاتا ہے "یہ اللہ کی آگ ہے خوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچ جائے گی، وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی، اور وہ اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوں گے" (الھمزہ ۱۰۴:۶-۹) کچھ آیتوں میں جن میں لوگ اور قومیں ایک دوسرے کے پیچھے جہنم میں داخل ہوتے ہوئے بتائی گئی ہیں (بعد کے آنے والے پہلے لوگوں کی مثالوں سے گمراہ اور ان کی مزاحمت کا شکار ہو کر) قرآن صاف صاف بتاتا ہے کہ جہنم میں سزا کے نتیجے کا دارومدار مجرم کی حساسیت پر ہوگا اور اس لیے اس میں ضمیر بھی ملوث ہوگا۔ چنانچہ سزا بنیادی طور پر اخلاقی یا روحانی ہوگی۔

"خدا کہے گا جاؤ تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہِ جن و انس جا چکے ہیں، ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا حتی کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا، لہٰذا ان کو آگ کا دہرا عذاب دے۔ اس پر خدا جواب میں کہے گا: ہر ایک کے لیے دہرا ہی عذاب ہے لیکن تم جانتے نہیں ہو۔" (الاعراف ۷:۳۸)

لیکن آخرت کی زندگی کی خوشی اور عذاب یقیناً محض روحانی نہیں ہے۔ بخلاف مسلم فلاسفہ کے قرآن ایسی کسی آخرت کی زندگی کو تسلیم نہیں کرتا جس میں صرف روحیں ہوں گی اور جسم نہیں ہوں گے بلکہ قرآن روح اور جسم کی دوئی ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لیے کہ انسان ایک وحدانی اور زندہ اور پوری طرح اپنا کام کرنے والا نامی وجود (organism) ہے۔ نفس کا لفظ جو بعد کے زمانے میں اسلامی فلسفے اور تصوف میں روح۔ یعنی جسم سے الگ ایک ہیولیٰ۔ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا، قرآن میں اس کے معنی "وہ خود" (مرد، عورت یا زیادہ لوگ) کے ہیں جبکہ بعض دوسرے سیاق وسباق میں اس کے معنی "شخص" یا "اندر والے شخص" کے ہیں، یعنی انسان کی زندہ حقیقت لیکن جسم سے الگ یا اس کے علاوہ نہیں۔ درحقیقت یہ جسم ہی ہے جو زندگی اور عقل کے ایک خاص مرکز نے ساتھ انسان کی شخصیت یا اس کی اندرونی شناخت کو تشکیل دیتا ہے۔

چنانچہ قرآن کسی خالص "روحانی" جنت یا دوزخ کی بات نہیں کرتا، اس لیے خوشی اور عذاب انسان ہی کو بطور ایک شخص کے ہوتے ہیں۔ جب قرآن اتنے تواتر کے ساتھ، اتنے بھرپور انداز میں اور اتنی وضاحت سے جسمانی خوشی اور جسمانی عذاب کی بات کرتا ہے تو وہ کوئی استعارے میں

بات نہیں کر رہا ہوتا، جیسا کہ مسلم فلاسفہ اور دوسرے تمثیل نگار سمجھتے ہیں، اگر چہ یہ صحیح ہے کہ قرآن خوشی اور سزاؤں کو بطور مجموعی تاثر کے بیان کر رہا ہوتا ہے یعنی بیک وقت جسمانی اور روحانی مسرت اور کرب کے احساس کے معنوں میں! ایک بھڑکتی ہوئی دوزخ اور ایک جنت کی بولتی ہوئی تصویروں کا مطلب ان اثرات کو بطور اصل روحانی و جسمانی احساسات کے سننے والے کو پہنچانا ہے، علاوہ ان کے رائج الوقت نفسیاتی اثرات کے! چنانچہ لفظی معنوں میں آگ تو کہیں نہیں ہوتی، لیکن اس کے نفسیاتی اور جسمانی اثرات ضرور ہوتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ کہ جسمانی سزا اور مسرت حقیقی اور جوں کی توں ہے، استعاراتی نہیں ہے۔ تاہم قرآن اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ ان کا روحانی پہلو ہے جو غالب اور حاوی ہے۔ اس لیے ہمیں بتایا جاتا ہے ''خدا نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور دائمی بہشت میں ان کے لیے عمدہ عمدہ مکان ہوں گے۔ اور خدا کی خوشنودی ان سب چیزوں سے بڑھ کر ہوگی۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے'' (التوبہ ۹:۷۲) جہاں مومن اور نیک لوگ اپنا سب سے بڑا انعام خدا کی رضا کی صورت میں حاصل کریں گے وہاں کفار اور فاسق و فاجر لوگ اس کی ناراضی اور بیگانگی سے دوچار ہوں گے ''بھلا وہ شخص جو خدا کی رضا کے پیچھے جانے والا ہو، اس کی طرح ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنم ہو؟'' (آل عمران ۳:۱۶۲، دیکھئے المائدہ ۵:۸۰، محمد ۴۷:۲۸، اسی طرح دیکھئے وہ سب آیات جن میں ''غضب'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور دوسری آیات لفظ ''رضوان'' کے تحت، اگر چہ یہ سب کی سب یوم آخرت کے بارے میں نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا سے بھی ان کا تعلق ہے) قیامت کے روز خدا ایسے لوگوں سے کلام تک نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ ڈالتے ہیں (یہاں بعض یہودی لوگ مراد ہیں) (آل عمران ۳:۷۷) اہل ایمان کے چہرے اس دن ''تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے'' (القیامہ ۷۵:۲۲۔ یہ وہ آیت ہے جس سے قرون وسطیٰ کے اسلام میں ایک بدنام اور احمقانہ اختلافی بحث چلی (جو ایک ہزار سال تک باقی رہی) وہ یہ کہ آخرت میں کیا خدا واقعی جسمانی طور پر اہل ایمان کو دکھائی دے گا یا نہیں، اسی طرح دیکھئے الدھر ۷۶:۱۱، عبس ۸۰:۳۹، المطففین ۸۳:۲۴، یونس ۱۰:۲۶) جبکہ کفار کے چہرے ''گرد آلود ہوں گے، اور ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔'' (عبس ۸۰:۴۰-۴۱، یونس ۱۰:۲۷، القلم ۶۸:۴۳، المعارج ۷۰:۴۴)

اس دن جو سوال و جواب ہو گا اس کی طرف واپس آتے ہیں- اہل جنت، اہل جہنم اور اعراف میں رہنے والے جو نہ جہنم میں ہوں گے اور نہ جنت میں، یہ سب آپس میں خیالات کا تبادلہ کریں گے اور ماضی میں جو کچھ کیا تھا اس کا جائزہ لیں گے-

''پھر یہ جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پالیا جو ہمارے رب نے ہمارے ساتھ کیے تھے- کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کیے تھے- وہ جواب دیں گے- ہاں- تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے تھے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے- اور وہ آخرت کے منکر تھے- اور ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہو گی- جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ لوگ ہوں گے جو سب لوگوں کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور اصحاب جنت سے کہیں گے تم پر سلامتی ہو- یہ لوگ بھی جنت میں داخل ہونا چاہیں گے لیکن ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے- اور جب ان کی آنکھیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی- تو کہیں گے اے رب ہمیں ان ظالم لوگوں میں نہ شامل کیجو، پھر یہ اعراف کے لوگ کچھ لوگوں کو پکاریں گے جنہیں یہ ان کی صورتوں سے پہچانیں گے اور کہیں گے کہ آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ تمہاری شیخیاں جو تم دنیا میں مارا کرتے تھے- کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ ان پر اپنی رحمت نہیں کرے گا- (آج انہی سے کہا گیا کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں، یہاں تمہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ تم کو کوئی رنج و اندوہ ہو گا- اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں سے کچھ پھینک دو- وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں منکرین حق پر حرام کر دی ہیں-'' (الاعراف ۷:۴۴-۵۰)

ہر قوم انہی معیاروں پر پرکھی جائے گی جو ان کے پیغمبروں نے اپنی اپنی وحی کی تعلیمات کے مطابق مقرر کیے ہوں گے- اگر چہ قرآن کی رو سے جہاں وہ بنیادی طور پر ایک جیسی ہیں اس لیے کہ ان کا ماخذ ایک ہی ہے، تاہم قدیم ماضی کی کوئی امت ان معیارات پر نہیں پرکھی جا سکتی جو بعد کی امتوں کے لیے مقرر کیے گئے- ''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو بلائیں گے اور (اے محمد) تمہیں ان پر گواہ بنا کر لائیں گے؟'' (النساء۴:۴۱) ''ہم ہر ایک امت میں سے گواہ نکال لیں گے، پھر کہیں گے کہ اپنی دلیل پیش کرو'' (یعنی اپنے غلط اعمال کے لیے خاص طور پر بتوں کی پوجا کے حق میں جو تم کرتے ہو) (القصص ۲۸:۷۵) خود پیغمبروں سے بھی پوچھا جائے گا کہ آیا انہوں نے اپنے لوگوں کو ٹھیک طرح سے پیغام پہنچایا تھا، اور خاص طور پر یہ کہ آیا پیغمبروں کے چلے جانے کے بعد یہ لوگ جو ایمان لائے اور جس طرح کے کام کیے وہ ان کے بتائے ہوئے پیغامات کے مطابق تھے! ''تو جن لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجے گئے، ہم ان سے ضرور پوچھیں گے اور خود پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے- پھر اپنے علم سے ان کے اعمال ان کے لیے بیان کریں گے'' (الاعراف ۷:۶،۷) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کے روز پوچھا جائے گا کہ کیا انہوں نے اپنے پیروکاروں کو تثلیث کی تعلیم دی تھی- اس پر وہ جواب دیں گے ''تو پاک ذات ہے، میرا یہ کام نہ تھا کہ میں وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا- اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا'' (المائدہ ۵:۱۱٦) عام طور پر پیغمبروں کے بارے میں آیا ''جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا- وہ کہیں گے ہمیں کوئی علم نہیں، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں'' (المائدہ ۵:۱۰۹) آخری دونو آیات آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں جیسا کہ سورہ المائدہ بالعموم اسی دور کی ہے- اور اس لیے اسے تنبیہ سمجھنا چاہیے نہ صرف عیسائیوں اور دوسری امتوں کے لیے بلکہ اسی طرح-- اگر چہ بالواسطہ طور پر--- خود مسلم امت کے لیے بھی- مکہ کے زمانے میں ہی قرآن نے اعلان کیا تھا ''اور پیغمبر محمدؐ کہیں گے اے میرے پرودگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا- (الفرقان ۲۵:۳۰)

اور آخر میں یہ کہ قرآن متواتر ایک تلخ سوال و جواب کا ذکر کرتا ہے جو معاشرتی طور پر کمزور اور امیر لوگوں کے درمیان ہوگا- کمزور لوگ معاشرے کے امیر اور بااثر لوگوں پر الزام دھریں گے کہ وہ اپنے ناجائز اثر و رسوخ اور دھمکیوں سے ان کو غلط راہ پر لے گئے- جو لوگ جہنم میں پہنچ چکے ہوں گے وہ جب بھی ایک نیا سزا یافتہ گروہ داخل ہوگا اپنے ساتھیوں سے کہیں گے-

"یہ ایک لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آ رہا ہے، ان کے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے، یہ آگ میں جھلسنے والے ہیں- وہ ان کو جواب دیں گے نہیں بلکہ تم ہی جھلسے جا رہے ہو، کوئی خیر مقدم تمہارے لیے نہیں، تم ہی تو یہ انجام ہمارے سامنے لائے ہو- پس بہت برا ٹھکانا ہے- وہ کہیں گے اے ہمارے رب! جو بھی یہ انجام ہمارے سامنے لایا ہے اس کو دوزخ کا دہرا عذاب دے- اور کہیں گے کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جن کو ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے- ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا یا وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں- بے شک یہ سچی بات ہے، اہل دوزخ میں یہی جھگڑے ہوں گے-" (ص ۳۸:۵۹-۶۴)

"جو لوگ دنیا میں کمزور سمجھے جاتے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے- وہ بڑے بننے والے اُن دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی- نہیں بلکہ تم خود مجرم تھے- وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے نہیں بلکہ یہ تمہاری رات دن کی تدبیریں تھیں کہ برابر ہم سے خدا کو نہ ماننے اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے کو کہتے رہے- اور جب یہ لوگ عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے تو اپنے دلوں میں اندر ہی اندر پشیمان ہوں گے (سبا ۳۴:۳۲-۳۴، اسی طرح دیکھئے ابراہیم ۱۴:۲۱، المومن ۴۰:۴۷، ق ۵۰ آیت ۳۳ و مابعد، جہاں خدا ان جھگڑنے والوں سے کہے گا، میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، اس لیے کہ میں نے تو پہلے ہی تم لوگوں کو تنبیہ بھیج دی تھی- میرے ہاں بات نہیں بدلا کرتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا-" (ق ۵۰:۲۸-۲۹)

قیامت کا برپا ہونا اور آخری حساب کتاب ہونا، یہ ایسی باتیں تھیں جن کو قبول کرنا مکہ کے لادین مشرکین کے لیے بہت مشکل تھا بلکہ حقیقت میں عقیدہ توحید (اور اس کے نتیجے میں ان کے خداؤں کا ہٹا دیا جانا) اور خود وحی (جس کو وہ برابر سحر کہتے تھے، ایک جادوگری یا پیغمبر کے ذہنی انتشار

کا نتیجہ) کے علاوہ یہ آخرت کا عقیدہ قبول کرنا، ان لوگوں کے لیے بہت مشکل تھا- یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ لوگ پیغمبر سے قرآن میں جن "تبدیلیوں" کا مطالبہ کرتے تھے، ان میں علاوہ اس چیز کے کہ ان کے خداؤں کو نئے نظام میں انسان اور خدا کے درمیان بطور سفارش کنندہ تسلیم کیا جائے یہ بھی شامل تھا کہ یوم آخرت کا اور خصوصاً جسمانی طور پر اٹھائے جانے کا عقیدہ ختم کیا جائے- وہ کہتے تھے کہ وہ اور ان کے آباء و اجداد نے قیامت کا سن رکھا تھا (یقیناً یہودیوں اور عیسائیوں سے) لیکن یہ نظریہ سوائے اگلی امتوں کے قصے کہانیوں کے اور کچھ نہ تھا (المومنون ۲۳:۸۳، النمل ۲۷:۶۷-۶۸) اس سے بھی زیادہ کم سمجھ میں آنے والی باتوں میں "اخلاقی ذمہ داری" اور زندگی کے تجریدی "مقاصد" ہوں گے جو ہمارے زمانے کے لادینی معاشروں میں بھی سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں ہیں-

قرآن کے لیے آخرت کا حساب متعدد بنیادی وجوہ کی بنا پر بہت اہمیت کا حامل ہے- اولاً چونکہ قرآن کے لیے حقیقت اور واقعیت کا یہ سارا نظام اخلاقی اور منصفانہ بنیادوں پر قائم ہے، اس لیے انسان کی کارکردگی کا معیار بھی ضرور جانچا جانا چاہیے- ورنہ صرف اس دنیا میں پیش آنے والے واقعات میں انصاف کو بالیقین قائم نہیں کیا جا سکتا- دوسرے یہ کہ، اور یہ ہم نے اس باب کے ابتدائی حصے میں وضاحت سے بتایا ہے، زندگی کے مقاصد اس طرح صاف صاف بتائے جانے چاہئیں کہ ان کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہ رہے- تاکہ لوگ یہ دیکھ سکیں کہ وہ کن چیزوں کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں اور زندگی کے اصل مقاصد کیا ہیں- یہ نکتہ قرآن کے پورے عقیدۂ آخرت میں بے حد اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ "اعمال کا تولا جانا" اسی کی پیش قیاسی کرتا ہے اور اسی پر اس کا دارومدار ہے، اور تیسری بات، جو دوسری بات سے قریب اور جڑی ہوئی ہے یہ رائے ہے کہ انسانی فکر و عقیدے کے سفر میں جو تنازعات، اختلافی رویے اور کشمکش کی صورتیں پائی گئی ہیں ان کا حتمی طور پر تصفیہ کیا جانا چاہیے- قرآن کو اس بات میں شک نہیں کہ ایک چیز ایسی ہوتی ہے جسے دیانت دارنہ اختلاف رائے کہتے ہیں لیکن یہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے- اکثر حالات میں انسانی اختلافات کے پیچھے خود غرضی کے، بیرونی محرکات، گروہی یا قومی مفادات، باپ دادا سے ملی ہوئی جامد روایات اور تعصب کی بے شمار دوسری صورتیں ایک غیر صحت مندانہ انداز میں کارفرما ہوتی ہیں- اور انسانی اخلاق کی سب سے بُری وبا یہ ہے کہ انسان بسا اوقات اچھے کام بھی کرتا ہے تو غلط اور باہر کے محرکات کے زیر اثر! اس لیے "عقائد" کے ان اختلافات کے تصفیے کی

عملی شکل یہ ہوگی کہ ان عقائد کے محرکات کو کھول کر سامنے لایا جائے۔ چونکہ آخرت کے روز انسان کا تمام اندرون شفاف ہو جائے گا، یہ محرکات بھی کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ سچ کی اس گھڑی میں سچ بھی سامنے آ کے رہے گا اور اس مضمون پر قرآن میں متعدد آیات ہیں:

"ان سے کہہ دو کہ جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہو گی، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہ ہوگی۔ کہو ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ وہ خوب فیصلہ کرنے والا اور صاحب علم ہے۔ (سبا ۳۴: ۲۵-۲۶)

"جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابئ اور نصاری اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا، ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا کہ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔" (الحج ۲۲: ۱۷)

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآن اکثر اس دن کو "یوم الفصل" (فیصلے کا دن) کہتا ہے، یعنی صحیح اور غلط کے درمیان نہ صرف اعمال بلکہ عقائد اور زندگی کے مقاصد کے تعین میں بھی (الصافات ۳۷: ۲۱، الدخان ۴۴: ۴۰، المرسلات ۷۷: ۱۳، ابراہیم ۱۴: ۷۸) اس معاملے سے براہ راست متعلق وہ آیات بھی ہیں جو عام طور پر یہ بتاتی ہیں کہ "جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے ان کا فیصلہ کیا جائے گا" (آل عمران ۳: ۵۵، البقرہ ۲: ۱۱۳، المائدہ ۵: ۴۸، الانعام ۶: ۱۶۵، النحل ۱۶: ۳۹، الحج ۲۲: ۶۹، یونس ۱۰: ۹۳، السجدہ ۳۲: ۲۵) آنحضرتؐ سے کہا جاتا ہے "اے پیغمبر! تم بھی مرجاؤ گے اور یہ بھی مرجائیں گے پھر تم سب قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھگڑو گے۔" (الزمر ۳۹: ۳۰-۳۱)

اہل مکہ کے ان اعتراضات، نیز آخرت اور یوم حساب کے عقیدے کے بارے میں ان کو جو مشکلات درپیش تھیں، ان کو دور کرنے کے لیے قرآن عمومی طور پر خدا کی قدرت کاملہ سے دلائل مہیا کرتا ہے۔ جس خدا نے آسمان اور زمین پیدا کیے اور جس نے اس کائنات میں زندگی کی بے شمار دوسری صورتیں پیدا کیں وہ انسان کو اور زندگی کی ہنوز نامعلوم دوسری صورتوں کو پھر سے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

"کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا، اور پھر وہ

صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا- اور ہم پر مثالیں چسپاں کرنے لگا اور اپنی
پیدائش کو بھول گیا- کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ
ہو چکی ہوں؟ کہہ دو کہ انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں پیدا
کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے- وہی جس نے ہرے بھرے درخت
سے تمہارے لیے آگ پیدا کی اور تم اس سے اپنی آگ روشن کرتے ہو-
کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان
جیسوں کو پیدا کر سکے- کیوں نہیں، جبکہ وہ اعلیٰ تخلیق کار ہے- وہ تو جب
کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا
اور وہ ہو جاتی ہے، پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا کامل
اختیار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو-"
(یٰس ۳۶:۷۷-۸۳)

یہ بات کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کہ موت اور زندگی ایک دوسرے کے بعد آئیں، اسی طرح جیسے سبز لکڑی میں سے وہ آگ کے شعلے پیدا کر سکتا ہے، اس بات کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ وہ روشنی اور اندھیرے کو، دن اور رات کو ایک دوسرے کے بعد لے آتا ہے، اور اصل میں اسی طرح وہ قوموں کے عروج اور زوال کے اسباب پیدا کرتا ہے اور ٹھیک اسی طرح جیسے یہ آخری دو فینامینا نیچرل ہیں، جبھی ہم ان کے بارے میں سوال نہیں کرتے، اسی طرح قیامت اور زندگی کی نئی صورتوں کی تخلیق کو بھی ایک نیچرل حقیقت سمجھنا چاہیے اس لیے کہ اس کائنات کا اخلاقی ڈھانچاہی ایسا ہے:

"کہو خدایا! بادشاہی کے مالک، تو جسے چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے
چاہے چھین لے- جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے-
تیرے ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی ہے- بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے- تو
رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں- جاندار میں سے بے
جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو- اور جسے چاہتا ہے بے
حساب رزق دیتا ہے-" (آل عمران ۳:۲۷، اسی طرح دیکھئے الحج ۲۲:۶۱،
لقمان ۳۱:۲۹، الفاطر ۳۵:۱۳، الحدید ۵۷:۶)

مردوں کو زندہ کرنے کی ایک موثر اور زوردار مثال جو قرآن نے دی ہے وہ زمین کا جاڑوں میں مردہ رہنے کے بعد موسم بہار میں اس کا جی اٹھنا ہے "وہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔" (الروم ۳۰:۱۹، ۲۴، ۵۰، الحدید ۵۷:۱۷) یہاں ہم نیچے پوری سورہ ق ۵۰ کا ترجمہ دیتے ہیں، جس کا مضمون انسان کا موت کے بعد اٹھایا جانا ہے اور جو اس موضوع پر قرآن کا سب سے طویل بیان ہے:

"ق، قسم ہے قرآن مجید کی، ان لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا انہی میں سے ان کے پاس آ گیا۔ تو منکرین کہنے لگے یہ تو عجیب بات ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو پھر زندہ کیسے جائیں گے؟) یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے۔ زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمیں معلوم ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔ بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا تھا اسی وقت اسے جھٹلا دیا تھا، اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔

کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور اسے آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ رکھ دیئے اور ہر طرح کی خوشنما چیزیں اس میں اگائیں۔ یہ ساری چیزیں ہر اس بندے کے لیے آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔ اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے، اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ ہوتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا، اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اسی طرح ہوگا۔

لن سے پہلے نوح کی قوم، اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی اور ایکہ والے اور تبع کی قوم بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ہر ایک نے

رسولوں کو جھٹلایا تو میری وعید بھی ان پر چسپاں ہوگئی-
کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم تھک گئے تھے-نہیں، بلکہ یہ لوگ ایک نئی تخلیق کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں-
ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے دل میں کیا وسوسے ابھرتے ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں-
جب دو اخذ کرنے والے فرشتے اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے اخذ کرتے رہتے ہیں-کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو-
اور وہ موت کی جانکنی حق لے کر آ پہنچی- یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا- اور پھر صور پھونکا گیا- یہ وہی دن ہے جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا- اور ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا- اس چیز کی طرف سے تو غفلت میں تھا تو ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا چنانچہ آج تیری نگاہ خوب تیز ہے- اور اس کے ساتھی نے عرض کیا یہ وہ روزنامچہ ہے جو میرے پاس تیار ہے- حکم دیا گیا کہ پھینک دو جہنم میں ہر سرکش کافر کو، جو بھلائی کو روکنے والا تھا، حد سے تجاوز کرنے والا تھا اور شبے میں ڈالنے والا تھا- جس نے اللہ کے سوا دوسرا معبود بنا لیا تھا پس ڈال دو اسے سخت عذاب میں- اس کے ساتھی نے عرض کیا خداوند! میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا، بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا- جواب میں ارشاد ہوا: میرے حضور جھگڑا نہ کرو میں تم کو پہلے ہی عذاب کی وعید بھجوا چکا تھا- میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں-
وہ دن جب ہم جہنم سے پوچھیں گے، کیا تو بھر گئی ہے اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟ اور جنت متقی لوگوں کے قریب لے آئی جائے گی، اور وہ کچھ بھی دور نہ ہوگی- ارشاد ہوگا: یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس

شخص کے لیے جو بہت رجوع ہونے والا اور پابندی کرنے والا ہو۔ اور جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا رہا اور رجوع لانے والا دل لے کے آیا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ، یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہوگا۔ وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ان کے لیے ہے۔

اور ہم نے ان سے پہلے کئی امتوں کو ہلاک کر دیا، جو ان سے بہت زیادہ طاقتور تھیں، انہوں نے دنیا کے ملکوں کو چھان مارا کہ کہیں بھاگنے کا ٹھکانا بھی ہے۔ اس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہو یا وہ باشعور ذہن کے ساتھ بات کو سنے۔

ہم نے زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔ پس اے نبی، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے، اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور نمازوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔ اور سنو جس دن (موت کی) منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا، جس دن تمام انسان فی الواقع وہ آوازہ سن رہے ہوں گے۔ وہ زمین سے مُردوں کے نکلنے کا دن ہوگا۔ ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی سب کو پلٹنا ہے، جس دن زمین پھٹ پڑے گی اور وہ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔ یہ ایسا جمع کرنا ہے جو ہمارے لیے آسان ہے۔ اے نبی! جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعے ہر شخص کو نصیحت کرو جو میری وعید سے ڈرے۔" (سورہ ق: ۵۰)

چونکہ خدا ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے، اس لیے اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ وہ اپنے خیالات اور محرکات وغیرہ دوسرے لوگوں سے چھپا سکتا ہے بلکہ وہ بسا اوقات

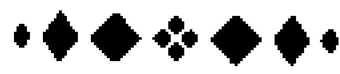
اپنے آپ سے ہی چیزیں چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنی صورت حال کی سچائی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا- لیکن اس دن اس کا اندرون کھل کر سامنے آ جائے گا- اس لیے کہ اس گھڑی میں کوئی شخص بھی ذہنی طور پر کوئی چیز چھپا کے نہیں رکھ سکے گا- اس دن گواہی کے متعلق اور انسان کی اندرونی شخصیت کے شفاف ہو جانے کے متعلق قرآن میں جو کچھ آیا ہے وہ ایک ہی نکتے کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ انسان کو اپنے اعمال اپنے خیالات اور ارادوں کی ذمہ داری ضرور قبول کر لینی چاہیے- لیکن وہ دن فیصلے کا دن ہوگا- کسی کو یہ موقع نہیں ملے گا کہ کسی چیز کو بدل دے یا کوئی نئی کارکردگی دکھادے یا اپنی ناکامیوں کی تلافی کر لے- اس لیے کہ اس کے لیے واحد موقع یہاں ہے، اب، اس زندگی میں، جو صرف ایک بار دی جاتی ہے (کیونکہ قرآن کرم یا بار بار پیدا ہونے اور مرنے کے سلسلے کو نہیں مانتا) چنانچہ یہ واحد زندگی ہی وہ زندگی ہے جہاں انسان کام کر سکتا ہے، کما سکتا ہے یا وہ بیج بو سکتا ہے جو آخرت میں پھل لائیں گے-

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رو سے یہ بے حد لازم ہے کہ اس زندگی کو سنجیدگی سے لیا جائے اور اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے کہ انسان اپنے منفی ارادوں اور اپنی کوتاہیوں کو چاہے کتنا ہی چھپا کے رکھے، خدا ان سے بخوبی واقف ہے جیسا کہ قران بار بار کہتا ہے، اس لیے انسان کے پاس ایک ایسی اندرونی مشعل ہونی چاہیے جو اسے حق اور باطل اور انصاف اور بے انصافی کے درمیان تمیز کرنا سکھائے اور یہ وہ چیز ہے جسے قرآن ''تقویٰ'' کہتا ہے- ایک بہت ہی اہم اصطلاح، بلکہ تین یا چار اہم ترین اصطلاحات میں سے ایک- اگر چہ انسان کے کردار پر آخری فیصلہ، اور وہ آخری معیار جس پر اسے پرکھا جانا ہے، دونوں اس کی ذات سے باہر کے معاملات ہیں، اور اس حقیقت کا ادراک تقویٰ کے معنی کا ایک ضروری جزو ہے- تاہم اس ادراک کا مطلب ہے کہ انسان کے ضمیر کی اتنی تربیت تو ہو چکی ہے کہ جہاں یہ اندرونی مشعل روشن ہو جاتی ہے- مشعل کے نور کی طرح تقویٰ کے بھی مدارج ہو سکتے ہیں- ایک سیدھی سادی پارسائی کے نقطۂ آغاز سے لے کر ایک بلند مقام تک جہاں انسان مکمل طور پر اپنے ذہن اور ضمیر کی حالت کا ایکس رے کر سکتا ہے-

قرآن کے تیز اور پُر اثر بیان کے مطابق قیامت کے روز جس طرح انسان کے اندروں کو کھول کر سب کے سامنے لایا جائے گا، قرآن چاہتا ہے کہ اس زندگی میں بھی یہی کچھ واقع ہونا چاہیے- اس لیے کہ ایک شخص جو صحیح طریقے سے اپنے آپ کا ایکس رے لے سکتا ہے اور نتیجۃً اپنی اندرونی حالت کو تشخیص کر سکتا ہے اگر اس کا اندرون سب کے سامنے کھل کر آ بھی جائے تو اسے کسی

طرح کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔صرف وہ لوگ جو اپنا اندرون اس دنیا میں چھپاتے ہیں۔اکثر حالات میں کامیابی کے بغیر،اس لیے کہ وہ دوسروں سے چھپانے میں اتنا کامیاب نہیں ہوتے جتنا اپنے آپ سے چھپانے میں۔انہیں روز آخرت سے ضرور ڈرنا چاہیے۔اسی لیے قرآن سورہ ق ۵۰ میں کہتا ہے "تو اس (حساب کتاب،ایکس رے) سے غافل ہو رہا تھا۔اب ہم نے تجھ پر سے پردہ ہٹا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔" (آیت ۲۲) قرآن کی اصل کوشش انسان کے لیے یہ ہے کہ وہ یہ "تیز نگاہ" یہاں اور اسی دنیا میں اپنے اندر پیدا کر لے،جہاں عمل کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع میسر ہیں۔لیکن فیصلے کے روز ان حالات کو ٹھیک کرنے کا وقت باقی نہیں رہے گا اور بہت دیر ہو جائے گی۔وہاں تو انسان کاٹ رہا ہوگا نہ کہ بو رہا ہوگا یا پرورش کر رہا ہوگا۔چنانچہ،ایک فرد کی قسمت کا جہاں تک تعلق ہے،وہاں تو ابدی کامیابی یا ناکامی کی،اور دائمی آگ کی یا باغ بہشت کی بات ہو سکتی ہے جیسا کہ مولانا جلال الدین رومی نے کہا ہے:

اگر تم قیامت کو دیکھنا چاہتے ہو تو خود قیامت بن جاؤ
اس لیے کہ کسی چیز کو دیکھنے کی یہی شرط ہوا کرتی ہے



باب ھفتم

شیطان اور شر

شر، جو خیر کا متضاد ہے اور جس کا انسان ارتکاب کرتا ہے، اس کے بارے میں ہم انفرادی اور اجتماعی انسانی کردار پر بات کرتے ہوئے اظہار خیال کر چکے ہیں- یہاں ہم شر کی 'اصل' پر بات کریں گے جسے قرآن شخصیت عطا کرتا ہے اور اسے ابلیس یا شیطان کے نام سے پکارتا ہے- اگر چہ موخر الذکر تجسیم (شیطان) اول الذکر (ابلیس) کے مقابلے میں کافی کمزور ہے- قرآن، خاص طور پر اپنی مکی سورتوں میں اکثر شیطان کا ذکر جمع کے صیغے (شیاطین) میں کرتا ہے جو بعض اوقات، غالباً استعارے کے طور پر، انسانوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے- ''لیکن جب وہ علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں'' (البقرہ۲:۱۴) ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطان انسانوں اور شیطان جنوں میں سے دشمن بنایا ہے-'' (الانعام۶:۱۱۲)

لیکن اگر شیطان کا لفظ انسانوں کے لیے استعارہ قرار دیا جائے تو کیا جنوں کے لیے بھی استعارہ ہے؟ ڈاکٹر الفورڈ ویلچ اپنی مفید لیکن اب تک غیر مطبوعہ کتاب The Pneumatology of the Quran میں (جو فرشتوں، شیطان اور جنوں سے بحث کرتی ہے) پانچویں باب میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جن کو قرآن سورہ الشعراء ۲۶ کی آیت ۹۵ میں جنود ابلیس (شیطان کے لشکر) کہتا ہے وہ جن ہیں، جو کہتے ہیں ''ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہرے داروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے اور یہ کہ پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ بنا لیتے تھے مگر اب جو چوری چھپے کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے-'' (الجن۷۲:۸-۹) یہ اس لیے ایسا ہے کہ قرآن

میں متعدد آیات اس بارے میں ہیں کہ شیاطین آسمانوں سے چوری چھپے خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہاں سے بھگا دیئے جاتے ہیں (الحجر ۱۵:۱۷، الملک ۶۷:۵، الجن ۷۲:۸-۹ وغیرہ)

یہ امر کہ جن ایک ایسی مخلوق ہے جو کم وبیش بنی نوع انسان کے متوازی ہے سوائے اس کے کہ وہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں اور انسان پکائی ہوئی مٹی سے، قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے (الاعراف ۷:۱۲، الرحمان ۵۵:۱۴-۱۵) قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ ابلیس ''جنات میں سے تھا اور وہ اپنے پروردگار کے حکم سے نکل گیا'' (الکہف ۱۸:۵۰) چنانچہ ڈاکٹر ویلچ کا نقطہ نظر کسی حد تک معقول ہے- بشرطیکہ اس کا اطلاق صرف بعض جنات پر کیا جائے- اس لیے کہ قرآن میں جنات کا تصور انسانوں کے متوازی مخلوق کا ہے اور خدا کے پیغامات کے وہ بھی مخاطب ہوتے ہیں، اگرچہ شاید ثانوی طور پر!

> ''اور جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تا کہ وہ قرآن سنیں- تو جب وہ قرآن کی تلاوت میں پہنچے تو آپس میں کہنے لگے کہ خاموش ہو جاؤ- اور جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس گئے کہ ان کو نصیحت کریں- انہوں نے ان سے کہا: اے قوم ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اتری ہے اور وہ اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور جو حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے- اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچا دے گا-'' (الاحقاف ۴۶:۲۹-۳۱)

خود سورہ الجن ۷۲ میں، جہاں جنات کہتے ہیں کہ وہ آسمان میں ملا اعلیٰ کی باتیں کان لگا کر سنا کرتے تھے اور یہ کہ اب کوئی ایسا نہیں کر سکتا، اس سورہ کے آغاز میں وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کو اس کی بہترین تعلیمات کی بنیاد پر قبول کرلیا ہے- ایک دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اس سورہ میں بھی اور ان آیات میں بھی جو ہم نے سورہ احقاف ۴۶ سے نقل کیں خود پیغمبر کو کہیں نہیں دکھایا گیا کہ انہوں نے جنوں کو براہ راست دیکھا ہو یا انہیں سنا ہو، خدا ہی ان کو بتاتا ہے کہ جنوں نے کیا کہا یا کیا

کیا- پھر سورہ الجن ۷۲ میں جنات کی زبانی کہا گیا "اور یہ کہ ہم میں سے کوئی نیک ہیں اور کوئی اس سے کمتر درجے کے" (الجن ۷۲:۱۱) اور یہ کہ "جب ہم نے ہدایت کا پیغام سنا، ہم اس پر ایمان لے آئے ----- اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف" (الجن ۷۲:۱۳-۱۵) چنانچہ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ سب کے سب جن یا ان کی اکثریت بھی قرآن کے نزدیک "ابلیس کے لشکر" یا اپنے مقام سے گرے ہوئے فرشتے ہیں- اگر چہ یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر جنات انسانوں سے زیادہ برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں-

قرآن میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں کہ جنات کی طرف براہ راست یا ان کی اپنی نوع سے پیغمبر بھیجے گئے ہوں- اس بات سے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور محمدؐ پر ایمان لے آئے تھے اور یہ کہ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے غلام مزدور کا کام کیا تھا (سبا ۳۴:۱۲،۱۴) یہ دکھائی دیتا ہے کہ باوجود اپنی آتشی جبلت اور بہت زیادہ جسمانی قوتوں کے (جن میں ان کی دکھائی نہ دینے کی صلاحیت بھی شامل ہے) وہ بنیادی طور پر انسان سے مختلف نہیں ہیں، سوائے اس کے کہ وہ برائی اور حماقت کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں- قرآن اکثر ان سے انسانوں کے ساتھ خطاب کرتا ہے، یا ان کا انسانوں کے ساتھ جوڑا بنا دیتا ہے (الانعام ۶:۱۳۱، الاعراف ۷:۳۸،۱۷۹، بنی اسرائیل ۱۷:۸۸، النمل ۲۷:۱۷، حم السجدہ ۴۱:۲۵، ۲۹، الاحقاف ۴۶:۱۸، الرحمان ۵۵:۳۳، الذریات ۵۱:۵۶) سورہ سبا ۳۴ کی آیت ۴۱ اور سورہ الانعام ۶ کی آیت ۱۰۰ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے کم از کم بعض عرب جنوں کی پرستش کرتے تھے اور سورہ الحجر ۱۵ کی آیت ۲۷، اسی طرح سورہ الاعراف ۷ کی آیت ۱۲ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنات انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے- کیا جنات ارتقاء کے سلسلے کا کوئی پہلا مرحلہ ہو سکتے ہیں؟ جو کچھ بھی ہو جنات کا ذکر قرآن کے مدنی زمانے میں ختم ہو جاتا ہے اور قرآن اپنے آپ کو "انسان کے لیے ہدایت" کہتا رہتا ہے اور جنات سے خاص طور پر یا براہ راست خطاب نہیں کرتا (جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں ان دو آیات میں جہاں جنات کے قرآن سننے کا ذکر ہے، پیغمبرؐ نے خود ان کا مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ قرآن نے اس کے متعلق اطلاع دی تھی)

جہاں تک شیطان کا تعلق ہے جیسا کہ ہم نے باب دوم میں آدم کی تخلیق کے واقعے کے ضمن میں کھول کر بتایا، وہ انسان کا ہم عصر ہے، اگر چہ وہ آدم سے پہلے جن کی صورت میں موجود تھا- یہ بات ایک بنیادی اخلاقی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ خیر اور شر کے درمیان جو کشمکش

ہے وہ انسان اور صرف انسان کے لیے حقیقت ہے، چنانچہ قرآن شیطان کا ذکر خدا کے حکم سے بغاوت کرنے والے کے طور پر کرتا ہے لیکن انسان کے حریف اور دشمن کے طور پر، نہ کہ خدا کے دشمن کے طور پر، اس لیے کہ خدا شیطان کی پہنچ سے اتنا دور ہے کہ وہ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ انسان ہی ہے جو اس کا اصل نشانہ ہے اور یہ انسان ہی ہے جو یا تو اس پر فتح حاصل کر سکتا ہے یا اس سے شکست کھا سکتا ہے۔ چنانچہ مابعد الطبیعیاتی اصطلاح میں شیطان خدا کا ہم درجہ (Coordinate) نہیں ہے (جس طرح کہ زردشتی اہرمن، جو یزداں کا مساوی سطح پر حریف ہے) اس لیے قرآن بار بار انسان کو یہ تنبیہ کرتا ہے کہ اسے شیطان کے خلاف کشمکش کرنی ہے:

''آخر کار شیطان ان دونوں کو وہاں سے پھسلا کر اور جس حالت میں وہ تھے وہاں سے نکلوا دیا اور ہم نے ان سے (یعنی آدم علیہ السلام اور شیطان سے) کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو''
(البقرہ ۲:۳۶، پھر دیکھئے سورہ الاعراف ۷ کی آیات ۲۲-۲۴)

''لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' (البقرہ ۲:۱۶۸)

''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے'' (البقرہ ۲:۲۰۸ اسی طرح دیکھئے الانعام ۶:۱۴۳)

''شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔'' (یوسف ۱۲:۵، بنی اسرائیل ۱۷:۵۳)

''کیا تم شیطان کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔'' (الکہف ۱۸:۵۰)

''شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو۔'' (الفاطر ۳۵:۶)

قرآن سے انسان کو جو سب سے نمایاں تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ شیطان کی کارروائیاں تمام انسانی زندگی میں پوری طرح نفوذ کیے ہوئے ہیں اور یہ کہ انسان کو ہمیشہ چوکنا اور محتاط رہنا چاہیے۔ جب کبھی انسان کی ذات اپنا تناؤ ڈھیلا کرتی ہے تو شیطان کے بہکاوے میں آ جاتی ہے۔ اگرچہ ہر انسان کسی نہ کسی درجے میں اور ایک طرح سے اصولی طور پر شیطان کی ترغیب اور بہکاوے کی زد میں رہتا ہے لیکن وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (یعنی اخلاقی خطرے کے سامنے محتاط ہوتے

ہیں) وہ برائی میں نہیں پڑتے بلکہ شیطان کی چالوں اور تدبیروں سے جلدی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے پیغمبرؐ سے کہا جاتا ہے کہ "اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کسی طرح کا وسوسہ پیدا ہو تو اللہ سے پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا جب شیطان کی طرف سے کوئی برا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے۔" (الاعراف ۷: ۲۰۰-۲۰۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کی ساری کارستانی لازماً اسی بات پر مشتمل ہے کہ وہ کسی شخص کو ذہنی پراگندگی میں مبتلا کر دے اور عارضی طور پر (یا برے لوگوں کے معاملے میں ہمیشہ کے لیے) اس کی محسوس کرنے کی اندرونی صلاحیتوں کو کند کر دے۔ قرآن البتہ اس معاملے میں صاف صاف کہتا ہے کہ اگر چہ اصولی طور پر کوئی بھی انسان شیطان کے اثر سے پوری طرح محفوظ نہیں ہے تاہم اسے ان لوگوں پر کوئی قابو نہیں ہے جو اپنی اخلاقی استقامت پر اس کے حملے کے خلاف چوکنے رہتے ہیں۔ چنانچہ خدا نے شیطان سے فرمایا "بے شک میرے جو مخلص بندے ہیں ان پر تجھے کوئی قدرت نہیں۔ سوائے البتہ ان لوگوں کے جو گمراہ ہیں اور تمہارے پیچھے چل پڑے ہیں" (الحجر ۱۵: ۴۲، دیکھئے سورہ بنی اسرائیل ۱۷، آیت ۶۵) پھر کہا: "جو مومن ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں، ان پر اس کا کچھ زور نہیں چلتا" (النحل ۱۶: ۹۹)

شیطان کے مکر و حیلے ہی مضبوط نہیں ہیں، یہ انسان کی کمزوری اور اخلاقی جرات اور چوکسی کی کمی ہے جو شیطان کو اتنا طاقتور ظاہر کرتی ہے۔ قرآن کی رو سے شیطان کے بہکانے کی اس کارروائی کا اصل سبب اس کی مایوسی اور امید کا مکمل فقدان ہے۔ اسی طرح جیسے اس کا متضاد (فخر) بھی ایک شیطانی کام ہے۔ پہلے شیطان نے فخر کی وجہ سے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ وہ آدم سے برتر ہے۔ جب خدا نے اسے فخر کرنے پر لعنت ملامت کی تو وہ مایوس ہو گیا اور ہر طرح کی امید کے فقدان کی علامت بن گیا۔

> "خدا نے کہا: اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا۔ اس نے کہا: میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔ خدا نے کہا: اچھا تو نکل جا یہاں سے کہ تو مردود ہے اور اب روز جزا تک تم پر لعنت ہے۔ اس

نے کہا: میرے رب اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے اس روز تک کے لیے مہلت دے جبکہ سب انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے- فرمایا: اچھا تمہیں مہلت ہے اس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے- وہ بولا: میرے رب جیسا تو نے مجھے راستے سے الگ کیا، میں بھی زمین میں لوگوں کے لیے (گناہوں کو) آراستہ کر کے دکھاؤں گا اور ان سب کو بہکاؤں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جن کو تو نے ان میں سے خالص کرلیا ہو-" (الحجر۱۵:۳۲-۴۰)

شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لیے جو بے جگری سے تدبیریں کرتا ہے ان میں اس کی کامل مایوسی کا اظہار ہوتا ہے-" شیطان نے کہا: بس تو جیسا تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا- آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا-" (الاعراف ۷:۱۷)

چنانچہ ابلیس یا شیطان طاقتور ہونے سے زیادہ چالاک اور ہوشیار، سیدھے طریقے پر چیلنج کرنے والے سے زیادہ دھوکے باز اور سازشی، اور جنگ لڑنے والے سے زیادہ بہکانے والا، دغا باز اور گھات میں بیٹھنے والا دکھائی دیتا ہے- یہی وجہ ہے کہ وہ روز قیامت ان لوگوں سے جو اس پر انہیں گمراہ کرنے کا الزام لگائیں گے، کہے گا" اللہ نے جو وعدے تم سے کئے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کئے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا- میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے صرف اپنے راستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور وہ تم نے قبول کر لی- اس لیے اب مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو- یہاں نہ میں تمہاری کوئی فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو- اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں" (ابراہیم۱۴:۲۲) جیسا کہ میں نے کہا ہے، شیطان کی طاقت کی تعبیر انجام کار انسان کی کمزوری کے معنوں میں کی جانی چاہیے اس لیے کہ اس میں اپنی اصل طاقت بہت کم ہے- اس کی سب سے بڑی کارگر تدبیر اس بات میں ہے کہ وہ دنیا کی غلاظت اور کثافت پر گوٹا کناری لگا کر اسے بہت خوبصورت اور خوشنما بنا کر پیش کرے اور جو صحیح معنوں میں مفید اور ضروری ہے اسے بوجھل اور خوفناک بنا کر دکھائے- قرآن بتاتا ہے:" اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم

کر رہے ہو خوب کر رہے ہو" (الانعام ۶:۴۳) "اور جب شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے" (الانفال ۸:۴۸، اسی طرح النحل ۱۶:۴۳، النمل ۲۷:۲۴، العنکبوت ۲۹:۳۸، محمد ۴۷:۲۵) "وہ دراصل شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔" (آل عمران ۳:۱۷۵)

چنانچہ یہ انسان پر منحصر ہے کہ شیطان کتنا طاقتور ہوگا اور ہم نے انسان کی اپنی کمزوری پر باب دوم میں بات کی ہے۔ خود شیطان کو قرآن خدا کا باغی قرار دیتا ہے (الصافات ۳۷:۷، الحج ۲۲:۳، النساء ۴:۱۱۷) لیکن یہ آخرکار اس کی مایوسی کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہم ابھی دیکھ آئے ہیں کہ آخری فیصلے کے دن وہ اپنی کوششوں کے بے سود ہونے کا اعتراف کرے گا اور یہ کہ حقیقت میں اسے انسانوں پر کوئی غلبہ حاصل نہیں تھا۔ قرآن کہتا ہے: "شیطان جو وعدے ان سے کرتا ہے وہ سب دھوکا ہے" (بنی اسرائیل ۱۷:۶۴، النساء ۴:۱۲۰) جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے وعدوں میں کوئی ٹھوس حقیقت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ "جو لوگ ایمان لائے وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ شیطان (طاغوت) کی راہ میں لڑتے ہیں، تو اے مومنو، شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں" (النساء ۴:۷۶) اس یقین سے کہ برائی اپنی اصل میں کمزور ہوتی ہے اور سچائی طاقتور ہوتی ہے قران کا یہ ناقابل تسخیر یقین جنم لیتا ہے کہ جھوٹ اور برائی شکست کھا سکتے ہیں اور شکست کھا کر رہیں گے۔ "یہ لوگ شیطان کی پارٹی ہیں، خبردار رہو کہ شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہیں گے" (المجادلہ ۵۸:۱۹) "اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے" (المائدہ ۵:۵۶) "خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں، خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔" (المجادلہ ۵۸:۲۲)

پھر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، شیطان اپنے ساتھیوں کے ساتھ غداری کرے گا اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔ مزید برآں شیطان انسان کو وقت پر دغا دے گا (الفرقان ۲۵:۲۹) اس زندگی میں بھی، جب انسان اس کی تدبیروں کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے، شیطان اس کی کچھ بھی ذمہ داری اپنے آپ پر لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ "ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ پہلے وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر اور جب انسان کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری الذمہ ہوں، مجھے تو اللہ رب العالمین سے ڈر لگتا ہے" (الحشر ۵۹:۱۶) چنانچہ یہ شیطان کی قوت نہیں بلکہ

اس کی چکنی چپڑی باتوں کے مقابلے میں انسان کی کمزوری ہے جو اس کے لیے اصل خطرہ بن جاتی ہے- یہ زیب و آرائش اس کے دل اور دماغ کو اس طرح لبھاتی ہے کہ وہ اس فریب کی دنیا میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے یعنی اصل، حقیقی اور دور رس اور نتیجہ خیز مقاصد کو، دوسرے الفاظ میں اعلیٰ ترین اغراض کو! ہم نے باب دوم میں دیکھا کہ انسان خود کس طرح کوتاہ نظر اور محدود تصور رکھنے والا ہے، بلکہ یہی چیز وہاں اس کی سب سے بڑی کمزوری سمجھی گئی- اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جس کا شیطان فائدہ اٹھاتا ہے- اس طرح دیکھئے تو شیطان ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کے اندر موجود بُرے رجحانات کو تقویت دیتی ہے- جب دونوں مل جاتے ہیں تو سطح پر نظر آنے والا یہ ملاپ ناقابل تسخیر لگتا ہے- اگر انسان کو اس طاقتور اتحاد کو ختم کرنا ہے تو اس کے لیے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنے آپ کو خدا کے ساتھ وابستہ کر لے تاکہ وہ اپنی فطرت میں جو اچھے رجحانات لیے پھرتا ہے، انہیں طاقتور بنا سکے اور ترقی دے سکے-

شیطان کی مکارانہ چالبازیوں اور اس کے آخر کار بنجر اور بے ثمر ہونے کی وجہ سے- اس لیے کہ واقعتہً شیطان کی کوششیں اکثر بے نتیجہ ہوتی ہیں- قرآن انسان سے بار بار یہ کہتا ہے کہ "شیطان کے قدم بقدم نہ چلو" اس لیے کہ شیطان کے یہ قدم انسان کو سوائے اس کی تباہی کے کہیں نہیں لے جاتے- شیطان فی الواقع انسان کا اصل دشمن ہے- اس لیے شیطان کے ان قدموں کا مطلب ہے کوئی بھی برائی جس کا انسان ارتکاب کرتا ہے، چاہے وہ اسراف ہو، بدعنوانی ہو، جنگ ہو یا کوئی اور چیز! "لوگو! زمین میں جو چیزیں حلال طیب ہیں ان میں سے جو چاہو کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے-" (البقرہ۲:۱۶۸) اسی موضوع پر قرآن آگے کہتا ہے:

> "یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرا لیا- یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والے نہیں ہیں- وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اگائیں جن میں سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں

مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں- کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ
پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو اور اسراف نہ کرو کہ اللہ
اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا- پھر وہی ہے جس نے مویشیوں
میں سے وہ جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری اور بار برداری کا کام لیا جاتا
ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں- کھاؤ ان چیزوں
میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا
کھلا دشمن ہے-'' (الانعام۶:۱۴۰-۱۴۳، پھر دیکھئے بنی اسرائیل
۱۷:۲۷)''کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں-''

اسی طرح جنگ کے موضوع پر''اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ، اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو، کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے- اور جو صاف صاف نشانیاں تمہارے پاس آ چکی ہیں اگر ان کو پالینے کے بعد بھی تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے-'' (البقرہ۲:۲۰۸، ۲۰۹) منافقین بغاوت کے جو بیج مسلمانوں میں بونے کی کوششیں کرتے تھے ان پر بات کرنے کے بعد قرآن اخلاقی بدعنوانی کے متعلق کہتا ہے-''اے ایمان والو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، اس لیے کہ جو اس کی پیروی کرے گا تو وہ اسے فحش اور بدی کا حکم دے گا- اور اگر کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا- مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے'' (النور۲۴:۲۱) اسی طرح یہ آیت دیکھئے''اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوا دیا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تا کہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے- وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے- ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا یار ہمدم بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے-''(الاعراف ۷:۲۷)

یہ خیال کہ ایک انسان شیطان کے نقش قدم پر چل سکتا ہے یا چلتا ہے اس کے دو پہلو ہیں- پہلا یہ کہ شیطان کسی کو برائی کرنے پر مجبور نہیں کرتا، نہ وہ کر سکتا ہے، بلکہ وہ اپنے امکانی شکار کو ورغلانے یا ترغیب دینے کی کوشش کرتا ہے- اس کا یہ ورغلانا ان معنی میں ہوتا ہے کہ وہ سامنے کے سطحی مقاصد یا اس دنیا کے زندگی کے لالچ اور حرص کو اس طرح بنا کر پیش کرتا ہے کہ بہت سے

لوگ ان باتوں کو پسند کرنے لگتے ہیں اور ان کا شکار ہو جاتے ہیں- اکثر تو عارضی طور پر، تاہم بہت سے مستقل طور پر- ان موخر الذکر لوگوں کو شیطان کے ساتھی یا شیطان کی پارٹی کہا جاتا ہے- دوسرے یہ کہ شیطان کے یہ نقوش قدم شکار کی مکمل تباہی کے سوا اور کہیں نہیں جاتے- جس طرح کہ کسی حیلہ ساز کے نقوش قدم اس کے شکار کو کسی غار کی طرف لے جاتے ہیں- انسان کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ شیطان کے قدموں کے نشانات کو پہچانے کہ وہ ہیں کیا، ورنہ اس کے لیے اپنے آپ کو ابدی عذاب سے بچانا بہت مشکل، بلکہ ناممکن ہو جائے گا- اس طرح دیکھیں تو اصل مسئلہ خود انسان کے اندر ہی ہے، اس لیے کہ وہ خیر اور شر، جہالت اور علم، طاقت اور ناطاقتی کا امتزاج ہے (دیکھیے باب دوم میں انسانی تناؤ کے نظریے کا بیان) انسان کے دفاع کی اصل تقویٰ ہے جس کے لفظی معنی مدافعت کے ہیں، لیکن جو ایک طرح کی اندرونی روشنی ہے، ایک ایسا روحانی شعلہ ہے جسے انسان کو اپنے اندر ضرور روشن کرنا چاہیے تاکہ وہ صحیح اور غلط، نظر کے دھوکے اور حقیقت، اور فوری اور دائمی کے درمیان تمیز کر سکے- ایک دفعہ جب انسان یہ کر لیتا ہے- اور تقویٰ کے یقیناً مراتب ہو سکتے ہیں ____ تو وہ شیطان کے نقش قدم پہچاننے کے قابل ہو جاتا ہے کہ وہ کیا چیز ہیں اور پھر وہ ان سے دھوکا نہیں کھا سکتا-

یہ حقیقت کہ انسان اپنے اندر ضرور بدی کے اور نیکی کے رجحانات لیے پھرتا ہے اسے، فرشتوں سے ممتاز کرتی ہے جو بدی کے رجحانات سے خالی ہوتے ہیں اور اس لیے وہ خود بخود اچھے ہوتے ہیں، اور اسے جنات سے قریب کر دیتا ہے- اگرچہ جنات اس سے زیادہ بدی کی طرف مائل ہوتے ہیں- بہر صورت انسان کے اندر ان دو مختلف رجحانات کے درمیان کشمکش برپا رہتی ہے- لیکن بدی کا رجحان شیطان کے وجود کی معروضی حقیقت کی وجہ سے بہت طاقتور ہو جاتا ہے، شیطان جس کی چالبازیاں گوناگوں صورتیں اختیار کر لیتی ہیں (جن میں انسان کے اندر بے عملی کا سکون اور اپنی نیکی کے بارے میں خود طمانیت پیدا کرنا بھی شامل ہیں) اور جو اس وجہ سے کہ انسان میں سہل اور سامنے کے مقاصد کی طرف اندرونی رجحان پایا جاتا ہے (جس میں اس کی خود فریبی کی خطرناک صلاحیت بھی شامل کر لیجیے) اس کے سامنے برائی کو نیکی کا لباس پہنا کر پیش کر سکتا ہے اس طرح شیطان انسان کے اندر وہ بصیرت حاصل کرنے کی صلاحیت ختم کر دیتا ہے جسے قرآن تقویٰ کے نام سے موسوم کرتا ہے-

یہ انسان کے اندر کی بدی اور ایک معروضی شیطان کا باہم میل ہی ہے جو انسان کے لیے یہ از بس یہ ضروری کر دیتا ہے کہ وہ خدا سے وابستہ ہو جائے یا خدا سے مدد کا طلب گار ہو۔ قرآن کی رو سے خدا نہ صرف مدد کرتا ہے بلکہ یہ وعدہ بھی کرتا ہے کہ اس کی جماعت یا پارٹی ہی آخر میں کامیاب ہوں گے۔ ''اور جو اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کو رفیق بنا لے، اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔'' (المائدہ ۵:۵۶) جس طرح ہم پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ''شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں'' (المجادلہ ۵۸:۱۹)

موضوعی اور معروضی نیکی کے مدمقابل کے طور پر ایک موضوعی اور دوسری معروضی برائی کے تصور کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کا وجود بھی لازماً معروضی ہونا چاہیے۔ تاہم جیسا کہ ہم نے اس بحث کے آغاز میں کہا اگرچہ شیطان محض ایک استعارے کے طور پر انسان کے ''اندر'' موجود ہے، تاہم وہ اس کے ساتھ ساتھ ہے اور اس کے ہم عمر ہے، اس لیے کہ آدم سے پہلے شیطان نہیں تھا اور انسانی فطرت سے الگ اور غیر متعلق کوئی شیطان نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں شیطان کا سارا کام انسان کے اندر ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ اپنی تجویز، ترغیب اور دعوت کے ذریعے انسان کے ذہن کو متاثر کرتا ہے ''پھر شیطان نے ان کو بہکایا (یعنی آدم اور حوا کے ذہنوں میں شجر ممنوعہ کے بارے میں ایک خیال ڈالا) الاعراف ۷:۲۰، اسی طرح طٰہٰ ۲۰:۱۲۰، المومنون ۲۳:۹۷) لیکن انسان کے ذہن (یا غالباً اس کی سفلی جبلت) کے بارے میں بھی وسوسہ ڈالنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے (ق ۵۰:۱۶) بلکہ انسان کے سفلی طبائع کے متعلق صرف یہی نہیں کہا جاتا کہ وہ اسے برائی کی ترغیب دیتی ہیں بلکہ اسے برائی کا ارتکاب کرنے کا حکم دیتی ہیں'' (یوسف نے کہا) میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے سوائے اس کے کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میرا رب بڑا غفور اور رحیم ہے۔'' (یوسف ۱۲:۵۳) اس طرح کی آیات کو سامنے رکھتے ہوئے بعض مسلم مفکرین، خاص طور پر بہت سے صوفیہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شیطان درحقیقت انسان کے اندر ہے یا وہ انسان کی اپنی منفی ذات ہی ہے۔ لیکن ان آیات کی تعبیر غالباً یہ ہے کہ جب انسان کے اندر موجود امکانی برائی کو کوئی بیرونی طاقت ابھار کر طاقتور بنا دیتی ہے تو یہ دونوں مل کر ایک حقیقی ''بالادستی'' یعنی ایک ناقابل مزاحمت حقیقت بن جاتے ہیں۔

تاہم یہ سوال کہ شیطان برائی کا ایک معروضی سرچشمہ (Principle) ہے یا وہ ایک ''شخص'' ہے؟ اس کا جواب مشکل ہے۔ یقیناً برائی کو عام طور پر شخصیت کا رنگ دیا جاتا ہے، خاص طور پر آدم

کے قصے میں، جہاں اس کا اسم معرفہ ابلیس بتایا جاتا ہے- ابلیس نے خدا کی نہ صرف نافرمانی کی اور آدم کو ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ اس نے خدا کے ساتھ ایک خاصی طویل بحث بھی کی- لیکن بعد میں جب آدم اور حوا ممنوعہ پھل کھانے پر آمادہ ہوتے ہیں تو ان کی سرشت (Temper) کو ابلیس نہیں بلکہ شیطان کہا جاتا ہے جو برائی کے سرچشمے کا عام نام ہے اور چونکہ آدم کی تخلیق اور اس کے ہبوط کی کہانیاں صریحاً ایک ڈرامائی انداز میں پیش کی گئی ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن اس میں واقعی ''اشخاص'' کے بارے میں بات کر رہا ہے؟ آدم کی کہانی کے علاوہ (ص ۳۸:۷۴-۷۵، طٰہٰ ۲۰:۱۱۶، الکہف ۱۸:۵۰، بنی اسرائیل ۱۷:۶۱، الحجر ۱۵:۳۱-۳۲، الاعراف ۷:۱۱، البقرہ ۲:۳۴) ابلیس کا نام سورہ الشعراء ۲۶ کی آیت ۹۵ میں بھی آتا ہے ''تو پھر وہ معبود (جن کی خدا کے ساتھ پوجا کی جاتی ہے) اور یہ بھٹکے ہوئے لوگ (جو ان خداؤں کی پوجا کرتے ہیں) اور ابلیس کے لشکر، سب اوپر تلے جہنم میں دھکیل دیے جائیں گے (یہاں لشکر غالباً بُرے جنات اور انسان دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے) اور پھر سورہ سبا ۳۴ کی آیت ۲۰ میں آتا ہے ''اور ان کے بارے میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا (کہ وہ اس کا شکار ہوں گے) اس لیے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی سوائے ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا-'' (اس میں جنوبی عرب کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ارم کے سیلاب اور اس کے بعد کی مصیبتوں کا نشانہ بنے- اس دوسری مثال میں بھی شیطان کا لفظ ابلیس کی جگہ پر آ سکتا تھا- اس لیے کہ ابلیس کا لفظ آدم کی کہانی سے متعلق آیات کے مقابلے میں کہیں کم تر شخصی معنوں میں استعمال ہوتا ہے-

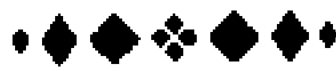
جہاں تک لفظ ''شیطان'' کا تعلق ہے، اگرچہ یہ عام طور پر مفرد ہی استعمال ہوتا ہے تاہم اس کا جمع کے صیغے میں استعمال بھی کم یاب نہیں ہے- جمع کے صیغے میں اس کا جو استعمال ہے وہ بعض حالات میں واضح طور پر بطور استعارے کے ہے- جیسا کہ ''انسانوں اور جنوں کے شیطانوں'' (الانعام ۶:۱۱۲) کے ٹکڑے میں آیا- یا ''جب وہ (منافقین) مومن لوگوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم صرف مذاق کر رہے تھے'' (البقرہ ۲:۱۴) بلکہ ''اور تمہارے رب کی قسم، ہم ان کو جمع کریں گے اور ان کے شیطانوں کو بھی'' (مریم ۱۹:۶۸) کیونکہ شیطان (بطور مفرد) نے خدا کی طرف سے قیامت کے دن تک مہلت پائی تھی، تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھ سکے، اس لیے بظاہر اس کے اٹھائے جانے کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے (نوٹ کیجئے کہ ''حشر'' (جمع کرنے کا)

لفظ آخرت کے سلسلے میں اٹھانے کے معنوں میں آتا ہے) تاہم بہت سے سیاق وسباق ایسے ہیں جن میں شیاطین کو استعارے کے طور پر نہیں لیا جاسکتا- جیسے "انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنالیا ہے" (الاعراف ۷:۳۰) یا الاعراف ۷ کی آیت ۲۷ "ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا سرپرست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لاتے" پھر یہ دیکھئے کہ بعض شیاطین نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے علاوہ دوسرے کام سرانجام دینے کے موتی لانے کے لیے غوطہ زنی کی (الانبیاء ۲۱:۸۲) اگرچہ یہاں غالباً بدسرشت جن مراد ہیں اس لیے کہ جن حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت کیا کرتے تھے (النمل ۲۷:۳۹)

بات یہ ہے کہ بعض لوگ---خصوصاً شعراء جو اپنے کلام میں تخیل کی بلندیوں کو چھونا چاہتے تھے- شیطانوں سے پیغام وصول کرتے تھے، جن سے حضرت محمد محفوظ تھے (اس کے باوجود کہ کوئی انسان، بشمول تمام پیغمبروں کے، اصولی طور پر شیطان کی پہنچ سے محفوظ نہیں رہا) جیسا کہ ہم سورہ الشعراء ۲۶ کے آخری رکوع میں دیکھتے ہیں اس "کتاب مبین" کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں- نہ یہ کام ان کو سجتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں- وہ اس کے سننے سے دور رکھے گئے ہیں" (یعنی جب وہ معتبر روح یا ملائکی نیچر، اسے ذہنی طور پر پیغمبر کو سناتی ہے دیکھئے باب پنجم) (الشعرا ۲۶:۲۱۰،۲۱۲) آگے کہا جاتا ہے "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترا کرتے ہیں؟ وہ ہر جعل ساز بدکار پر اترا کرتے ہیں جو (شیاطین کی خبریں سننے کے لیے) کان لگا دیتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹ بولتے ہیں- رہے شعراء تو ان کے پیچھے گمراہ لوگ چلا کرتے ہیں- کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں کہ جو وہ کرتے نہیں ہیں- سوائے ان کے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں" (الشعراء ۲۶:۲۲۱-۲۲۷) جس طرح خدا اپنا پیغام اپنے پیغمبروں کو وحی کرتا ہے اسی طرح شیاطین اپنے پیغامات اپنے بدکار پیروکاروں کو بھیجتے ہیں- اور جس طرح پیغمبر اپنے الوہی تعلق سے طاقت اخذ کرتے ہیں اسی طرح شریر اور بدنہاد لوگ اپنی طاقت شیطانوں سے اخذ کرتے ہیں- البتہ یہ طاقت جو سچائی پر مبنی نہیں ہوتی اس معنی میں غیر حقیقی ہوتی ہے کہ یہ الوہی طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور اسی لیے باطل ہوتی ہے- یعنی جھوٹی بھی اور قابل شکست بھی!

معروضی برائی کے لیے قرآن نے جو دوسرا نام استعمال کیا ہے وہ "طاغوت" ہے، جس کے معنی بظاہر برائی یا خدا کے مخالف کسی دوسرے سرچشمے کے ہیں (الزمر ۳۹:۱۷، النحل ۱۶:۳۶، البقرہ

۲۵۶:۲-۲۵۷، النساء۴:۵۱، ۶۰، ۷۶، المائدہ ۵:۶۰، سورہ البقرہ ۲ کی آیت ۲۵۷ میں یہ جمع کے صیغے میں استعمال کیا گیا ہے) یہ لفظ مکے کے آخری برسوں میں سامنے آنے لگتا ہے جہاں یہ دو دفعہ استعمال ہوتا ہے اور پھر مدنی زمانے میں آخر تک رہتا ہے جبکہ ابلیس کا نام تقریباً تمام کا تمام مکے میں ہی بولا جاتا ہے اور ابتدائی مدنی زمانے میں صرف ایک بار اس کا ذکر آتا ہے (البقرہ ۳۴:۲) جہاں تک شیطان کا تعلق ہے غالباً اس کے جمع کے صیغے میں تمام غیر استعاراتی استعمال بھی مکہ میں سامنے آتے ہیں (اس لیے کہ البقرہ کی آیت ۱۰۲ نیز اس کی آیت ۱۴ کو۔ جو مدینے کے ابتدائی دور کی ہیں۔ استعارے کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مدینہ میں ابلیس غائب ہو جاتا ہے، اسی طرح ''شیاطین'' بھی۔ ہاں 'شیطان' باقی رہتا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ ساتھ ''طاغوت'' کا استعمال زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ طاغوت ایک شخص سے زیادہ خدا کے مقابلے میں ایک معروضی سرچشمہ طاقت ہے۔ شیطان بھی وہی ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف یہ باور کرنا بھی ممکن ہے کہ بدی غیر خدا پرستانہ رویئے اور جرم کا اصل اصول اور اس کی طاقت ہے۔ لیکن جب یہ ایک خاص فرد سے متعلق ہو جاتی ہے یا اسے متاثر کرتی ہے تو یہ شخصیت کا روپ دھار کر شیطان بن جاتی ہے (فرشتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اس لیے کہ پورے قرآن میں فرشتوں کا ذکر نہ صرف واحد اور جمع دونوں صیغوں میں بطور اشخاص کے آتا ہے بلکہ بعضوں کے تو نام بھی بتائے گئے ہیں (البقرہ ۹۸:۲) اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ جبرئیل اور میکائیل فرشتے نہیں ہیں بلکہ فرشتوں سے بالاتر روحانی وجود ہیں۔ جیسا کہ ہم جبریل کے معاملے میں وحی کے وسیلے پر بحث کرتے ہوئے یہ مان چکے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن میں اس کا اشارہ کسی دوسرے فرشتے کی طرف نہیں ہوسکتا۔



باب ہشتم

مسلم امت کا ظہور

Snouck Hurgronje] نے لکھا] شروع میں محمدؐ کو یہ یقین تھا کہ وہ عربوں کی طرف وہی پیغام لے کر آئے تھے جو عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہنچایا تھا- اور عرب بت پرستوں کے خلاف بڑے اعتماد کے ساتھ انہوں نے ''اہل علم'' سے اپیل کی تھی- جن سے دریافت کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس کی تعلیمات کی سچائی کی تصدیق ہو جائے- لیکن مدینہ میں آ کر کچھ اور ہی صورت حال سامنے آئی- ''اہل کتاب'' نے اسے ماننے سے انکار کر دیا- چنانچہ محمدؐ کو اپنے لیے ایسی سند کی ضرورت پڑی جو ان لوگوں کے اختیار سے ماورا ہو، اور جو اس پر اب تک نازل شدہ وحی کے خلاف بھی نہ جائے- چنانچہ اس نے قدیم پیغمبروں کا سہارا لیا، جن کی امتیں اس کے خلاف نہیں جا سکتی تھیں (یعنی جن کی امتیں موجود ہی نہیں تھیں، جیسے ابراہیم، نوح وغیرہ)(۱)

مدینہ میں مسلم امت، یہودی اور مسیحی امتوں سے ایک علیحدہ وجود کی صورت میں کیسے ظہور پذیر ہوئی، اس کے بارے میں مغرب میں جدید اسلامی مطالعات کے ایک بڑے رہنما کی نگرانی میں جو نقطہ نظر تشکیل پاتا ہے، اوپر دیا ہوا عبارت کا یہ ٹکڑا اس کی ایک مثال ہے- یہ بیان جونولد یکے کی کتاب Geschiste des Qurans(۲) میں اظہار قبولیت کے ساتھ دیا گیا ہے، لگتا ہے کہ یہ بہت سے مغربی اسلامی سکالروں کے لیے ایک آبائی ورثے کی سی صورت اختیار کر گیا ہے،

(۱) یہ اقتباس نولد یکے کی Geschichte des Qurans (نیو یارک 1970) میں دیا گیا ہے حصہ اول صفحات ۱۳۶-۱۴۷)
(۲) دیکھئے اوپر کا نوٹ

جنھوں نے اسے اور زیادہ کھول کر بیان کیا ہے- یہ نظریہ ہمیں یہ تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ (۱) مدینے میں جب یہودیوں اور عیسائیوں نے (خاص طور پر یہودیوں نے) محمد کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا، تو انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کے مثالی پیکر سے اپیل کرنا شروع کی جنھیں انہوں نے یہودیت اور عیسائیت سے الگ کر لیا اور اسے خالصۃً اسلام کے لیے وقف کر کے مسلم امت کا تعلق براہ راست ان سے جوڑ لیا- (۲) کہ مکہ میں پیغمبر کو یقین تھا کہ وہ عربوں کو وہی تعلیم دے رہے تھے جو پہلے پیغمبروں نے اپنی امتوں کو دی تھی- اس کے بعد اس نظریئے کی مزید تفصیلات سامنے آئیں جو اس تبدیلی کو آنحضرتؐ کے پہلے موقف سے ایک بڑے بلکہ بنیادی انحراف کے طور پر پیش کرتی ہیں- جس کا نقطہ عروج اسلام کو قومیت اور عربی تہذیب کے رنگ میں رنگنا ہے(۳) جس کا اظہار نماز کے قبلے کا رخ یروشلم سے تبدیل کر کے مکہ کے کعبے کی طرف کرنا، اور کعبے کے حج کو اسلام کا ایک بنیادی فریضہ قرار دینا ہے- ان آخری بیانات پر انہی کی خاطر گفتگو نہیں کی جائے گی لیکن یہ دیکھا جائے گا کہ یہ ہماری اصل دلیل سے کہاں متاثر ہوتے ہیں-

یہ بات شروع میں کہہ دینی چاہیے کہ وہ واقعات جن پر اس کلاسیکی نظریئے کی بنیاد ہے، غلط نہیں ہیں- اس بحث میں البتہ ہمارا کہنا یہ ہوگا کہ یہ ہمارے مسئلے سے متعلق تمام حقائق نہیں ہیں- پھر یہ کہ چونکہ یہ تمام مادی حقائق نہیں ہیں اس لیے ان کو توڑا مروڑا گیا ہے اور ان کی غلط تعبیر کی گئی ہے چنانچہ جہاں یہ صحیح ہے کہ قرآن کو اس امر کا یقین تھا کہ اس کا پیغام ہو بہو اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے مطابق ہے وہاں نہ تو یہ بات صحیح ہے کہ اس کا پیغام صرف عربوں کے لیے ہے اور پہلے پیغمبروں کے پیغام صرف ان کی امتوں کے لیے ہوتے تھے، اور نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ جب بعد میں اسلام کا تعلق ابراہیم علیہ السلام سے جوڑ دیا گیا (جو کہ مکے میں ہوا، نہ کہ مدینے میں) تو قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے حوالے کر دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عیسائیوں کے، بطور ان کی ملکیت کے، اس لیے کہ یہودی (اور عیسائی) برابر مخالفت پر تلے ہوئے تھے-

نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ قبلے کی تبدیلی کا مطلب آنحضرت کی مذہبی جہت میں کوئی بڑی تبدیلی رونما ہونے کا تھا، اور یا اسے قومیت کا رنگ دینے کا- ایک بنیادی مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب پیغمبر کی زندگی اور قرآن اترنے کے زمانے کو دو علیحدہ اور جداگانہ ادوار میں دیکھا جاتا ہے- ایک

(۳) مثال کے طور پر F.Buhl کا مضمون Muhammad دی شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں-

مکی اور دوسرا مدنی، جس کی اکثر جدید سکالروں کو عادت پڑ گئی ہے۔ تاہم قرآن کا بغور مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک تدریجی ارتقاء اور ایک ہموار تبدیلی تھی، جس میں مکہ کے آخری دور اور مدینہ کے زمانے کے درمیان بنیادی ربط واشتراک دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ انسان دوسرے زمانے کو پہلے زمانے مین ''دیکھ'' سکتا ہے۔

قرآن سے یہ بات واضح ہے کہ بعض اہل مکہ پہلے ہی یہودیت، عیسائیت طرز کے کسی نئے مذہب کے خواہاں تھے۔ ''اگر چہ یہ لوگ کہا کرتے تھے، اگر ہمارے پاس وہ ''ذکر'' ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے۔ مگر (جب وہ آ گیا) تو انہوں نے انکار کر دیا'' (الصافات ۳۷:۱۶۷-۱۷۰) یہ صورت حال کچھ حد تک نتیجہ تھی اس بات کا کہ یہود عیسائی خیالات عرب ماحول میں نفوذ کر چکے تھے۔ یہ اس مذہبی خمیر کی موجودگی کا پتا دیتی ہے جو زیادہ روشن خیال افراد اور شاید گروہوں میں پایا جاتا تھا۔ اگر چہ تاریخ سے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ مکے میں یہودیوں یا عیسائیوں کی کوئی قابل لحاظ آبادی رہی ہو، تاہم یہ یقینی ہے کہ بعض افراد خدائے واحد کے تصور کی طرف مائل ہونے لگے تھے، اور بعض تو واقعی عیسائی ہو گئے تھے۔ لیکن قرآن جس بات کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے وہ ایک طرح سے کسی نجات دہندہ کے انتظار (Messianism) کی موجودگی ہے، ایک نئے عرب پیغمبر کی خواہش۔ ''یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے پاس آ جائے تو یہ کسی بھی دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہو جائیں گے۔ مگر جب خبردار کرنے والا ان کے پاس آ گیا تو اس سے ان کی نفرت اور بڑھ گئی۔'' (الفاطر ۳۵:۴۲)

یہ امر کہ اہل مکہ حضرت عیسیٰ کو یا حضرت موسیٰ کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے (شاید اس بنا پر کہ دوسری دو قوموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بہتر دکھانا چاہتے تھے، دیکھیے سورہ الانعام ۶ کی آیات ۱۵۷-۱۵۸) یہ بھی قرآن میں مذکور ہے۔ ''اور جب ابن مریم کی مثال دی گئی تو تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر شور مچا دیا اور کہنے لگے کیا ہمارے خدا بہتر ہیں یا وہ؟ یہ بات انہوں نے محض کج بحثی کے لیے کی ہے۔ وہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔'' (الزخرف ۴۳:۵۷-۵۸) پھر آتا ہے:

> ''کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کیے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر آئے تو وہ کہیں کہ اے پروردگار تو نے کیوں نہ ہماری طرف

کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے۔ مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے کیوں نہ اس کو وہی کچھ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ تو کیا یہ لوگ پہلے اس کا انکار نہیں کر چکے جو موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ہم ان میں سے کسی کو نہیں مانتے (دیکھئے سورہ سبا۹ آیت ۳۱" اور جن لوگوں نے کفر کیا کہتے ہیں، ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان (کتابوں) کو جو اس سے پہلے کی ہیں) اے نبی! ان سے کہو اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، تو میں اس کی پیروی کروں گا، اگر تم اپنی بات میں سچے ہو۔" (القصص ۲۸: ۴۷-۴۹)

یہ آیات چونکہ اہل مکہ اور پیغمبر کے درمیان ہونے والی بحث ونزاع کے مختلف موقعوں سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے پیغمبر کے مبعوث ہونے سے فوراً پہلے اہل مکہ کا اس مسئلے میں کیا موقف تھا، یہ پوری طرح جانچنا مشکل ہوگا۔ اس لیے کہ جیسے قرآن خود کہتا ہے وہ لوگ کچھ باتیں محض بحث مباحثے کے لیے کرتے تھے (بلکہ بعد ازاں مدینے میں جب یہودی اور مسلم امتیں اپنی اپنی جگہ پر ٹک گئیں تو مدینہ کے یہودی بھی، بت پرستوں کی شہ پر کہنے لگے کہ بت پرست عربوں کا مذہب اسلام سے بہتر ہے) (النساء ۴: ۵۱) تاہم اتنی بات واضح ہے کہ مکہ کے بعض عرب لوگ ایک نئے مذہب اور ایک نئی آسمانی کتاب کی تلاش میں تھے جو ان کو پرانی قوموں کے مقابلے میں ایک طرح کا امتیاز عطا کرے، اور وہ عموماً قدیم آسمانی صحیفوں کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے "اگر ہم اس کو کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور وہ ان کو پڑھ کر سناتا، تب بھی یہ مان کر نہ دیتے" (الشعرا ۲۶: ۱۹۸) پھر یہ کہ "اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں کیوں نہ کھول کر بیان کی گئیں۔ کیا بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی؟ ان سے کہو قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے" (حم السجدہ ۴۱: ۴۳-۴۴) "عربی قرآن" کے اس جملے میں، میرا خیال ہے ہمیں زبان اور قومیت کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھنا چاہیے لیکن وہ کیا ہو، یہ بتانا آسان نہیں ہے۔ غالباً خود عربوں کو بھی اس کا مبہم ہی اندازہ تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اگرچہ منفی پہلو پر وہ بہت زیادہ precise تھے۔ مکی راہنماؤں کی پیغمبر کے ساتھ بحث ونزاع میں ان کے یہ پیہم تقاضے

کہ وہ قرآن کی تعلیمات کو بدل دیں (یونس ۱۰:۱۵، بنی اسرائیل ۱۷:۷۳ مابعد) ان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ پیغمبر سے یہ چاہتے تھے کہ وہ کے خداؤں کو اپنے نظام میں خدا اور انسان کے درمیان کوئی مقام دیں۔ اس سے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے مذہب کو کیوں رد کر دیا تھا اور وہ کیوں عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے خداؤں سے برتر سمجھنے پر تیار نہ تھے۔

اب ہم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوزیشن پر غور کرتے ہیں۔ جب سے قرآن میں قدیم پیغمبروں کا ذکر آنے لگتا ہے، آپ کو یقین ہوتا ہے کہ آپ کا پیغام وہی ہے جو ان لوگوں کا تھا۔ ''یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں'' (الاعلیٰ ۸۷ کی آیت ۱۸-۱۹) ان صحیفوں کا سورہ النجم ۵۳ کی آیات ۳۳-۳۷ میں پھر ذکر آتا ہے ''پھر کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منہ موڑ گیا، اس نے (اپنی دولت میں سے) بہت کم دیا اور پھر رک گیا، کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے یا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں جو موسیٰ کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں جس نے اپنا عہد پورا کر دیا تھا۔'' ان آیات سے یہ اشارہ تو نہیں ملتا کہ پیغمبر کو ان صحیفوں کا علم تھا، نہ اس بات کا کہ انہوں نے انہیں دیکھا تھا۔ یہ ان چند قلیل آیات میں سے دو ہیں جن میں وحی شدہ کتابوں کے لیے ''صحیفوں'' کا لفظ آیا ہے (جو غالباً یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقامی عرب قوم میں پیغمبروں کے حالات کا علم اس وقت موجود تھا ورنہ یہ لفظ تمام وحی کے ''الوحی نقش اول'' کے لیے استعمال ہوتا ہے یا لوگوں کے ان اعمال ناموں کے لیے جو قیامت کے روز ان کے حوالے کیے جائیں گے) بعد میں ''کتاب'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور پورے مکی دور میں تقریباً ہمیشہ ''موسیٰ کی کتاب'' کے لیے بولا جاتا ہے جو قرآن کے پیش رو کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر قدیم انبیاء کے جو پہلے حوالے آتے ہیں ان میں قرآن انجیلی شخصیات کے علاوہ خالص عرب اشخاص۔ عاد اور ثمود کے پیغمبروں____ کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ (مریم ۱۹:۳۰) اور عہد نامہ جدید کی دوسری شخصیات کا کوئی حوالہ پہلے مکی دور میں نہیں آتا، لیکن دوسرے دور سے آگے ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے۔ جبکہ انجیل کا ذکر مکہ میں صرف ایک دفعہ آتا ہے (ایسا کیوں ہے کہ مکی دور میں انجیل کہیں سامنے نہیں آتی جبکہ ''موسیٰ کی کتاب'' کا بار بار ذکر ہوتا ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی اب تک کوئی اطمینان بخش توجیہہ پیش نہیں کی جا سکی۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ عرب میں عیسائیت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی) یہ حقائق ہمارے اس بیان کی تائید کرتے ہیں کہ اپنی بعثت کے پہلے چار برسوں میں آنحضرت کی واقفیت پہلی آسمانی کتابوں سے یا تو بہت کم تھی یا بالکل نہیں تھی۔

پیغمبر کی تعلیمات ـــــ کہ خدا ایک ہے، کہ معاشرے کے غریب لوگوں کو حالات کی دلدل میں نہیں چھوڑنا چاہیے، کہ فیصلے کا ایک آخری دن ہوگا- جب ان تعلیمات کی مخالفت بڑھنے لگتی ہے تو پہلے انبیاء کے متعلق کئی مفصل کہانیاں قرآن میں بار بار سنائی جانے لگتی ہیں- اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ پیغمبر نے بعض غیر معروف لوگوں کے ساتھ اپنی گفتگوؤں میں یہ کہانیاں سنی تھیں اور اس بات کی طرف اشارہ کرنے میں اہل مکہ نے بھی کوئی دیر نہ کی (الفرقان ۲۵:۴-۵، النحل ۱۶:۱۰۳) تاہم آنحضرت کو اصرار تھا کہ یہ کہانیاں ان پر وحی کی گئی ہیں-

وہ بے شک ٹھیک تھے- اس لیے کہ ان کے براہ راست مذہبی تجربے کے زیر اثر یہ کہانیاں وحی کی صورت اختیار کر گئیں اور محض کہانیاں نہ رہیں- اس تجربے کے واسطے سے انہوں نے پہلے پیغمبروں کے ساتھ ایک راست تعلق قائم کر لیا اور ان کا بلاواسطہ گواہ بن گئے- ''(اے محمد) تم اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمان شریعت عطا کیا اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے- بلکہ اس کے بعد ہم نے کئی نسلیں پیدا کیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا- تم اہل مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے-----'' (القصص ۲۸:۴۵) ان کہانیاں کے نہ صرف نکات اور ان سے ملنے والے سبق وحی کے ذریعے بدل دیئے گئے بلکہ ان کے مضامین بھی تبدیل کر دیئے گئے- حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم کو تجارت کی مکارانہ صورتوں کے خلاف تنبیہ کر رہے ہیں، جو مکہ میں آنحضرت کا مسئلہ بھی تھا- حضرت نوح علیہ السلام کو اس طرح سامنے لایا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم کے بااثر لوگوں کے یہ مطالبات ماننے سے انکار کر رہے ہیں کہ اپنے آپ کو ان پیروکاروں سے الگ کر لیں جو معاشرتی اور اقتصادی طور پر کمزور ہیں، تو بااثر لوگ ان کے مذہب میں آ شامل ہوں گے- ایک ایسی صورت حال جو مکہ میں حضرت محمدؐ کو بھی درپیش تھی اور علیٰ ہذا القیاس!

اگلے پیغمبروں کے ساتھ اس روحانی اتحاد کی وجہ سے جو انہیں اپنے الہامی تجربے کی بدولت حاصل ہوا، آنحضرت کو پوری طرح یہ یقین تھا کہ تمام پیغمبروں کے پیغامات بالکل ایک جیسے تھے- تمام آسمانی کتابیں ایک ہی ماخذ سے نکلی ہیں اور اسی کا حصہ ہیں یعنی الوہی نقش اول جسے ''ام الکتاب'' اور ''مخفی کتاب'' کا نام دیا گیا- جب یہ صورت حال ہو تو ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام الہامی کتابوں پر ایمان لایا جائے اور آنحضرتؐ سے قرآن میں یہ اعلان کرایا جاتا ہے ''کہ دے کہ جو کتاب بھی خدا نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں'' (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

درحقیقت ''کتاب'' کا لفظ قرآن میں کئی بار آیا ہے، کسی خاص الہامی کتاب کی نشان دہی کرنے کے لیے نہیں بلکہ ساری الہامی کتابوں کے مجموعے کے لیے ایک کلی اصطلاح کے طور پر- چنانچہ آنحضرتؐ کے لیے یہ توقع کرنا ایک قدرتی بات تھی کہ تمام امتیں قرآن پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح وہ خود اور ان کے متبعین تمام کتابوں پر ایمان رکھتے تھے- یہ صحیح ہے کہ قرآن بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ قرآن ایک ''واضح عربی زبان'' میں اترا ہے (النحل ۱۶:۱۰۳، الشعراء ۲۶:۱۹۵، الزمر ۳۹:۲۸، حم السجدہ ۴۱:۳) لیکن اس ساری تاکید کے مخاطب مکہ کے عرب ہیں- ورنہ کسی الہامی کتاب کی سچائی کا دارومدار اس پر نہیں ہوتا کہ وہ کسی خاص زبان میں اتری ہے-

اب ہم اس معاملے کے ایک مختلف پہلو پر بات کرتے ہیں- قرآن سے یہ بڑی حد تک واضح ہے کہ یہودیت کے اور (خواہ راسخ العقیدہ ہوں یا نہیں) عیسائیت کے پیروکاروں میں کچھ لوگ ایسے تھے جو پیغمبر کے پیغام کی سچائی کو مانتے تھے بلکہ مکہ کے مخالفین کے مقابلے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے- تاریخ ایسے لوگوں کے بارے میں ہمیں تقریباً کچھ نہیں بتاتی-[۴] نہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ آیا یہ وہی لوگ تھے جن کے ساتھ پیغمبر کے مباحثے ہوتے تھے- البتہ ان کے متعلق قرآن میں جو حوالے آتے ہیں ان سے ان حلقوں میں کسی نجات دہندہ کے انتظار کی صاف شہادت ملتی ہے- سورہ الشعراء ۲۶ کی آیت ۱۹۲ و مابعد میں آتا ہے ''یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے- اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ڈرانے والوں میں شامل ہو جائے، صاف صاف عربی زبان میں- اور یہ اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے- کیا ان (اہل مکہ) کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اسے علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں-'' مکہ کے دوسرے اور تیسرے دور میں قرآن ان کو بار بار بطور گواہ کے پیش کرتا ہے کہ محمدؐ کا پیغام سچا ہے اس لیے کہ وہ ''ایسے لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب دی ہے''، ''ایسے لوگ جن کو پہلے ہی کتاب یا علم دیا جا چکا ہے''، ''اصحاب علم'' ہیں ''اہل ذکر'' ہیں- بلکہ مخالفوں کی طرف سے سخت دباؤ اور امتحان کے دنوں میں، جب کبھی کبھی یہ لگتا تھا کہ خود آنحضرتؐ نے حوصلہ چھوڑ دیا ہے اور سوچ رہے ہیں کہ اس

(۴) مسلم روایات میں عام طور پر ایک عیسائی وفد کا حوالہ ملتا ہے جو حبشہ سے آیا اور مسلمان ہو گیا، لیکن ان رپورٹوں کی بنیاد غیر یقینی ہے- یہ آیات زیادہ تر مکی ہیں لیکن بعض مدینے کے اوائل زمانے سے تعلق رکھتی ہیں- مدینے میں حدیث بعض یہودی اسلام لانے والوں کا ذکر کرتی ہے، جن میں سب سے نمایاں عبداللہ بن سلام ہیں لیکن انھیں مسلم مفسرین ایسے سیاق و سباق میں لاتے ہیں جو واضح طور پر مکی ہیں- اس سارے معاملے پر ایک ابہام چھایا ہوا ہے، اس لیے کہ قرآن کوئی نام نہیں لیتا- دیکھیے سیرت ابن اسحاق، مدیر: محمد محی الدین عبدالحمید (قاہرہ ۱۳۵۶/۱۹۳۷، جلد اول، ص ۴۲۰، سطر ۱۵ و مابعد)

تحریک کو جاری رکھا جائے یا نہیں، تو قرآن ان سے ان لوگوں کی تائید اور تسکین حاصل کرنے کے لیے کہتا ہے "جو (پہلے اتری ہوئی) کتاب پڑھتے ہیں" (یونس ۱۰:۹۴) بجائے اس کے کہ وہ مشرکین کے طرفدار ہو جائیں جبکہ ان کے پاس صاف صاف نشانیاں اور الوہی تعلیمات آ چکی ہیں جن کی انہوں نے اپنی اس دعوت سے پہلے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ (القصص ۲۸:۸۵-۸۸)

اگر خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ایک ہے اور بنیادی طور پر نا قابل تقسیم ہے تو یقیناً پوری انسانیت بھی ایک امت ہونی چاہیے۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اگلے مذاہب کے پیروکاروں نے ان کے مشن کی تائید کی تھی، آنحضرتؐ یہ امید کرنے لگے تھے کہ ان مذاہب کی کثرت کو وہ اپنی تعلیمات کے مطابق اور اپنی شرائط پر ایک امت کی صورت میں متحد کر دیں گے۔ لیکن جوں جوں انہیں اگلے مذاہب اور فرقوں کے اپنے درمیان اختلافات کا علم بتدریج زیادہ ہوتا گیا، انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس صورت حال نے ان کے لیے ایک بہت بڑا الہیاتی مسئلہ پیدا کر دیا، جس سے قرآن مدنی دور میں کافی عرصہ گزر جانے تک نمٹتا رہا، یہاں تک کہ مسلم امت کو باقاعدہ طور پر ایک "امت وسط" اور ایک "مثالی امت" کے طور پر کھڑا کیا گیا۔ ہم یہاں مذاہب کے تنوع کے فینا مینا کے خالصتہ الہیاتی پہلو پر کچھ نہیں کہنا چاہتے بلکہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس تنوع کا پیغمبر کے فہم وادراک کی روشنی میں مسلم امت کے نشو ونما پر کیا اثر پڑا۔

ایک واحد مذہبی امت کے بارے میں پیغمبر کے خیال کو جو دھچکا لگا، وہ اتنا مدینے میں نہیں لگا جیسا کہ Hurgronje کہتا ہے جتنا بہت پیچھے مکہ میں۔ پھر ہمیں اس کا بہت تھوڑا علم ہے کہ مخالفت میں وہ خاص ایجنٹ کون تھے، کیونکہ قرآن حسب دستور کسی شخص کا نام نہیں لیتا۔ سیرت ابن اسحاق کے مطابق مکہ کے راہنماؤں نے ایک دفعہ دو آدمیوں کی ایک ٹیم مدینہ میں اس غرض سے بھیجی کہ ان کا پیغمبر کے ساتھ جو بحث ومناقشہ چل رہا تھا اس میں وہ وہاں کے یہودیوں کی مدد حاصل کریں اور یہ ٹیم تین سوالات لے کر آئی کہ جو پیغمبر سے کیے جائیں۔[۵] تاہم قرآن کے بیانات اس سے کہیں زیادہ فرض کرتے ہیں اور اس امر کی طرف زوردار اشارہ کرتے ہیں کہ پیغمبر اور اگلے مذاہب کے نمائندوں کے درمیان براہ راست مباحثوں کی طرح کی کوئی چیز ہو رہی تھی۔ ان مباحثوں کے ضمن میں جو ظاہر ہے صرف مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہوئے تھے بلکہ پہلے مذاہب کے اپنے درمیان بھی اختلافات سامنے لاتے تھے، ان مذاہب کے پیروکاروں کو "الاحزاب"

(۵) ایضاً صفحہ ۲۶۰

(حزب کی جمع، یعنی کٹر حامی اور فرقہ پرست) کہا جاتا ہے یعنی وہ جو کسی مذہب کی امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن نے اس سے پہلے تین موقعوں پر استعمال کیا تھا(٦): پہلی قوموں کا یا ان لوگوں کا حوالہ دیتے ہوئے جنہوں نے اپنے پیغمبروں کو رد کر دیا تھا، اور اس کے نتیجے میں خدا نے ان کو تباہ کر دیا تھا۔ ان میں سے بعض آیات میں (صٓ ۳۸:۱۱-۱۳) اہل مکہ کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ سیڑھیاں لگا کر آسمانوں پر چڑھ جائیں (اور خدائی کا تجربہ کریں) "یہ تو ایک چھوٹا سا جتھہ ہے جو یہاں شکست کھانے والا ہے، ان جتھوں (احزاب) میں سے" جو پہلے نوح، عاد، فرعون، ثمود اور لوط کی امتیں تھیں اور مدائن کے گھنے جنگل والے لوگ!! اس لفظ "احزاب" کے اس استعمال کے پیچھے جو خیال ہے وہ ان "مخالف گروہوں" کا ہے جو الوہی پیغام کی مخالفت کرتے ہیں لیکن پھر خود ہی تباہ ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ہر پیغمبر کا پیغام ان لوگوں کے لیے جن سے یہ خطاب کرتا ہے ایک فاصل آب (watershed) کا کام کرتا ہے۔ اس کے اثر سے لوگ سچائی اور جھوٹ کی دو قسموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ لیکن لفظ احزاب کے بعد کے استعمال میں اس کا مطلب ہے ایک ایسی صداقت کو جو اصل میں واحدانی تھی، توڑ کر فرقوں میں تقسیم کر دینا۔ سورہ مریم ۱۹ کی آیت ۳۷ میں یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں گروہی اختلافات اور ان کے پیغام کے بارے میں ہے۔ ایسے اختلافات جنہوں نے ان کی تعلیمات کی صورت بگاڑ کر رکھ دی، اور قرآن میں یہ خیال یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اور ویسے عام طور پر بھی، زور پکڑتا چلا جاتا ہے کہ "لوگ جب ان کے پاس علم آ چکتا ہے تو وہ باہم اختلاف کرنے لگتے ہیں۔" (یونس ۱۰:۱۹، ۹۳، الجاثیہ ۴۵:۱۷، البقرہ ۲:۲۱۳، آل عمران ۳:۱۰۵، اللیل ۹۲:۴) درحقیقت اصل پیغام ایک طویل عرصہ گزرنے پر گم ہو جاتا ہے اور یہ جملہ کہ "ان پر ایک طویل مدت گزر گئی" قرآن میں بار بار آتا ہے (الانبیاء ۲۱:۴۴، القصص ۲۸:۴۵، الحدید ۵۷:۱۶) یہ قرآن میں ایک غیر معمولی طور پر دکھ دینے والا خیال بن جاتا ہے اور مسلمانوں کو، مدینے میں بھی اور مکے میں بھی، بار بار یہ تنبیہ کی جاتی ہے کہ اس طرح کے اختلاف میں نہ پڑیں، جہاں ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں خوش ہے (الروم ۳۰:۳۲، المومنون ۲۳:۵۳، اسی طرح آل عمران ۳:۱۰۳، ۱۰۵، الانعام ۶:۱۵۴) اس سلسلے میں "احزاب" اور "شیع" (شیعہ کی جمع، بمعنی گروہ یا فرقہ) ایک ہی مطلب کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

(٦) ان اول الذکر آیات کے لیے میں روڈی پارٹ کے Der koran (شٹٹ گارٹ ۱۹۷۱) صفحہ ۲۲۳، سطر ۲۳ و مابعد کا ممنون ہوں۔

جب (مکہ کے تیسرے دور میں) ''احزاب'' ان پہلی امتوں کو کہا جاتا ہے جو آنحضرتؐ کی ہم عصر تھیں، تو اس کے غالباً دونوں ہی معنی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، یعنی وہ گروہ جو پہلے پیغامات پر اختلافات واقع ہونے کے نتیجے میں وجود میں آئے اور دوسرے وہ جو آنحضرتؐ کے پیغام کے مقابلے میں مختلف گروہوں کے باہمی اختلافات کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ تین آیتوں میں یہ دونوں گروہ ان لوگوں سے واضح طور پر ممیّز کیے جاتے ہیں ''جن کو ہم نے کتاب دی تھی'' جو قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ پہلی آیت جہاں ''احزاب'' کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، اس میں ارشاد ہوتا ہے ''ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے اس لیے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور عرب کے ان لوگوں میں سے بھی کچھ اس پر ایمان لا رہے ہیں'' (العنکبوت ۲۹:۴۷) دوسری آیت میں زیادہ کھلا بیان ہے ''جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے خوش ہیں۔ لیکن مختلف گروہوں (احزاب) میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے'' (الرعد ۱۳:۳۶)[۷] اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ ان گروہوں کو پورے قرآن پر اعتراض نہ تھا بلکہ صرف اس کے ایک حصے پر تھا۔ تیسری آیت میں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے: ''پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا، اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے آ گیا اور پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب راہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی تھی۔ ایسے لوگ (جن کے پاس موسیٰ کی کتاب تھی) تو اس پر ایمان لائیں گے۔ لیکن اختلاف میں پڑے ہوئے گروہوں (الاحزاب) میں سے جو اس کا انکار کرے گا۔ ان کے لیے جہنم ہی کا وعدہ ہے'' (ھود ۱۱:۱۷)

احزاب کا لفظ ایک دفعہ پھر استعمال ہوتا ہے لیکن بہت بعد میں، مدنی دور کے درمیان میں (الاحزاب ۳۳:۲۰-۲۲) جب یہ مختلف گروہوں اور قبیلوں (قریش، اہل بادیہ اور یہودیوں) کے لیے بولا جاتا ہے جنھوں نے غزوہ خندق میں مدینے پر چڑھائی کرنے کے لیے ایک اتحاد قائم کر لیا تھا۔ لیکن اگرچہ قرآن یہ لفظ پہلے گروہوں کے لیے استعمال نہیں کرتا جنھوں نے پیغمبرؐ کا انکار کر دیا تھا۔ تاہم یہ ان کو برابر مخاطب کیے جاتا ہے، مکی اور مدنی دونوں زمانوں میں، کبھی اس حیثیت میں کہ وہ پیغمبرؐ کی تائید کرتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں اور کبھی اس حیثیت میں کہ وہ ان کو

(۷) یہ آیات اگر سب نہیں تو ان میں سے اکثر مکی ہیں۔ نولدیکے کا خیال ہے کہ جس قدر ذکر ''ان لوگوں کا جن کو ہم نے کتاب دی تھی'' ہوا ہے اور جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ قرآن میں ایمان رکھتے ہیں، یہ سب مکی آیات ہیں۔

جھٹلاتے ہیں اوران کی مخالفت کرتے ہیں- سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۷ میں، اہل مکہ کے حوالے سے قرآن یہ اعلان کرتا ہے" (اے محمد) ان سے کہہ دو تم اس پر (یعنی قرآن پر) ایمان لاؤ یا نہ لاؤ- جن لوگوں کو اس سے پہلے علم، یعنی کتاب دی گئی ہے جب یہ (قرآن) ان کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں، اور پکار اٹھتے ہیں: "پاک ہے ہمارا رب، اسکا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا" پھر سورہ الانعام ۶ آیت ۱۱۴ میں کہا جاتا ہے "اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے، لہذا تم شک کرنے والوں میں نہ شامل ہو" دوسری طرف سورہ الانعام آیت ۲۰ میں ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے: "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح بغیر اشتباہ کے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں- مگر جنہوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے-" ان دونوں بیانات کو مدینے میں دہرایا جاتا ہے (مثلاً البقرہ ۲:۱۲۱، اور آیات ۱۴۴-۱۴۶، خصوصیت کے ساتھ یہ موخر الذکر) جہاں یہودیوں کے خلاف ایک طویل مذہبی اور سیاسی نزاع چھیڑی جاتی ہے جن میں سے بہت سے لوگوں پر قرآن پر ایمان نہ لانے، اور خود اپنی آسمانی کتاب کا اتباع نہ کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے-

جس طرح آنحضرتؐ اگلے پیغمبروں کے بعد آتے ہیں اور ان کے کام ورثے میں لیتے ہیں اور قرآن پہلی وحی شدہ کتابوں کی میراث حاصل کرتا ہے اسی طرح مسلم امت بھی اگلی امتوں کا مقام ترکے میں پاتی ہے، حالات کا یہ ارتقاء بھی مکے میں واقع ہوتا ہے- سورہ الانعام ۶ کی آیات ۸۹-۹۳ میں نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام سے لے کر عہد نامہ جدید کی شخصیات تک اٹھارہ قدیم پیغمبر گنوانے کے بعد قرآن کہتا ہے:

> "یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے- اور اگر انہوں نے (یعنی اگلے پیغمبروں نے) شرک کیا ہوتا تو ان سب کا کیا کرایا غارت ہو جاتا- یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب دی، فیصلہ کرنے کی صلاحیت دی، اور نبوت عطا کی- اب اگر یہ لوگ اسکو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو کوئی بات نہیں، ہم نے دوسرے لوگوں کو یہ فریضہ سونپ دیا ہے (یعنی مسلمانوں کو عموماً اور خاص طور پر ان لوگوں کو جن کے پاس پہلے وحی آچکی تھی) جو اس سے منکر نہیں

ہیں- وہ (یعنی اگلے پیغمبر) ایسے لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی ہے، اس لیے ان کی ہدایت پر چلو---- انہوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا- ان سے پوچھو پھر وہ کتاب جسے موسیٰ علیہ السلام لایا تھا جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق پر نقل کر رکھا ہے، جسے تم کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو، جس کے ذریعہ تمہیں وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا، نہ تمہارے باپ دادا کو---- اور یہ ایک کتاب (قرآن) جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے اور جو کچھ اس سے پہلے آیا تھا اس کی تصدیق کرتی ہے تاکہ تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو تنبیہ کرو-"(۸)

ایسے مرحلے پر جہاں محمدؐ واضح طور پر سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی پوزیشن اگلے پیغمبروں کی براہ راست جانشینی کی ہے اور یہ کہ مشرکین عرب اپنی بت پرستی میں غلط راہ پر ہیں اور دوسرے گروہ بھی اپنے فرقہ پرستانہ کردار میں غلط ہیں، تو قرآن محمدؐ کو "حنیف" قرار دیتا ہے، یعنی ایک سچا توحید پرست، اور اس کے مذہب کو "الدین القیم" (راست اور درست دین) کہتا ہے، جس سے بت پرستی اور فرقہ بندی انحراف کی صورتیں ہیں- "تو اے پیغمبر اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ اس دین

(۸) یہ آیات، جیسا کہ ان کے سیاق و سباق سے پتا چلتا ہے، مکی ہیں اور ان کا رخ مشرکین کی طرف ہے، لیکن بعض نکات نے مسلم اور مغربی دونوں طرح کے مفسرین کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں- ایسے جملوں سے کون لوگ مراد ہیں کہ "اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں" اور "ہم نے دوسرے لوگوں کو یہ فریضہ سونپ دیا ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں" مسلمانوں کا روایتی نقطہ نظر یہ ہے کہ "لوگ جو اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں" وہ اہل مکہ ہیں، جو بالکل صحیح ہو سکتا ہے اس لیے کہ سیاق و سباق مکی ہے- لیکن وہ لوگ جن کو یہ فریضہ سونپا گیا ہے" وہ مدنی مسلمان بھی نہیں ہو سکتے اور خود اگلے پیغمبر بھی نہیں، جس طرح کہ روایتی نقطہ نظر ہے- رچرڈ بیل کا خیال تھا کہ "انکار کرنے والے لوگ" مدینہ کے یہودی تھے اور جن لوگوں کو یہ فریضہ سونپا گیا" مسلمان تھے- اور یہ آیات مکی نہیں مدنی ہیں- روڈی پارٹ کہتا ہے کہ ان آیات کا پہلا اور آخری حصہ مکہ کے مشرکین پر صادق آتا ہے اور بیچ کا حصہ یہودیوں پر! لیکن ان پوری آیات کو وہ ایک پوری طرح جڑا ہوا مکمل بیان سمجھتا ہے- یہ تعبیر بذات خود معقول دکھائی دیتی ہے لیکن یہ آیات ظاہر ہے مدنی نہیں ہیں بلکہ مکی ہیں- احزاب کے معنی پر ہمارے جو دلائل ہیں ان کی روشنی میں نیز محمدؐ کے مشن کے بارے میں اہل مکہ اور یہود کے درمیان ہونے والی بات چیت کو سامنے رکھتے ہوئے ان آیات کو سمجھنے کا سب سے قدرتی طریقہ یہ ہے کہ ان کا خطاب مکہ کے مشرکین کی طرف ہے جن کو یہود کی تائید حاصل تھی- اس لیے یہ آیات یہود پر بھی وار کرتی ہیں- اس بنیاد پر سورہ الانعام ۶ کی آیت ۹۲ جس نے مفسرین اور سکالروں کو کافی مشکل میں ڈالا ہے، وہ بھی قابل فہم ہو جاتی ہے- اس میں تین متصل نکات ہیں: کہ وہ اہل مکہ جو ایک بشر پر وحی کے نازل ہونے سے انکار کرتے ہیں وہ خدا کی قدرت کو نہیں سمجھ سکے- کہ بہت سے اہل مکہ نے موسیٰ پر اترنے والی کتاب سے بہت کچھ سیکھا ہے جو اس سے پہلے نہ انہیں معلوم تھا اور نہ ان کے آباء کو، اور یہ کہ وہ یہودی جو موسیٰ پر اترنے والی وحی کو نقل کرتے ہیں تو اس کا بڑا حصہ چھپا دیتے ہیں (عام عبارت یہ ہے کہ "جسے تم لکھ لیتے ہو---- اسے ظاہر تو کرتے ہو لیکن بہت کچھ چھپا دیتے ہو" صیغہ حاضر جمع میں، لیکن اس سے ایک مختلف قرات بھی ہے جو صیغہ غائب جمع میں ہے جسے طبری نے اختیار کیا ہے جو نص کو صاف اور ہموار کرنے کی ایک کوشش ہو سکتی ہے)

راست کی سمت کرلو" (الروم ۳۰: ۴۳) "پس (اے نبی) اپنا رخ حنیف ہو کر اس دین کی سمت میں جما دو- قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے------ یہی بالکل راست اور درست دین ہے------ اور (اے مسلمانو) ان مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ جو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کو فرقوں میں بانٹ دیا ہے اور خود گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں خوش ہے" (الروم ۳۰: ۳۰-۳۲)

یہ امر کہ خالص توحید کا یہ مذہب جو سب سے زیادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے، یہ خاص طور پر مشرکین کے بتوں کے مذہبی طریقے کے خلاف میدان میں لایا گیا تھا، یہ سورہ یوسف ۱۲ کی آیات ۳۷-۴۰ سے عیاں ہے جس میں حضرت یوسف اپنے دو قیدی ساتھیوں کے سامنے اعلان کرتے ہیں "میں نے ان لوگوں کا مذہب چھوڑ دیا ہے جو (ایک) خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور جو روز آخرت کا انکار کرتے ہیں- اب میں اپنے باپ دادا ابراہیم علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے مذہب پر چلتا ہوں- ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک بنائیں----- اے میرے جیل خانے کے ساتھیو! کیا بہت سے خدا بہتر

بیل (The Quran Translated Edinburgh,1,124) کے خیال میں یہ آیات مدنی ہیں- اس کے باوجود کہ اس کے پہلے اور آخری حصے مکی ہیں اور ان کا خطاب صرف مکہ کے مشرکین کے لیے ہو سکتا ہے- اور جن الفاظ میں یہودیوں پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ آسمانی کتاب کو اس طرح نقل کرتے ہیں کہ اس کا ایک حصہ چھپا دیتے ہیں تو ان کے بارے میں بیل کا خیال ہے کہ یہ پیغمبر نے بعد میں بڑھائے ہیں- جہاں یہ سچ ہے کہ مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ اپنی نزاع میں قرآن بار بار ان کو یہ الزام دیتا ہے کہ وہ اپنی کتاب کو صحیح طرح سے پیش نہیں کر رہے، لیکن یہ جو الزام ہے یہ کسی طرح بھی مدینے میں محدود نہیں ہے- اس سے پہلے ہم نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ مکہ کے بعض لوگوں نے "اہل کتاب" سے اگلے پیغمبروں کی کہانیاں سن رکھی تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی اپنی بھی کوئی نازل شدہ کتاب ہوتی اور انہوں نے موسیٰ کی تعلیمات کو قبول نہیں کیا تھا- یہی وہ بات ہے جس کی طرف سورہ الانعام ۶ کی آیت ۹۲ کا بعد کا حصہ یہ کہہ کر اشارہ کر رہا ہے کہ "تم کو (اہل کتاب سے) وہ باتیں سکھائی گئیں جو نہ تم جانتے تھے نہ تمہارے آباؤ اجداد" پھر جب پیغمبر خود اہل کتاب کے درمیان اختلافات سے آگاہ ہوئے، انہیں یقین ہو گیا کہ آسمانی کتابیں تو سچ تھیں لیکن یہ عقیدت مند اور پرستار ان میں رد و بدل کر کے انہیں غلط رنگ میں پیش کر رہے تھے- سورہ العنکبوت ۲۹ آیت ۴۸ میں قرآن کہتا ہے "(اے محمد) اس (قرآن) سے پہلے تم کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے، اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے- ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے" اس آیت میں تین باتیں ہیں: سب سے نمایاں تو یہ کہ اس میں اہل مکہ کے ان الزامات کا جواب ہے کہ محمد کو اگلے پیغمبروں کی کہانیاں بتائی جا رہی تھیں- اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ یہ کہانیاں سنا رہے ہوتے یا اپنی دعوت شروع کرنے سے پہلے ان کو لکھ رہے ہوتے تو اس شک کے لیے کوئی بنیاد تو ہونی چاہیے تھی- دوسری بات، جو قرآن میں دہرائی گئی ہے (القصص ۲۸: ۸۷، الشوریٰ ۴۲: ۵۲) یہ ہے کہ محمد نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا، یا کوئی شعوری کوشش نہیں کی تھی کہ وہ پیغمبر بن جائیں بلکہ انہیں اس طرف اچانک بلایا گیا تھا اور تیسری بات یہ کہ ان الفاظ میں کہ "نہ تم اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے نقل کر رہے تھے" ان لکھنے والوں پر ایک کھلی طنز ہے جو قدیم الوحی کتابوں کو نقل کرتے تھے اور انہیں ٹھیک ٹھیک اور اصل کے مطابق پیش نہیں کرتے تھے- تاہم یہ خیال پوری طرح سے کی ہے- اسی طرح اس کے بعد جو آیات آتی ہیں وہ بھی صاف صاف مکی ہیں- اپنی اس رائے کو قائم اور استوار رکھنے کے لیے کہ یہ پوری آیات مدنی ہیں- بیل اس لفظ "ام القریٰ" (بستیوں کے مرکز) کو جسے تعبیر کرنے کے لیے آنحضرت کو تاکید کی گئی ہے" مدینہ قرار دیتا ہے یہ ایسی رائے ہے جس کے خلاف تمام مسلم علماء کی روایت ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ام القریٰ کا مطلب مکہ ہے- تاہم مدینے کو مکے کا بدل قرار دینے کا یہ خاص عمل رچرڈ بیل کے کم سنجیدہ انحرافات (eccentricities) میں سے ایک ہے-

ہیں یا ایک غالب خدا؟----- اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو---- یہی سیدھا اور صحیح دین ہے"

پکے توحید پرست کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال مکہ کے آخری زمانے میں مشرکین مکہ کے سامنے بڑے وثوق سے پیش کی جاتی ہے جہاں (سورہ الانعام ۶ اور سورہ یوسف ۱۲ میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر دوسرے پیغمبروں کی کہانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور جہاں سورہ الانعام ۶ کی آیت ۷۴ میں اور اس کے بعد یہ تفصیل بتانے کے بعد کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلکیاتی خداؤں کو ایک ایک کر کے رد کرنے کے بعد کیونکر توحید کے تصور تک پہنچے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں:

"اے میری قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو- میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے- اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں- اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے کہا کیا تم اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا---- اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں، جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے- تو ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور امن کا مستحق ہے، اگر تم کچھ جانتے ہو-" (الانعام ۶:۷۸-۸۱)

اس کے بعد کی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمیت سترہ پیغمبروں کا ذکر ہے- ان الفاظ کے ساتھ کہ اگر یہ لوگ شرک کے مرتکب ہوتے تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا-

چنانچہ یہ پوری طرح کی سیاق وسباق میں ہی ہے، جس میں مخاطب مشرکین ہیں کہ قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو بطور ایک برگزیدہ پیغمبر اور ایک پکے توحید پرست کے سامنے لاتا ہے، نہ کہ مدینے میں یہودیوں کے ساتھ تنازعے کے نتیجے میں، جیسا کہ ہرگرونجے اور

شوالی کہتے ہیں۔لیکن توحید کی جانشینی کا سلسلہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چل کر پہلے پیغمبروں سے ہوتا ہوا آنحضرتؐ تک آیا تھا، اسے بغیر کسی انحراف کے سیدھا ہی رکھنا چاہیے۔پہلی توحید پرست امتیں، یعنی اہل کتاب، ظاہر ہے اس لائن کو سیدھا نہیں رکھ سکیں ورنہ گروہی اختلاف اور علیحدگیاں واقع نہ ہوتیں۔

اس حقیقت کی روشنی میں ''حنیف'' کی زیر بحث رہنے والی اصطلاح کے معنی کو پھر سے سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے۔قرآن میں غالباً اس کے معنی صرف توحید پرست کے نہیں ہیں، بلکہ ایک سیدھے اور انحراف نہ کرنے والے توحید پرست کے ہیں۔ان معنوں میں نہ مشرکین اور نہ ''اہل کتاب'' ہی حنیف تھے۔چنانچہ یہ اسی راست ابراہیمی طرز کی توحید پرستی (جو انبیاء سے ہوتی ہوئی آنحضرتؐ تک پہنچی) کی بنیاد پر ہے کہ قرآن نہ صرف مشرکین پر تنقید کرتا ہے بلکہ پہلی امتوں پر بھی۔سورہ الانعام ۶ کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

> ''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، یقیناً ان سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہی ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے۔۔۔۔(اے محمدؐ) کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔بالکل سیدھا اور کھرا دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیم کا دین جو حنیف تھا اور مشرکین میں سے نہیں تھا۔کہو میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔اس کا کوئی شریک نہیں۔اسی کا مجھے حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا ہوں'' (الانعام ۶:۱۶۰-۱۶۴)

اہم سلسلے وار تبدیلیاں ضرور مدینے میں واقع ہوتی رہتی ہیں لیکن ان میں یہ نہیں ہوتا کہ قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں اور عیسائیوں کے حوالے کر دیا ہو اور مسلم امت کا تعلق براہ راست اور خالصتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جوڑ دیا ہو۔اگر ایسا ہوتا تو یہ پیغمبروں کی جانشینی کی سیدھی لائن کے سارے تصور، یعنی ''حنیفیت'' اور دین کی بنیادی وحدت کو ہی ختم کر دیتا۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام مکے کی طرح مدینے میں بھی نمایاں طور پر سامنے رہتے ہیں۔اسی طرح پہلے زمانوں کی وحی کا ذکر بھی ہوتا

رہتا ہے اور قرآن اپنے آپ کو اس کا تصدیق کرنے والا اور اس کو محفوظ کرنے والا قرار دیتا ہے- سورہ المائدہ ۵ میں حضرت موسیٰ پر نازل ہونے والی وحی اور انجیل کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

> ''اور (اے محمد) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس کی محافظ و نگہبان ہے----- ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے- اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا سکتا تھا- لیکن اس نے (یہ نہ کر کے) ایسا اس لیے کیا کہ اس نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہارا امتحان لے، پس بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو-''
> (المائدہ ۵:۴۸)

چنانچہ مدینے میں ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ پہلی وحی شدہ کتابیں یعنی تورات اور انجیل کا تو نام لے کر ذکر کیا جاتا ہے جبکہ مکے میں انجیل کا بمشکل حوالہ دیا جاتا ہے (اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسری انجیلی شخصیات یقیناً مذکور ہیں) جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترنے والی وحی کو ہمیشہ ''کتاب موسیٰ'' کا نام دیا جاتا ہے جو بار بار قرآنی وحی کے پیش رو کے طور پر ظاہر ہوتی ہے-

ایک دوسری بڑی تبدیلی- جیسا کہ سورہ المائدہ آیت ۴۸ سے بھی ظاہر ہے- تین مختلف گروہوں: یہودیوں، عیسائیوں اور مسلموں کی شناخت ہے- مکی دور کی اصطلاحیں: ''فرقے'' اور ''جماعتیں'' (احزاب اور شیع) جو اگلی امتوں کے لیے استعمال کئے جاتے تھے، مدینے میں غائب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ ''امت'' یا مجموعی اصطلاح ''اہل کتاب'' لے لیتی ہے- اور ہر امت کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اپنے قانون ہوں گے- مسلم امت کی توثیق کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سائے میں پناہ نہیں لی جاتی بلکہ قرآن کسی نہ کسی انداز میں یہودی اور عیسائی امتوں کو تسلیم کرتا ہے- اس کے باوجود مسلم امت ''مثالی'' یا ''بہترین امت'' رہتی ہے، ''بیچ کی امت'' (امت وسط) جو دوسروں کی ''متعصبیت'' کے مقابلے میں ابراہیمی سلسلے کی صحیح جانشین ہے- ''اہل کتاب'' پھر بھی اسلام کی طرف بلائے جاتے ہیں ''اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے، معاملات کی وضاحت کرنے، رسولوں کے درمیان ایک طویل وقفے کے

بعد تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ خوش خبری دینے والا آیا ہے اور نہ ڈرانے والا، اب تمہارے پاس ایک خوش خبری دینے والا بھی آ گیا ہے اور ڈرانے والا بھی! (المائدہ ۵:۱۹)

ہم آخر میں کعبہ یا حرم کی پوزیشن پر مختصراً کچھ کہنا چاہیں گے جس کے ساتھ حج اور نماز کی سمت کا تعلق ہے- مجھے نولد یکے شوالی کا یہ بیان الجھن میں ڈال دیتا ہے[9] کہ مکی دور میں، ابتدائی سورہ القریش ۱۰۶ کے بعد، قرآن میں کعبے کا ذکر کہیں نہیں آتا- ٹھیک ہے کعبے کا لفظ مکی دور میں بالکل استعمال نہیں ہوتا، اور قرآن میں یہ مدنی دور میں خاصا عرصہ بعد جا کر استعمال ہونے لگتا ہے (المائدہ ۵:۹۵-۹۷) لیکن اگر اس بیان سے یہ مطلب نکلتا ہے جیسا کہ بظاہر لگتا ہے کہ حرم کعبہ جب تک مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہو گیا، پیغمبر کی توجہ سے نکل گیا تھا، تو ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط ہے- سورہ القصص ۲۸ کی آیت ۵۷ میں بعض اہل مکہ کے اس خوف پر رائے زنی کرتے ہوئے کہ اگر ہم نے پیغمبر کی تعلیم کو قبول کر لیا تو ہم اپنے ملک سے اچک لیے جائیں گے- قرآن کہتا ہے کہ وہ علاقہ یعنی حرم تو امن کا مقام تسلیم کر لیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں لوگ نہ صرف حملوں سے محفوظ تھے بلکہ آزادانہ تجارت بھی کرتے تھے جو ان کی خوشحالی اور فراوانی کا باعث تھی- یہ بیان اس بات کے بالکل مطابق ہے جو اس سے پہلے سورہ القریش ۱۰۶ میں کہی گئی- حرم کعبہ کے طفیل مکہ کے تقدس کے بارے میں یہ بیان سورہ العنکبوت ۲۹ آیت ۶۷ میں پھر دہرایا جاتا ہے اور قرآن یہ شکایت کرتا ہے کہ باوجود اس کے تقدس کے لوگ اس کے اردگرد سے اچک لیے جا رہے تھے- آخر الامر سورہ الاعراف ۷ آیت ۲۹ اور بعد کی آیات میں جو مکہ میں پیغمبر کے آخری برسوں سے تعلق رکھتی ہیں قرآن بعض مشرکین عرب (جن میں کچھ اہل مکہ بھی شامل تھے) کے ان طریقوں پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے کہ وہ کعبے کا طواف ننگے ہو کر کیا کرتے ہیں اور حج کے دوران میں روزے رکھتے ہیں- نولد یکے شوالی بھی قرآن کے مسلم مفسرین کے بکثرت بیانات کا اتباع کرتے ہوئے اس بات کو مانتا ہے-[10]

یہ شہادت ظاہر کرتی ہے کہ پیغمبرؐ نے نہ صرف یہ کہ کعبہ کے تقدس پر ایمان ترک نہیں کیا تھا بلکہ وہ حج کی رسومات سے مکے کے آخری زمانے تک، متعلق رہے تھے، بلکہ ان رسومات میں بعض اصلاحات کرنا چاہتے تھے- حج میں اصلاح اور دوسری مذہبی اور معاشرتی اصلاحات کے لیے البتہ

(۹) تصنیف مذکورہ صفحہ ۹۱
(۱۰) ایضاً صفحہ ۱۵۹

مکے کے حالات میں سیاسی بالادستی کی ضرورت تھی- اور اہل مکہ جو ان کی مخالفت کر رہے تھے تو اس کی بنیاد بڑی حد تک ان کے پیغام کے سیاسی مضمرات پر تھی-

اس بات کا بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ مدینے میں آنے کے بعد آنحضرت کعبے کو چھوڑ کر کسی اور حرم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے-(۱۱) بلکہ ساری شہادت اس کے برعکس ہی ہے- یہ امر کہ پیغمبر نے مدینہ ہجرت کرنے کا فیصلہ اہل مکہ کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لیے کیا تھا ان کے اس میثاق سے ظاہر ہے جو انہوں نے مدینہ آنے کے لیے اہل مدینہ کے ساتھ کیا تھا جسے "میثاق جہاد" کا نام دیا گیا- مدینے میں آنے کے بعد ان کے تمام سیاسی اعمال--- مکہ کے تجارتی قافلوں کو ڈرانا دھمکانا اور انہیں راستے میں روکنا--- اسی وجہ سے تو تھے کہ ان میں مکہ کو واپس لینے کی زبردست خواہش تھی، اگر پرامن ذرائع سے نہیں تو اقتصادی دباؤ سے ہی، یا ضرورت پڑے تو جنگ کر کے- اور پیغمبر کے مدینہ آنے کے ایک سال کے اندر کعبے کو اسلام میں حج کرنے کے لیے حرم قرار دیا گیا- مکہ اور کعبہ کے لیے پیغمبر کا یہ تعلق خاطر اسی وجہ سے تو تھا کہ حرم اور قریش کے قبیلے کو پورے عرب پر مذہبی، اقتصادی اور سیاسی بالادستی حاصل تھی- تو سوال یہ ہے کہ پیغمبر اور اسلام کو مکہ اور دوسرے عرب لوگوں کو چھوڑ کر مدینے کے مٹھی بھر یہودیوں کو راضی کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا-

کعبے کا حج فرض کرنے اور قبلے کے بیت المقدس سے تحویل کیے جانے کے درمیان تقریباً چھ ماہ کا وقفہ تھا، جو اس صورت حال سے، جسے مغربی سکالر "یہودیوں سے مقاطعہ" کا نام دیتے ہیں ذرا پہلے واقع ہوا تھا- اب اگر یہودیوں سے مقاطعہ اتنا اہم تھا جیسا کہ بہت سے مغربی سکالر سمجھتے ہیں اور اس کے اندر اسلام کی آئیڈیالوجی کے لیے اتنے مضمرات تھے اور وہ اسلام کا رخ ہی تبدیل کیے دے رہا تھا تو ان دو واقعات کے درمیان چھ ماہ کے اس فاصلے کی توجیہ کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اسلام کو جھنجھوڑ دینے والے اس مقاطعے کی منطق کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ دونوں واقعات بیک وقت یا قریب قریب ایک ہی وقت میں پیش آتے- یہ نقطہ نظر جو میں پیش کر رہا ہوں اس کی رو سے حج کی فرضیت کے حکم کا یہودیوں سے یا ان کے ساتھ قطع تعلق سے کوئی واسطہ نہیں تھا- اسلام کے مکی اور

(۱۱) یہ امر کہ کعبہ حضرت ابراہیم کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا بعض عرب اسے اسلام سے پہلے بھی مانتے تھے- نولدیکے شوالی (صفحہ ۱۴۷، نوٹ ۳) میں بغیر کسی شہادت کے کہتا ہے کہ یہ اعتقاد غالباً عرب یہودیوں اور عیسائیوں کا پیدا کردہ تھا اور عیسائیوں کے متعلق تو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ حرم کعبہ کے حج میں شریک ہوتے تھے- بہر صورت، اس امر کے پیش نظر اور اس شہادت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے جو ہم نے قرآن میں کعبے کی مسلسل مرکزی حیثیت کے بارے میں دی ہے، Hurgronje اور شوالی کا یہ نظریہ کہ سورہ النحل ۱۶ کی آیات ۳۶-۳۸ مدنی ہیں، رد کر دیا جانا چاہیے-

مدنی ادوار میں ایک تسلسل تھا اور اسلام کے کعبے سے وابستگی کو مدینے میں اس لیے ضابطہ کے تحت لایا گیا کہ مسلم امت اب مکے میں نہیں، بلکہ مدینے میں تھی۔ اگرچہ اہل مکہ کی دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں کو عملاً حج کرنے کے لیے کئی برس انتظار کرنا پڑا۔

تاہم قبلے کے مسئلے پر تسلسل بیت المقدس پر تھا، نہ کہ کعبہ پر۔ پیغمبر نے بیت المقدس کو مدینے میں قبلہ نہیں اختیار کیا تھا بلکہ جیسا کہ ابن اسحاق ہمیں بتاتے ہیں اس سے بہت پہلے خود مکہ میں اختیار کیا تھا۔ (۱۲) اگرچہ وہ آگے بتاتا ہے کہ پیغمبر بیت المقدس کی طرف اس طرح منہ کرتے تھے کہ ان کا منہ بیک وقت کعبے کی طرف بھی ہوتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر نے اگر پہلے بیت المقدس کو اپنے قبلے کے لیے منتخب کیا تو اس سے مدینے کے یہودیوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ اس انتخاب میں اس تقدس کو دخل ہو جو قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے منسوب کیا جاتا تھا۔ لیکن مجھے یہ زیادہ قرین قیاس لگتا ہے کہ یہ انتخاب اہل مکہ کے ہاتھوں مسلمانوں پر مظالم ٹوٹنے کے خلاف احتجاج کے طور پر کیا گیا تھا۔ شروع سالوں میں مسلمانوں کو حرم کعبہ میں عبادت کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ابن اسحاق ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جب اسلام میں پہلی دفعہ جماعت کے ساتھ نماز فرض ہوئی تو مسلمان مظالم کے ڈر سے مکہ کے باہر ایک خفیہ مقام پر نماز ادا کرتے تھے اور ایک دفعہ جب اہل مکہ کے ایک گروہ نے مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھتے ہوئے پایا تو انہوں نے ان پر مذاق کیا جس پر لڑائی ہوگئی اور اس میں سعد بن ابی وقاص نے اونٹ کے شانے کی ہڈی مار کر ایک مکی کو زخمی کر دیا۔ "یہ پہلا خون تھا جو اسلام کے اعلان کے بعد بہا تھا"۔ (۱۳) مسلمان ہجرت حبشہ کے بھی ایک عرصہ بعد تک حرم کعبہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ تا آنکہ حضرت عمر مسلمان ہو گئے اور انہوں نے وہاں عبادت کرنے کا حق کامیابی سے منوا لیا۔ (۱۴) اس کے بعد بھی مسلمان جھگڑے سے بچنے کے لیے ایک ذاتی گھر میں جمع ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ اگرچہ پیغمبر خود بعض اوقات حرم میں نماز پڑھ لیتے تھے۔

مدینے کی طرف ہجرت کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کی نماز کا قبلہ بنا رہا۔ چنانچہ اس کو

(۱۲) ابن اسحاق کی مذکورہ بالا تصنیف (جلد ۱: ۳۱۸، سطر ۱۲ و مابعد، اسی طرح جلد ۲: ۴۷، سطر ۳ و مابعد) جہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب اہل مدینہ پیغمبر کے ساتھ ان کے مدینہ کو ہجرت کے سلسلے میں معاہدہ کرنے گئے اور اس گروہ نے مکہ جاتے ہوئے راستے میں نماز پڑھی تو ان کے لیڈر البراء ابن معرور نے کعبہ کی بجائے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے سے انکار کر دیا، جبکہ دوسرے سب لوگوں نے مکہ میں پیغمبر کے عمل کی پیروی میں بیت المقدس کی طرف رخ کیا۔

(۱۳) ایضاً ج ۱: ۱۷۵، سطر ۸ و مابعد

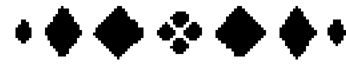
(۱۴) ایضاً ج ۱: ۳۶۱ سطر ۱۴ و مابعد

چھوڑ کر کعبے کو قبلہ مقرر کرنے کے معنی، بخلاف حج کے، ایک پرانے دستور کو ختم کرنے کے تھے اور اس تبدیلی کو اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب تک اسلام کے مرکزی حرم کے طور پر کعبہ کو اسلامی نظام میں باضابطہ مقام نہ مل جاتا- جب اس باضابطہ عمل سے یہ واضح ہو گیا کہ اسلام کا مرکز ثقل (centre of gravity) کہاں واقع ہے تو قبلے میں تبدیلی عمل میں لائی گئی- یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے (البقرہ ۲ کی آیت ۱۴۲ سے شروع کر کے ''نادان لوگ ضرور کہیں گے، انہیں کس چیز نے اپنے اس قبلے سے پھیر دیا جس کی طرف منہ کر کے یہ نماز پڑھتے تھے'') اس تبدیلی پر بے چینی کی توقع اتنی یہودیوں کی طرف سے نہیں تھی جتنی منافقین کی طرف سے تھی، جو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف کے بیج بونا چاہتے تھے- ہم مسلمانوں اور یہودیوں کے بگڑتے ہوئے تعلقات کی اہمیت سے انکار نہیں کرنا چاہتے لیکن اس بات پر ضرور زور دینا چاہتے ہیں کہ قبلے کی تبدیلی کی اصل وجہ کہیں اور واقع ہے- مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات تو پیغمبر کے مدینے میں آمد کے ساتھ ہی خراب ہونا شروع ہو گئے تھے، لیکن ایسا نہیں تھا کہ یہ بگڑے ہوئے تعلقات از خود قبلے کے مسئلے پر اثر انداز ہوتے- پیغمبر یہودیوں سے لاتعلق رہ کر بھی بیت المقدس کو قبلہ رکھ سکتے تھے، جس طرح کہ انہوں نے انبیاء کی انجیلی روایت کے ساتھ اپنا پیغمبری رشتہ تو برقرار رکھا تھا، لیکن یہودیوں کو اس روایت کے صحیح نمائندے ماننے سے انکار کر دیا تھا- چنانچہ ہمیں چاہیے کہ اس مسئلے کا صحیح حل کہیں اور تلاش کریں، اور وہ حل مکہ کے حرم کعبہ کی دین اسلام میں مرکزی حیثیت ہے-

اور آخر میں یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ''یہودیوں سے مقاطعے'' کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے اس کا جواز کیا ہے- کوئی ایک خاص واقعہ یا اعلان یا کوئی اقدام پیغمبر کی طرف سے یا یہودیوں کی طرف سے ایسا نہیں ملتا جسے اس خالی خولی جملے کا واحد حوالہ قرار دیا جائے- ہمیں بعض اوقات بتایا جاتا ہے کہ قبلے کی تبدیلی بذات خود ''یہودیوں سے قطع تعلق'' کی دلیل ہے- اور اس پر ظاہر ہے کہ اس طرح کا سوال پیدا ہوتا ہے-(۱۵) مدینے کے یہودیوں کے ساتھ طویل تنازعے رہے اور ان کی طرف سے بہت تنقیدیں بھی ہوئیں، اور جب یہودیوں نے اسلام لانے سے انکار کر دیا تو ان کو ایک علیحدہ امت قرار دیا گیا، لیکن ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ جنگوں میں مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد نہیں کریں گے، بلکہ ان کے حملوں کے خلاف مدینے کے دفاع میں مدد دیں گے

(۱۵) منٹگمری واٹ: "Bell's Introduction to the Quran" (Edinburgh) صفحہ ۱۲، سطر ۱۲ و مابعد

جب اس پر عمل نہ ہوا تو یہودیوں کو نکال دیا گیا اور آخری مرحلے میں ان کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن یہودیوں کی آنحضرتؐ پر تنقید، آنحضرتؐ کا بطور امت کے ان کو تسلیم کرنا، اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دینا، یہ سب کچھ بیک وقت ہوا، چنانچہ ان کو مختلف اوقات پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں کون سا فینا مینا ''یہودیوں سے مقاطعہ'' قرار پاتا ہے؟ یہودیوں کو مدینے سے نکالنے کے کافی عرصہ بعد تک قرآن عیسائیوں کی طرح ان پر بھی دینی نقطہ نظر سے تنقید جاری رکھتا ہے (مثال کے طور پر دیکھئے التوبہ ۹ کی آیت ۳۰)



ضمیمہ 1

مکے میں مسلم امت کی مذہبی صورت حال

اسلام سے پہلے عرب کے مذہبی حالات بہت سے مغربی اہل قلم کے لیے دلچسپ موضوع رہے ہیں- ان لوگوں کے لیے جو اسلام کے عروج کے بارے میں سوچتے ہیں ان حالات کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اس فینامینا کے ظہور کی وجہ بتاتے ہیں- ان کی دلچسپی کا سب سے پہلا موضوع وہ ہے جسے "قرآن کے مآخذ" کہا جاتا ہے- لیکن مغربی سکالروں کے درمیان اس بارے میں وسیع اختلاف ہے کہ آیا مکے کے اندر یا اس کے اردگرد یہودی یا عیسائی موجود تھے اور اگر تھے تو کس قدر تھے اور ان کے مذہبی اثرات کیا تھے-

سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ سکالر یہودی اور مسیحی کتابوں اور روایتوں کے ساتھ قرآن کے تعلق کے مسائل میں اتنے ڈوبے رہتے ہیں کہ وہ اسلام سے پہلے مکے کی عرب آبادی میں یہودی مسیحی خیالات کی موجودگی پر بمشکل بات کرتے ہیں- میدان دو واضح کیمپوں میں بٹا ہوا ہے- رچرڈ بیل (1) کی طرح ایک کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کا بڑا تاریخی ماخذ عیسائیت تھی- دوسرا فریق جس میں C.C Torrey (۲) شامل ہے، اصرار کرتا ہے کہ یہودیت ہی قرآن کا بڑا تاریخی حوالہ تھا- ان میں سے کوئی بھی اس نقطہ نظر پر جس کا خود قرآن بڑے شدومد سے اظہار کرتا ہے، بات نہیں کرتا یعنی یہ کہ قرآن اپنے تمام تاریخی مواد کے باوجود، خدا کی طرف سے براہ راست وحی کیا ہوا ہے (۳)- منٹگمری واٹ (۴) کا خیال ہے کہ عرب کے ماحول میں، خصوصاً مکے میں، یہودی مسیحی خیالات عام طور پر موجود تھے- لیکن اس کے لیے وہ کوئی مخصوص شہادت پیش

(1) دیکھئے اس کی کتاب The Origin of Islam in its Christian Environment (لندن: ۱۹۲۶)

(۲) CC Torrey .The Jewish Foundation of Islam (New Yark 1933)

(۳) دیکھئے اس سے پہلے باب ہشتم-

(۴) منٹگمری واٹ Mohammad at Mecca (آکسفورڈ ۱۹۵۳) باب اول

نہیں کرتا- ہم آگے اس صورت حال کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے اور بتائیں گے اسلام جتنا عرصہ مکے میں موجود رہا اس کے اہل مکہ نیز یہودی مسیحی روایت کے ساتھ تعلق کے نمایاں خدوخال کیا تھے-

اس سوال پر کہ مکے میں کوئی بڑی یہودی یا عیسائی آبادی تھی، آراء میں کافی اختلاف ہے- بیل اور واٹ کا خیال ہے کہ وہاں ''اہل کتاب'' کی کوئی قابل لحاظ آبادی نہیں تھی- جبکہ ٹوری کی کم سنجیدہ رائے یہ فرض کرتی ہے کہ یہودیوں کی وہاں ایک بڑی کالونی تھی لیکن اس کے لیے وہ ٹھوس شہادت مہیا نہیں کرتا- ٹوری کے تھیسس کے ساتھ اصل مشکل یہ ہے کہ جہاں ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بڑے پیمانے پر یہودیوں کے گروہ جو مثلاً مدینے اور خیبر میں موجود تھے، ان کے ساتھ کیا ہوا وہاں نہ قرآن میں اور نہ مسلم لٹریچر میں کوئی ذکر اس امر کا موجود ہے کہ مکے میں بسنے والے بڑے یہودی گروہ کے ساتھ کیا ہوا- کیا یہ یہودی جماعت آخر کار اسلام لے آئی یا مدینے اور خیبر کی بڑی یہودی آبادیوں کی طرح یہ بھی انتہا پسندانہ طور پر اس کے خلاف رہے، ہم قدرتی طور پر اس بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں لیکن اس موضوع پر کوئی چیز سامنے نہیں آتی- اس کے برعکس جو تھیسس ہے کہ مکے میں بمشکل کوئی یہودی یا عیسائی تھے تو یہ بھی قرآن کی شہادت کے پیش نظر کچھ سنجیدہ قسم کے سوالات اٹھاتا ہے- ایسا کوئی نظریہ ضرور مرتب کرنا چاہیے جو دونوں اطراف کے ساتھ انصاف کر سکے- اس مسئلے کا اطمینان بخش جواب جو بھی ہو گا وہ ہمیں مکے میں ''اہل کتاب'' اور مشرکین مکہ کے مقابلے میں اسلام کی روش اور رفتار کے بارے میں محسوس طور پر زیادہ واضح تصویر مہیا کرے گا نیز مغربی سکالروں کی اس بارے میں آراء کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر دے گا کہ حالات کا جو ارتقاء ہوا وہ کہاں تک مدنی تھا اور کہاں تک مکی، اور اس کے ساتھ وہ قرآن میں استعمال ہونے والی بعض کلیدی اصطلاحات کی بھی تشریح کر دے گا-

یہ بات پہلے نوٹ کرنے کی ہے کہ مکے کے عرب لوگوں کے درمیان جب اسلام نے ظہور کیا ہے تو ان سب کے مذہبی نقطہ ہائے نظر ایک جیسے نہیں تھے ان میں سے اکثر، خصوصاً تاجر پیشہ امراء، اپنے آبائی مذہب کی بت پرستی پر قائم تھے لیکن دوسرے افراد ہوں یا گروہ، ایک نئے مذہب کی تلاش میں تھے جو توحید کی طرف دعوت دے- ابن اسحاق تین مکی افراد کا نام لیتا ہے جو عیسائی ہو گئے تھے، جبکہ ایک زید ابن عمر ابن نفیل بقول ابن اسحاق، نہ یہودی ہوا نہ عیسائی! بلکہ وہ ایک نئے مذہب کی تلاش میں فوت ہو گیا- اسلام میں شروع زمانے میں داخل ہونے والے ایک صحابی

عثمان بن مظعون بھی اسی طرح کی مذہبی ادھیڑ بن اور بے چینی میں سے گزرے تھے- یہ بات کہ بہت سے مکی عربوں کو "اہل کتاب" نے اپنے مذاہب کی طرف دعوت دی تھی، قرآن سے ثابت ہے، سورہ النمل ۲۷ کی آیات ۶۷، ۶۸ میں ہم پڑھتے ہیں: "اور جو لوگ کافر ہیں کہتے ہیں کہ جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر قبروں سے نکالے جائیں گے- یہ وعدہ ہم سے بھی کیا گیا ہے اور اس سے پہلے ہمارے آباؤاجداد سے بھی کیا گیا تھا، یہ تو صرف اگلے وقتوں کے لوگوں کی کہانیاں ہیں" یہی بات سورہ المومنون ۲۳ کی آیت ۸۳ میں تقریباً انہی الفاظ میں دہرائی جاتی ہے- یہ جملہ کہ "ہمارے ساتھ اور ہم سے پہلے ہمارے آباؤاجداد کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا تھا" میرے خیال میں صاف بتاتا ہے کہ یہودی اور عیسائی کچھ عرصے تک، چھوٹے یا بڑے پیمانے پر، عرب لوگوں کا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے-

درحقیقت کفار عرب کا بار بار یہ الزام کہ قرآن "پہلے لوگوں کے اساطیر" ہی بیان کرتا ہے اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ بہت سے عربوں کو یہودی، عیسائی روایت کی تعلیمات کا علم تھا- پھر ہمیں قرآن سے اس بات کا صریح اشارہ ملتا ہے کہ کم از کم بعض عربوں نے یہ تعلیم بہت منظم طریقے سے حاصل کی تھی-

> "ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے- ان سے پوچھو پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا جو تمام لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی جسے تم نے اوراق پر نقل کر رکھا ہے- اس میں سے کچھ ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپاتے ہو، اور جس کے ذریعے وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو- اس کتاب کا نازل کرنے والا کون تھا؟ کہو: اللہ اور پھر انہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو-" (الانعام ۶:۹۱)

جیسا کہ ہم نے باب ہشتم میں بتایا یہ جملہ کہ "جس سے (یعنی موسیٰ کی کتاب سے) تمہیں وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو" اس کا خطاب جیسا کہ صورت حال کا تقاضا ہے لازماً کفار عرب کی طرف ہی ہوگا، نہ کہ یہودیوں سے یا مسلمانوں سے، اسی طرح اس آیت کے ابتدائی الفاظ: "اور انہوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا" ان کا خطاب بھی صرف کفار عرب کی طرف ہی ہوگا جو کسی طرح کی

وحی میں یقین نہیں رکھتے تھے- تاہم سوال یہ ہے کہ اس آیت کا خطاب کس کی طرف ہے کہ "ان سے پوچھو پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا، جسے تم اوراق میں نقل کر لیتے ہو؟" ظاہر ہے کہ اس کا خطاب یہودیوں کی طرف ہی ہو سکتا ہے-

لیکن کون سے یہودی؟ نولدیکےشوالی اور بیل دونوں کا خیال ہے کہ اس آیت کا تعلق مدینے کے یہود سے ہے اور آیت کا یہ حصہ مدنی ہے، اگرچہ بیل، بغیر کسی ادنیٰ شہادت کے، یہ سمجھتا ہے کہ پوری آیت ہی مدنی ہے- جبکہ نویلدیکےشوالی کا خیال ہے کہ آیت کا باقی حصہ مکی ہے اور اس کے مخاطب مکہ کے عرب ہیں- لیکن اس پوری آیت کا تانا بانا ایسا گٹھا ہوا ہے (جیسا کہ Rudi Paret نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے) کہ یہ خیال کرنا کہ اس کا ایک حصہ مکی ہے اور دوسرا مدنی لغو معلوم ہوتا ہے- اور اتنا ہی لغو یہ خیال ہے کہ یہ صرف مدنی ہے- یہ آیت مکی ہے اور اس کا خطاب کفار مکہ اور یہود دونوں سے ہے- لیکن ایک دفعہ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے یہودی؟ جواب یہ ہے کہ وہی یہودی جن سے کفار مکہ اور ان کے آباؤ اجداد نے موسوی تعلیمات سیکھی تھیں اور جن سے انہیں قبروں سے اٹھائے جانے کے وعدے کا علم ہوا تھا (سورہ النمل ۲۷ آیت ۶۸) قرآن کے بیان سے یہودیوں اور اہل مکہ کے درمیان صرف کبھی کبھی کے میل میلاپ کا نہیں بلکہ کافی گہری اور بار بار ہونے والی ملاقاتوں کا اشارہ ملتا ہے- تاہم، جیسا کہ ہم نے پہلے خیال ظاہر کیا، ہم مکے میں کسی بڑے پیمانے پر یہودیوں کی موجودگی فرض نہیں کر سکتے - البتہ یہ مانا جا سکتا ہے کہ مکہ میں چند ایک یہودی تھے جن کے ہاں دوسرے یہودی، جو رشتے دار بھی ہو سکتے ہیں، مدینے سے گاہے بگاہے آتے رہتے تھے- اسی طرح مکی تاجر مدینے سے گزرتے ہوئے یا وہاں اپنے رشتہ داروں سے ملتے ہوئے اکثر یہودیوں سے، یا شاید عیسائیوں کے ساتھ بھی تبادلہ خیال کرتے ہوں گے-

جو کچھ بھی ہو اس طرح کا میل جول خاصے بڑے، پیمانے پر اور منظم تھا- جب اہل مکہ کی لگاتار کوششیں پیغمبر کے پیغام کو پھیلنے سے روکنے میں ناکام ہو گئیں تو انہوں نے النضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودیوں کے پاس اس بارے میں صلاح مشورے کے لیے بھیجا کہ پیغمبر کو دلیل سے کیسے مغلوب کیا جائے- ابن الحارث ایرانی کہانیوں سے بھی کافی واقف تھا اور جب آنحضرتؐ قریش کے افراد کے درمیان بیٹھ کر انہیں تبلیغ کرتے ان کو قرآن پڑھ کر سناتے اور پہلی قوموں کے ساتھ جو ہوا اس سے عبرت دلاتے تو جب وہ اٹھ کر چلے جاتے تو النضر ان کی جگہ لے

لیتا اور قدیم ایران کی کہانیاں سنانے کے بعد دعویٰ کرتا کہ قدیم لوگوں کی کہانیاں سنانے میں وہ پیغمبر کا مقابلہ کرسکتا ہے۔(۵)

یہ شہادت بغیر کسی شک وشبے کے یہ ثابت کرتی ہے کہ کم از کم بعض اہل مکہ اپنے پاس پڑوس کی قوموں کی روایات سیکھنے کا شوق رکھتے تھے اور خاص طور پر یہودیوں سے سیکھی ہوئی انجیلی روایات سے کافی واقف تھے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ کچھ یہودی اور شاید عیسائی بھی ایسے تھے جو کسی مسیحا کے آنے کی امید رکھتے تھے اور جب پیغمبر منظر پر ظاہر ہوئے تو انہوں نے ان کی حمایت کی، انہیں اپنا مشن جاری رکھنے پر اکسایا، اور ان کے پیغام پر ایمان لے آئے۔ اگرچہ یہ لوگ جنہیں عام طور پر ''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی تھی'' یا ''وہ لوگ جنہیں کتاب دی جا چکی تھی'' یا ''اہل علم'' یا ''تنبیہ کرنے والے لوگ'' کہا جاتا ہے، ان کا ذکر مدینے میں بھی آتا ہے تاہم وہ زیادہ نمایاں مکے میں ہی رہتے ہیں۔ جب اہل مکہ نے پیغمبر سے اس بات کا ثبوت مانگا کہ وہ واقعی اللہ کے پیغمبر ہیں تو قرآن نے کہا'' کیا یہ ان کے لیے (یعنی کفار مکہ کے لیے) نشانی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے اہل علم اسے پہچانتے ہیں؟ (الشعراء ۲۶: ۱۹۷) بعد ازاں مکہ مکرمہ میں قرآن ایک نمایاں فرق پیدا کرتا ہے ان لوگوں میں اور عام یہودیوں میں، جو قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور جن کو فرقہ پرست (احزاب) کہہ کر مطعون کیا گیا۔ پھر ہمارے سامنے یہ آیت ہے کہ'' پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا ہو، اور اس کے بعد ایک گواہ بھی خدا کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آ گیا ہو اور پہلے موسیٰ کی کتاب بھی راہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی موجود ہو (کیا ایسا شخص قرآن کا انکار کرسکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے۔ البتہ ان فرقہ پرستوں (احزاب) میں سے جو کوئی بھی اس کا انکار کرے گا تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے، (ھود ۱۱: ۱۷) اس سے آگے ہم پڑھتے ہیں'' جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے خوش ہیں، لیکن فرقہ پرست لوگوں (احزاب) میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے'' (الرعد ۱۳: ۳۶) اور سورہ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۴۷ ہمیں بتاتی ہے'' اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری، تو جن لوگوں کو ہم نے پہلے ہی کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان لوگوں (یعنی اہل عرب) میں سے بھی بعض ایسے ہیں جو اس پر ایمان لا رہے ہیں''

(۵) ابن اسحاق: سیرت (قاہرہ ۱۹۳۷) جلد ۱: ۳۲۰ و مابعد، ۳۸۱

لیکن جہاں یہ کافی حد تک واضح ہے کہ اہل مکہ میں یہودی اور یہودی مسیحی خیالات وعقائد خاصے پھیل چکے تھے یہ خود قرآن سے بھی اتنا ہی واضح ہے کہ چند قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر اہل مکہ یہودیت یا عیسائیت قبول کرنے کی طرف مائل نہیں تھے- جہاں ان کی اکثریت، خصوصا تاجر اشرافیہ، اپنے باپ دادا کے مذہب کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے، وہاں ایسے لوگ جو کم وبیش شدید قسم کے مذہبی ہیجان سے گزر رہے تھے، ایک نئے اور خاص انداز کے مذہب کی آرزو رکھتے تھے جوان کو پہلی امتوں سے ممیز کر کے انہیں اس قابل بنائے کہ ہدایت کی راہ میں وہ ان سے آگے بڑھ جائیں- اس بات کا امکان موجود ہے کہ "اہل کتاب" کے انتظار نجات دہندہ نے مکہ کے عربوں کو بھی متاثر کیا تھا اور وہ بجائے پرانے مذہبوں کی پیروی کرنے کے ایک نیا مذہب چاہتے تھے- یہ بتانے کے بعد کہ قرآن اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اگر اہل مکہ پر اپنے اعمال کی وجہ سے کوئی آفت آ جائے تو وہ یہ عذر پیش کریں گے کہ کوئی ایسا الوہی پیغام ان تک نہیں پہنچا جس کا وہ اتباع کرتے، یہ بتانے کے بعد قرآن کہتا ہے "لیکن جب ہمارے ہاں سے ان کو حق آ گیا تو کہنے لگے کہ اسے (یعنی پیغمبر کو) وہ کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا- لیکن کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے جو موسیٰ کو دیا گیا تھا" (القصص ۲۸:۴۷-۴۸) قرآن اہل مکہ پر طنز کرتا ہے کہ یہ لوگ "کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس ڈرانے والا آ گیا تو وہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہو جائیں گے- اور جب ان کے پاس ڈرانے والا آ گیا تو اس نے اُن میں بیزاری کے سوا کوئی اضافہ نہ کیا" (الفاطر ۳۵:۴۲) "اور ایک برکت والی کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے، پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے- قرآن تمہاری طرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ دوسری صورت میں تم کہتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں کو دی گئی اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان (یہودیوں اور عیسائیوں) سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے-" (الانعام ۶:۱۵۵)

ہم نے اب تک تین نکات قائم کئے ہیں (ا) یہ کہ اسلام سے پہلے عربوں اور اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کے درمیان روابط موجود تھے- خاصے بڑے پیمانے پر اور منظم روابط، جو لمبے عرصے پر پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ اہل مکہ یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ اور ان کے آباؤ اجداد کو آخرت کے دن کی بابت بتایا گیا تھا اور قرآن ان سے کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے موسیٰ کی کتاب سے وہ کچھ سیکھا

تھا جو نہ وہ خود اور نہ ان کے آباؤ واجداد جانتے تھے- (۲) یہ کہ اس کے باوجود اہل مکہ نے عام طور پر قدیم سامی مذاہب کو رد کر دیا تھا اور ان میں سے بہت سے لوگ ایک نئے مذہب، ایک نئے پیغمبر اور ایک نئی آسمانی کتاب کی امید لگا کر بیٹھے تھے جن کے بل بوتے پر وہ دو پہلی امتوں سے آگے نکل جائیں اور (۳) یہ کہ اسلام کے شروع زمانے سے بعض یہودیوں اور عیسائیوں نے پیغمبر کے مشن کی حمایت کی تھی، نیز یہ کہ شاید ان اہل علم یہودیوں اور عیسائیوں میں نجات دہندہ (مسیحا) کا جو تصور تھا اس نے بعض ایسے اہل مکہ پر اثر ڈالا تھا جو ایک نئے مذہب کے ظہور کے خواہش مند تھے اور مکے کے آخری زمانے میں قرآن ان یہودیوں اور باقی دوسرے یہودیوں کے درمیان جو قرآن کو نہیں مانتے تھے ایک واضح امتیاز قائم کرتا ہے- وہ ان دوسرے یہودیوں کو ''احزاب'' (فرقہ پرست) کہتا ہے-

یہ مسلمہ طور پر مکی صورت حال ایک مسلسل بحث و نزاع کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اصل میں تو اہل مکہ اور پیغمبر کے درمیان تھی لیکن جس میں یہودی بھی ایک اہم، اگرچہ ثانوی حیثیت کا، تیسرا عنصر تھے- ہمیں مکہ میں نمو پانے والی صورت حال کو پوری طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے تا کہ ہم کافی اعتماد کے ساتھ یہ تعین کر سکیں کہ کون سی آیات مکی دور سے منسوب کی جا سکتی ہیں اور کون سی نہیں کی جا سکتیں- مغربی سکالروں میں اس امر پر قریب قریب اتفاق ہے کہ جہاں کہیں بھی یہودی اسلام کے مخالفین بن کر ظاہر ہوتے ہیں یا جہاں کہیں ''جہاد'' اور اس کے مشتقات یا ''منافق'' کا لفظ واقع ہوتا ہے تو یہ ساری آیات مدنی ہونی چاہئیں، مکی نہیں- یہ نظریہ قائم کرنا بہت اچھی اور اکسانے والی بات لگتی ہے، اس لیے کہ مدینے میں یہودیوں اور منافقین کی دشمنی کا فینا مینا بہت نمایاں ہے- لیکن اگر انسان مکے میں نمو پانے والے حالات کا بغور مطالعہ کرے تو وہ یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ''جہاد'' اور ''منافقین'' جیسے الفاظ مکے میں ہی استعمال ہونے لگ گئے تھے، اگرچہ ان کے معانی مدینے میں آ کر بہت پر زور اور زیادہ واضح عیاں ہو جاتے ہیں- اصل میں یہ حقیقت کہ بعض آیات میں ان کے الفاظ کے معانی میں زور اور وضاحت کی کمی محسوس ہوتی ہے، اس امر کی دلیل ہے کہ یہ آیات مکی ہیں نہ کہ مدنی- اور پھر اس کی تائید متعلقہ پس منظر شہادت سے ہوتی ہے-

سورہ المائدہ ۵ کی آیت ۹۲ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم نے اس بات کی طرف توجہ مبذول کی تھی کہ یہ آیات عربوں اور مکے کے رہنے والے یہودیوں دونوں سے خطاب کرتی ہیں اور یہودیوں

پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے موسیٰ کی کتاب کو اس طرح نقل کیا تھا کہ اس کے کچھ حصے انہوں نے لوگوں کی نگاہ سے مخفی رکھے تھے- یہ الزام اگر چہ مدینہ پہنچنے پر بھی رہا لیکن اس کا آغاز مکے میں ہی ہوا تھا بلکہ ایک صریحاً مکی آیت میں قرآن اپنی بات یہودی منشیوں پر طنز کرنے کے انداز میں کہتا ہے "اور اے نبی! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے، نہ اپنے داہنے ہاتھ سے اس کو لکھتے تھے- اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک میں پڑ سکتے تھے" (العنکبوت ۲۹: ۴۸) سورہ الشوریٰ ۴۲ کی آیت ۱۳ میں جہاں قرآن وحی شدہ مذاہب کے ایک ہونے پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انبیاء کا سلسلہ جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام سے چل کر، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سے ہوتا ہوا محمد تک آتا ہے، یہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اور اعلان کرتا ہے کہ خاص طور پر کفار مکہ انبیاء کی جانشینی کے اس سارے سلسلے کے خلاف ہیں، وہیں یہ پہلی امتوں میں تفریقوں اور فرقہ بندیوں کی بھی کھل کر مذمت کرتا ہے- یہ وہ فیناً مینا ہے جسے ہم باب ہشتم میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں- پھر سورہ الشوریٰ ۴۲ کی آیت ۱۴ میں یہ بتانے کے بعد کہ یہ پہلی امتیں گروہوں میں بٹ جانے سے بہت ہی سنجیدہ قسم کے شکوک و شبہات کا نشانہ بن گئی ہیں، قرآن اگلی آیت میں پیغمبر سے کہتا ہے کہ ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کے مذہبی اور دینیاتی معاملات میں انصاف کرو، لیکن ان کے معاشرتی معاملات میں نہیں (جو مدینہ میں واقع ہوئے) بلکہ قرآن کو ان معاملات میں فیصلہ دینے والا کہا گیا جن میں بنی اسرائیل- جن میں شاید عیسائی بھی شامل ہیں- آپس میں اختلاف کرتے تھے- "یہ قرآن بنی اسرائیل کو ان میں سے اکثر باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں یہ باہم اختلاف کرتے ہیں" (النمل ۲۶: ۷۶) اس لیے یہ بات بڑی عجیب ہے کہ مغربی سکالر سورہ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۴۶ کو مدنی قرار دیں- جس میں آتا ہے "اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں"-

نولدیکے شوالی اور دوسرے اس آیت کو مدنی کہنے کے حق میں جو دلیل دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی کمزوری کے پیش نظر، قرآن ظلم و عدوان کے مرتکب یہودیوں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی سے عاری سلوک کی حمایت نہیں کر سکتا تھا- مکہ کے آخری زمانے میں اسلام کی صورت حال ایسا معاملہ ہے جس کو ہمیں کھول کر بیان کرنا چاہیے تا کہ ہم کفار مکہ، مسلمانوں اور یہودیوں کی اپنی اپنی پوزیشنوں کو سمجھ بھی سکیں اور ان کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ بھی لگا سکیں- اس لیے ہمیں پہلے مکے میں اسلام کے عرصۂ عمل کا مختصراً ایک خاکہ دینا چاہیے کیونکہ اکثر سکالروں کے

ذہنوں پر ایک امٹ نقش یہ ہے کہ مسلمان بالکل بے یار و مددگار لوگ تھے جبھی انہیں پہلے حبشہ کی طرف اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی- اس سارے عرصے میں ان کی پوزیشن طاقتور قریشی مشرکین کے مقابلے میں بالکل جامد رہی-

یہ بالکل صحیح نہیں ہے- سچ یہ ہے کہ اگر چہ اہل مکہ نئے دین کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم وہ اس کے سامنے بھرپور، مرتکز اور مسلسل مخالفت برپا کرنے کے کبھی قابل نہ ہوئے- مسلمانوں پر ظلم کیے جاتے تھے، بلکہ انہیں عذاب دیا جاتا، لیکن یہ سب کچھ بے ہنگم طریقے سے ہوتا تھا- شاید اس لیے کہ وہ احساس جرم میں مبتلا تھے، ان مسلسل الزامات کی وجہ سے جو قرآن ان پر لگاتا تھا- بت پرستی، تجارت میں دھوکا دہی، اور غریبوں کا استحصال وغیرہ کے الزامات، یا شاید اس لیے کہ اسلام رفتہ رفتہ بہت سے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو گیا جن میں کچھ باعزت اور بااثر لوگ بھی شامل تھے جبکہ اہل مکہ ایک طرف تو حواس باختہ تھے اور دوسری طرف ان کی مخالفت غیر منظم اور بددلانہ سی تھی (ابوطالب کی حفاظت کی وجہ سے خود پیغمبر کی مامونیت کو بھی سامنے رکھیے)

جب شروع زمانے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوعبیدہ بن الجراحؓ ایمان لے آئے اور آنحضرتؐ نے کھلم کھلا اپنی تحریک شروع کر دی تو قریش کے بعض رہنما جب وہ ابوطالب کو اس بات پر آمادہ کرنے میں دو دفعہ ناکام ہو گئے کہ یا تو وہ پیغمبر کو اپنے نئے پیغام کی تبلیغ سے روک دیں یا ان کی حفاظت سے ہاتھ اٹھا دیں، ایک موثر اور نتیجہ خیز تدبیر سوچنے کے لیے جمع ہوئے- لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ انہوں نے اپنی پوزیشن کو بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان پہنچا دیا- کیونکہ حج کے موقع پر جہاں انہوں نے پیغمبر کے خلاف پروپاگنڈا کیا تو تمام عرب لوگ، جن میں اہل مدینہ بھی شامل تھے، اسلام کے نام سے واقف ہو گئے- حضرت حمزہؓ کے اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں پر سنجیدگی سے مظالم کیے جانے لگے- مظالم کے اس سلسلے کا نتیجہ حبشہ کی پہلی ہجرت تھی- جس میں خاص طور پر مسلم معاشرے کے کمزور افراد شامل تھے لیکن ابھی یہ ہجرت جاری تھی کہ حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے- ابن اسحاق ہمیں بتاتا ہے کہ عمرؓ اور حمزہؓ کے اسلام نے مسلمانوں کو اتنی قوت پہنچا دی کہ وہ صاحب اقتدار قریش کے ساتھ مقابلہ کرنے یا ان کو برداشت کرنے کے قابل ہو گئے-(۶) اس صورت حال نے قریش کو گویا گھبراہٹ میں، اس بات پر اکسایا کہ انہوں نے بنو ہاشم کے خاندان کا مقاطعہ کر لیا، جو دو یا تین سال بعد ناکام ہو گیا (جیسا کہ وہ کبھی کامیاب

(۶) ایضاً جلد ۱: ۳۶۴

بھی ہوسکتا تھا) بعض اوقات نئی امت کے بعض افراد کی سخت آزمائشوں کے باوجود، اہل مکہ--- یہودیوں کی مدد کے ہوتے ہوئے بھی---کبھی پیغمبر کو ان مباحثوں میں خاموش نہ کر سکے جن میں وہ انہیں گاہے بگاہے الجھائے رکھتے تھے یا کسی ایسے نکتے پر نہ پہنچ سکے جہاں نئی تحریک کو کچلنا ناگزیر معلوم ہوتا- البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو لوگوں کے قبول اسلام کی راہ میں جو آہستہ آہستہ لیکن متواتر کامیابیاں حاصل ہوئیں ان سے وہ مضبوط اور زیادہ مضبوط ہوتے چلے گئے-

پیغمبر اور ان کے پیروکاروں کو اس صورت حال میں بالکل بے بس اور اپنے مخالفین کے رحم و کرم پر سمجھنا کہ وہ اپنی مرضی سے انہیں قتل کر دیں یا برباد کر دیں، یہ یقیناً ایک نیم اسطور ہے جو کوئی شک نہیں بعد کے زمانے کے بعض مسلم بیانات نے پیدا کی ہے اور اسے جدید مستشرقین کے ذہنوں پر مرتسم کر دیا ہے- اسی کا نتیجہ نولدیکےشوالی کا یہ قول ہے کہ سورہ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۴۶ میں یہ جملہ کہ ''سوائے ان (یہودیوں) کے جو حد سے بڑھتے ہیں'' مکی نہیں ہوسکتا- تاہم سورہ النمل ۲۷ کی آیت ۷۶ جس میں قرآن کہتا ہے کہ ''وہ بنی اسرائیل کو اکثر ان باتوں کی حقیقت بتا دیتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں'' شکر ہے کہ نولدیکےشوالی اسے مکی تسلیم کرتے ہیں- یہ بھی واضح ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات کے بعد، پیغمبر نے حج کے موسم میں مختلف مخالف قبائل کے سامنے اپنا پیغام پیش کیا اور طائف بھی گئے اور بالآخر مدینے کی طرف ہجرت کر گئے تو یہ اعمال کسی بے بس اور مایوس انسان کے نہیں تھے بلکہ ایک ایسے انسان کے تھے جس نے اتنے حامی پیدا کر لئے تھے کہ وہ پراعتماد ہو گیا تھا کہ اگر بعض بیرونی عناصر کی تائید اسے حاصل ہو تو وہ دیر یا سویر مکے کو اسلام کے لیے حاصل کر سکتا ہے- ابن اسحاق ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہجرت سے پہلے اہل مدینہ کے ساتھ عقبہ میں اپنی دوسری ملاقات میں پیغمبرؐ کے ساتھ ان کے چچا عباس بھی تھے، جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن انہوں نے مدینے والوں سے کہا کہ محمدؐ اور ان کا پیغام دونوں آپ کی تحویل میں مدد کے لیے دیئے جا رہے ہیں نہ کہ ان سے دست بردار ہو کر ہم انہیں آپ کے حوالے کر رہے ہیں- اس لیے کہ محمدؐ کے لیے مکے میں کافی حفاظت موجود ہے-(۷)

اس کی روشنی میں ہم کچھ آیات پر بات کر سکتے ہیں جنہیں بعض مسلم مفسرین مدنی قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرے انہیں مکی سمجھتے ہیں اور جنہیں A. Sprenger اور اس کے بعد

(۷) ایضاً جلد۲: ۴۹-۵۰

Hirschfeld (۸) کو چھوڑ کر تمام مغربی سکالر مدنی بتاتے ہیں اس لیے کہ ان میں ''جہاد'' اور ''منافق'' کے لفظ استعمال ہوئے ہیں:

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا- حالانکہ ہم نے ان سب لوگوں کی آزمائش کی ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں- اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون- اور کیا وہ لوگ جو برے کام کر رہے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے- بڑا غلط حکم یہ لوگ لگا رہے ہیں------- اور جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا- اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے---- اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں (جاھداک) کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک کرے کہ جس کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا، تو ان کی اطاعت نہ کر- میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے تو اس وقت میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو--- اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے ہم اللہ پر ایمان لے آئے- لیکن جب اللہ کے معاملے میں اسے تکلیف پہنچائی گئی تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا- اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو یہ (ابن الوقت لوگ) کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے- کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں- اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون!''
(العنکبوت ۲۹:۱-۱۰)

ان آیات میں تین ایسی کلیدی اصطلاحات کا جمگھٹا ہو گیا ہے جن کا آپس میں قریبی تعلق ہے- ان میں ایک ''فتنہ'' ہے جو ایسی صورت حال بیان کرتا ہے جہاں ایک شخص پر دوسرے لوگوں، زیادہ تر اعزاء اور احباب، کا دباؤ پڑتا ہے کہ وہ اپنی وابستگیوں کو چھوڑ دے یا اپنے خیالات سے باز

(۸) نولدکے کے حوالے: Geschichte des Qorans (نیویارک: ۱۹۷۰) حصہ اول، ص ۱۵۵، نوٹ ۳

آ جائے- اس کا ہتھیار پروپاگنڈا بھی ہوسکتا ہے یا ذہنی یا جسمانی ایذا رسانی بھی- فتنہ میں ایک عنصر یہ دکھائی دیتا ہے کہ اگرچہ اس کا شکار عموماً افراد یا خاندان ہوتے ہیں، اس کا استعمال خاصے بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے اور یہ ایسی صورت حال پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ کیا کریں اور اگر وہ واقعی بہت مضبوط نہ ہوں تو دیر یا سویر اس دباؤ کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں- دوسری کلیدی اصطلاح ''جہاد'' ہے جس کے معنی ہیں کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنا یا بہت کوشش کرنا- یہ لفظ دو دفعہ استعمال ہوا ہے- ایک دفعہ کسی شخص کے حوالے سے اور فتنہ کے خلاف ڈٹ جانے کی کوشش کے معنوں میں (جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا وہ اپنے بھلے کے لیے ہی کرے گا) اور دوسرے انسان کے ماں باپ کے حوالے سے جو اسے اسلام سے شرک کی طرف لانے کی بہت کوشش کرتے ہیں- تیسری اصطلاح ''منافق'' ہے یا ''منافقون'' - اب اگر ہم صرف ''جہاد'' اور ''منافقون'' کے الفاظ سامنے رکھتے ہیں تو ہمیں ترغیب اس بات کی ہوگی کہ ہم ان آیات کو مدنی قرار دیں کیونکہ یہ دونوں معیاری مدنی اصطلاحات ہیں- جہاں تک ''فتنہ'' کا تعلق ہے اگرچہ یہ لفظ مدینے کے شروع زمانے میں استعمال ہوتا ہے، اس عملی دباؤ کو بیان کرنے کے لیے جس میں اہل مکہ کی طرف سے جسمانی تشدد اور ہاتھا پائی بھی شامل تھی، ان نو مسلموں کو واپس لانے کے لیے جو مکے کو چھوڑ کر مدینے میں پیغمبر سے جا ملے تھے- تاہم اس کا معیاری استعمال مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے اس ظلم وستم کے لیے ہے جو اہل مکہ نے خود مکہ میں ان پر روا رکھا تھا- بڑے پیمانے پر ''فتنہ'' بلاشبہ یا تو ہجرت حبشہ سے ذرا پہلے واقع ہوا یا مکے میں پیغمبر کی زندگی کے آخری زمانے میں، اور خاص طور پر مدینے کی طرف ہجرت سے ذرا پہلے یا اس کے دوران میں- A. Sprenger کے نزدیک یہ آیات پہلے جور وتشدد کے دوران میں اتری تھیں-(۹) چونکہ اکثر مسلمان اس وقت اتنے طاقتور نہیں تھے کہ دباؤ کا مقابلہ کر سکتے- یہ بعید از قیاس ہے کہ قرآن نے منحرف ہو جانے والوں کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال کیے ہوں، خاص طور پر ''جہاد'' اور ''منافقون'' کے الفاظ- لیکن پیغمبر کی مکی زندگی کے آخری دور میں اسلام نے خاصی طاقت حاصل کر لی تھی- بلکہ مسلمانوں کو قرآن نے سورہ النمل ۱۶ کی آیت ۱۲۶ میں یہ اجازت دی تھی کہ ان پر اگر حملہ ہو تو اس کا جواب جسمانی تشدد سے دیں، اگرچہ اس آیت میں، جسے مغربی سکالروں کی بڑی تعداد مکی قرار دیتی ہے، ان کے لیے بہتر رویہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ ظلم وستم کی بجائے تشدد کو صبر

---

(۹) ایضاً

کے ساتھ برداشت کرلیں- چنانچہ مسلمان اتنے طاقتور تھے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں- اگر ہم فتنہ کے اس پس منظر میں، اس قرآنی آیت میں ''جہاد'' اور ''منافقون'' کے الفاظ سامنے رکھیں تو فوراً واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے معنی ویسے نہیں ہیں جیسے کہ آگے چل کر مدینے میں ان کے سمجھے گئے- ہمیں پہلے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو آیت کسی ایسے شخص یا اشخاص کا ذکر کرتی ہے جن پر ظلم وتشدد ہوتا ہے تو اسے یوں سمجھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب ہو، وہ کبھی مدنی نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہاں کسی مسلمان کو اس طرح کے جور وستم کا نشانہ بننے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا- یہ حقیقت بذات خود اس بات کے لیے کافی تھی کہ نولدیکے شوالی اور دوسروں کو یہ اعلان کرنے سے روکتی کہ یہ آیات مدینہ میں اتری تھیں، اگرچہ بعض مسلم علماء بھی اس خیال کے رہے ہیں-

اس سیاق وسباق میں جہاں تک ''جہاد'' کی اصطلاح کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ مدنی معنوں میں جہاد نہیں ہے بلکہ فتنہ کے دباؤ کے سامنے محض پختہ ارادے کے ساتھ ایک مزاحمت ہے اور تشدد کی صورت میں اس کا بدلا اور انتقام ہے- یا ایک ایسے بیٹے کے والدین کی نسبت سے، جو اسلام قبول کر چکا ہے ایک زوردار کوشش ہے، اسے اسلام سے واپس لانے کی- مدینے میں ''جہاد'' کے معنی ہیں امت کی ایک منظم اور مجتمع کوشش کے- اگر ضروری ہو تو جنگ کے ذریعے- جس کا مقصد اسلام کے پھیلنے کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان پر غلبہ پانا ہے، بلکہ مدینے میں یہ اکثر قتال یا عملی جنگ کا ہم معنی ہو جاتا ہے- یہاں ''منافقون'' کے معنی بھی اس سے بہت نرم ہیں جو مدینے میں سمجھے جاتے ہیں، کیونکہ یہاں یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور جن کا ایمان اتنا مضبوط نہیں کہ وہ دباؤ کا مقابلہ کر سکے- مدینے میں یہ اصطلاح بالخصوص لوگوں کے ایک گروہ کی نشاندہی کرتی ہے، خاص طور پر عبداللہ بن ابی سے تعلق رکھنے والے، جنہوں نے جان بوجھ کر اسلام کا نقاب اوڑھ رکھا تھا، جو ایک طرح سے ففتھ کالم تھے، اسلام کی تخریب کرنے اور اندر رہ کر پیغمبر کی پوزیشن کو کمزور کرنے کے لیے- ان لوگوں کی کم وبیش ایک خاص پہچان تھی اور یہودیوں اور کفار مکہ کے ساتھ ایک طرح کا خفیہ گٹھ جوڑ تھا- یہ لوگ جنگ کے ایام میں، کم از کم غیر متحرک طور پر، ہمیشہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہوتے- لیکن زیر بحث قرآنی آیات میں ''منافقون'' ان متلون مزاج لوگوں کو کہا گیا ہے جن کا ایمان کمزور تھا- مدینے میں شاید یہ لوگ موجود تھے لیکن وہ ان پختہ اور کٹر منافقین کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے جن پر اس لفظ کا مخصوص اور تکنیکی انداز میں اطلاق ہوتا ہے (زیر نظر آیت کے متوازی سورہ الحج ۲۲

کی آیت ۱۱ ہے جو منافقون کا لفظ استعمال کیے بغیر کہتی ہے ''اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے، اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور اگر کسی فتنے نے اس کو آ لیا تو وہ الٹا پھر گیا۔'' چنانچہ اس طرح مکہ کے آخری دور سے مدینہ کے ابتدائی دور کی طرف تبدیلی کا ایک تسلسل ہے نہ کہ ان کے درمیان کوئی واضح انقطاع ہے جو قرآن کی تاریخ اور پیغمبر کی سیرت پر بہت سی جدید تحریروں میں سامنے آتا ہے۔ مغربی مصنفین کے ہاں تو مجموعی طور پر مدنی فینا مینا چھایا ہوا لگتا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں اور یہودیوں کی دشمنی اور قبلے میں تبدیلی۔ جس کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے اسلام کا رخ یہودیت سے تبدیل کر کے عرب کی طرف کر دیا۔ ہم اس پر بحث کر چکے ہیں کہ یہ سنگین غلط فہمیاں خصوصاً اس لیے واقع ہوئی ہیں کہ مکے میں حالات کے نشو ونما اور ان کے تناظر کو ٹھیک طرح نہیں دیکھا جاتا۔ دوسری سنگین غلط فہمی جس کا ازالہ کرنے کی ہم نے یہاں کوشش کی ہے یہ ہے کہ ''جہاد'' اور ''منافقون'' کی اصطلاحوں کو ہمیشہ مدنی سمجھا گیا ہے اور اس کی وجہ پھر وہی صحیح تناظر کی کمی ہے۔ اس لیے کہ اسلام کو مکے میں اس کے پورے عرصہ عمل میں یہودیوں اور قریش کے مقابلے میں بالکل بے بس سمجھا گیا ہے لیکن وہاں مسلم امت کے کردار میں جو مسلسل تبدیلیاں آ رہی تھیں ان کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہ تحقیق جو ہم نے یہاں پیش کی ہے اگرچہ مختصر ہے تاہم اسلام کے آغاز اور اس کے ارتقاء کے مرحلے کے بارے میں، اور حقیقت میں مسلم امت کے باضابطہ ظہور کے بارے میں، زمانہ حال کا جو عام رائج نقطہ نظر ہے اس پر اس تحقیق کے دوررس نتائج ظاہر ہوں گے۔ (۱۰)

---

(۱۰) مکے میں مسلم امت کے ارتقاء کے بعد کے مراحل کے بارے میں دو اور نکات کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ پہلا یہ کہ جب اہل مکہ نے اسلام کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو دیکھا تو وہ پیغمبر کے پاس آئے اور ان کے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی، اس شرط پر کہ وہ معاشرتی طور پر نچلے اور کمزور طبقے کے پیروکاروں سے اپنے آپ کو الگ کر لیں۔ یہ واقعہ جس کی تائید ابن اسحاق سے بھی ہوتی ہے، قرآن نے اس پر سورہ الکہف ۱۸ آیت ۲۸ اور سورہ المائدہ ۵ آیات ۵۲-۵۴ میں بات کی ہے جہاں پیغمبر کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اپنے کمزور پیروکاروں کو چھوڑنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائے۔

دوسرا نکتہ قرآن کی دو باہم تقابل پذیر آیات (سورہ مدثر کی آیت ۳۱ اور سورہ الحج کی آیات ۵۳-۵۴) کی تاریخوں کے بارے میں ہے۔ پہلی آیت میں کہا گیا ہے ''تا کہ اہل کتاب کو یقین آ جائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے ____ اور جن کے دل بیمار ہیں اور جو کافر ہیں کہیں کہ بھلا اللہ کا یہ مثال دینے سے کیا مطلب؟ ہو سکتا ہے'' یہ آیت اس بنا پر مدنی بھی جاتی ہے کہ یہ چار قسم کے لوگوں کی بات کرتی ہے جن میں منافقین بھی شامل ہیں جو مدینہ کے لیے تو قابل فہم ہیں، مکہ کے لیے نہیں، اس آیت کے قریب اور متوازی سورہ الحج کی آیات ۵۳-۵۴ ہیں اور ان کو بھی انھی وجوہات کی بنا پر مدنی کہا جاتا ہے۔ تاہم ہمارے دلائل کی روشنی میں جن میں یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ ''منافقین'' بطور طبقہ کے پہلے مکہ میں سامنے آئے نہ کہ مدینہ میں، ان آیات کو مکی ہی سمجھنا چاہیے، ورنہ دوسری صورت میں (خود نولدیکے شوالی کے مطابق بھی) کوئی وجہ نہیں کہ مثلاً الحج کی آیات ۵۳-۵۴ مکی نہ ہوں۔ درحقیقت مدینہ میں صرف تین طبقے ہیں، چار نہیں۔ اس لیے کہ کفار کا طبقہ وہاں بمشکل ملتا ہے۔ صرف مسلم، یہودی، اور منافقین رہ جاتے ہیں۔

ضمیمہ ۲

اہل کتاب اور مذاہب کا تنوع (Diversity)

عیسائیت کی طرف اسلام کا رویہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود اسلام- اس لیے کہ اسلام کی تشکیل جزوی طور پر یہودیت اور عیسائیت کے بعض اہم تصورات کو اپنانے اور بعض دوسرے تصورات پر تنقید کرنے سے ہوئی- دیکھا جائے تو اسلام اپنی جو تعریف خود کرتا ہے وہ ایک حد تک ان مذاہب اوران کی امتوں کے ساتھ اس کے رویئے کا نتیجہ ہے-

یہ امر کہ آنحضرتؐ کے ظہور کے زمانے میں مکے کے بعض عربوں میں نجات دہندہ کے انتظار کی کیفیت پائی جاتی تھی، اس کا کافی حد تک ثبوت دیا جا چکا ہے- یہودیت یا عیسائیت کو قبول کرنے کی بجائے یہ عرب حلقے اپنے ہی کسی وحی شدہ مذہب کی راہ دیکھ رہے تھے تا کہ وہ ان دو قدیم امتوں سے بھی بہتر ہدایت پا سکیں- جب آنحضرتؐ خدا کے پیغمبر کے روپ میں آ گئے تو قرآن بار بار لوگوں کے ایک گروہ کی بات کرتا ہے- جن کے بارے میں وہ کہتا ہے ''ہم نے انہیں پہلے ہی کتاب دی تھی (یعنی تورات اور انجیل) اور وہ قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں-'' یہ آیت صاف ظاہر کرتی ہے کہ بعض یہودی یا عیسائی یا یہودی مزاج عیسائی افراد کو بھی نجات دہندہ کا انتظار تھا، اور انہوں نے محمدؐ کی ان کے مشن کے معاملے میں حوصلہ افزائی کی تھی- قرآن درحقیقت مکے کے کفار پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ قرآن (یا پیغمبر) پر ایمان لائیں یا نہ، تاہم وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی تھی اس پر ایمان رکھتے ہیں (دیکھئے باب ہشتم)

اس فینا مینا کے ساتھ متعدد اہم اور دلچسپ مسائل وابستہ ہیں- مثال کے طور پر: کیا اسلام پوری طرح یہودی یا عیسائی اثرات کا نتیجہ تھا، یا یہ بنیادی طور پر ایک آزاد اور مقامی طور پر نمو پانے والی چیز تھی جس نے یہودی عیسائی روایت سے کچھ اہم تصورات لے لیے تھے- کئی یہودی اور عیسائی سکالروں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اسلام اپنی اصل میں کسی ایک یا دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہے، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے- حال میں متعدد مغربی سکالروں

نے جن میں منٹگمری واٹ، Maurice Gaudefroy-Demomlyness اور سب سے بڑھ کر ایچ ای آر گب نے ایک قابل یقین انداز میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اپنی اصل میں اسلام ایک عرب پس منظر سے ابھرا تھا، اگرچہ اسکی تشکیل اور نشو ونما میں یہودی عیسائی روایت سے کافی چیزیں در آتی رہی ہیں۔(۱) لیکن جو معاملہ یہاں براہ راست ہمارے پیش نظر ہے وہ اسلام کی 'اصل' نہیں ہے بلکہ وہ آنحضرت کا اپنے اور اپنے پیغام کے بارے میں تصور ہے جو بہت قریب سے اس تصور کے ساتھ جڑا ہوا ہے جو ان کا دوسرے انبیاء، ان کے مذاہب اور ان کی امتوں کے بارے میں تھا۔

قرآن سے صاف پتا چلتا ہے کہ اپنی پیغمبرانہ زندگی کے شروع سے لے کر آخر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلی وحی شدہ کتابوں کے الوہی ہونے اور ان صحیفوں کی حامل ہستیوں کی الوہی رسالت کا پوری طرح یقین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بغیر ایک لمحے کے تذبذب کے یہ جان لیا کہ ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور تورات اور انجیل کی دوسری مذہبی شخصیات ان کی طرح صحیح معنوں میں پیغمبر تھیں۔ قبول کے اس عمل کو بلاشبہ اس وقت تقویت حاصل ہوئی جب ان پہلے مذاہب کے پیروکاروں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک سچا نبی اور قرآن کو ایک نازل شدہ کتاب مان لیا۔ اس وجہ سے مغربی اسلامی سکالروں کا یہ نظریہ باطل ٹھہرتا ہے (جسے اول اول مغرب میں Snouck Hurgronje اور Noldeke-Schwally جیسے اسلامی مطالعوں کے سرخیل اصحاب نے پیش کیا تھا) کہ مکے میں پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پوری طرح یہ یقین تھا کہ وہ عربوں کو وہی کچھ دے رہے ہیں جو ان سے پہلے موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اپنی امتوں کو دیا تھا اور یہ کہ یہ مدینے میں ہی تھا جہاں یہودیوں نے آپؐ کو خدا کا پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں سے بالکل الگ مسلم امت قائم کی (دیکھئے باب ہشتم)

قرآن کے شروع میں معلوم ومخصوص مذہبی امتوں کا ذکر نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مختلف گروہوں اور قوموں کے پاس مختلف وقتوں میں پیغمبر آتے رہے ہیں لیکن ان کے پیغام عالمگیر ہیں اور ایک جیسے ہیں۔ یہ تمام پیغام ایک ہی منبع ''ام الکتاب'' سے نکلے ہیں (الزخرف ۴۳:۴، الرعد

(۱) منٹگمری واٹ: Mohammad at Mecca (آکسفورڈ ۱۹۵۳) صفحات ۱-۲۹، Maurice Gaudefroy Demomlyness کی کتاب Mahomet (پیرس ۱۹۵۷) صفحات xxii-l اور ایچ اے آر گب Pre-Islamic Mono theism in Arabia ہارورڈ تھیولاجیکل ریویو ۵۵ (۱۹۶۲) ۲۶۹-۸۰۔

۹:۱۳)اور" کتاب مکنون" (چھپی ہوئی کتاب) سے(الواقعہ۵۶:۷۸)چونکہ یہ پیغام عالمگیر ہیں اور ایک جیسے ہیں، تمام لوگوں پر فرض ہے کہ ان تمام الوہی پیغامات پر ایمان لے آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لیے یہ فرض سمجھا کہ وہ نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لائیں، اس لیے کہ خدا کا نازل کیا ہوا مذہب ناقابل تقسیم ہے اور نبوت بھی ناقابل تقسیم ہے۔ بلکہ پیغمبر سے قرآن میں یہ اعلان کرایا گیا کہ نہ صرف یہ کہ وہ تورات اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ یہ کہ "جو کتاب بھی خدا نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں" (الشوریٰ۴۲:۱۵) یہ اس لیے کہ خدا کی ہدایت تمام عالم کے لیے ہے اور کسی ایک یا چند قوموں کے اندر محدود نہیں ہے اور "کوئی امت ایسی نہیں کہ جس میں خبردار کرنے والا نہیں آیا" (الفاطر۳۵:۲۴) اور "ہر ایک قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا مہیا کیا گیا ہے۔" (الرعد۱۳:۷) دراصل قرآن میں "کتاب" کا لفظ اکثر استعمال کیا گیا ہے کسی خاص الہامی کتاب کے حوالے سے نہیں بلکہ ایک کلی اصطلاح کے طور پر جس میں تمام الوہی الہامات کی طرف اشارہ ہوتا ہے (مثلاً دیکھیے سورہ البقرہ۲ کی آیت ۲۱۳)

اگر محمدؐ اور ان کے پیروکار تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں تو سب لوگوں کو بھی اسی طرح محمدؐ پر ایمان رکھنا چاہیے۔ ان پر ایمان نہ رکھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کسی پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ کیونکہ یہ چیز بلاسوچے سمجھے پیغمبروں کی جانشینی کے سلسلے کو الٹ پلٹ کر دے گی۔ تاہم مکے کے آخری زمانے میں پیغمبرؐ اس امر سے زیادہ آگاہ ہو گئے کہ یہودی اور عیسائی ان پر ایمان نہیں لائیں گے، نہ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ زمانہ حال کے سکالروں نے یہ دکھایا ہے کہ محمدؐ کو اس امر سے آگاہی مکے میں حاصل ہوئی، نہ کہ مدینے میں، جیسا کہ عام خیال ہے۔ اس مرحلے پر یہودیوں اور عیسائیوں کو "الاحزاب" (فرقہ پرست، طرفدار، مذہب کو تقسیم کرنے والے لوگ، پیغمبر کے سلسلہ جانشینی کو توڑنے والے) کہا جاتا ہے۔ ہر 'حزب' (اور شیعہ بمعنی جماعت) اسی میں خوش ہے جو کچھ کہ اس کے پاس ہے، اسے باقی چیزوں کی کوئی پروا نہیں۔ مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ پارٹیوں میں تقسیم نہ ہو جائیں۔ اس مرحلے پر محمدؐ کے مذہب کو سیدھا اور کھرا بیان کیا جاتا ہے۔ 'حنیف' کا مذہب (یعنی ایک دیانت دار توحید پرست کا جو تفریق ڈالنے والی قوتوں کے پیچھے نہیں جاتا) اور اس کا ابراہیم کے مذہب سے تعلق قائم کیا جاتا ہے اور وہ اسی کے قبیل کا سمجھا جاتا ہے۔

مذاہب کے جداگانہ وجود سے آگاہی، ان کے ماخذ کی اکائی کے باوجود، آنحضرتؐ کے لیے ایک بڑا الہیاتی مسئلہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس چیز نے ان کے ذہن پر اتنا تکلیف دہ اور مسلسل دباؤ ڈالا کہ اس آگاہی کے شروع سے لے کر ان کی زندگی کے آخری زمانے تک قرآن اس مسئلے کے بارے میں مختلف سطحوں پر بات کرتا ہے۔ یہ امر کہ مذاہب کو ایک دوسرے سے ہی الگ نہیں کر دیا گیا، بلکہ ان کے اپنے اندر بھی تقسیم کا عمل ہوا ہے اس کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔ لیکن اس مسئلے پر ایک مختلف نقطہ نظر بھی قرآن سے برآمد ہوتا ہے وہ یہ کہ نوع انسانی ایک اکائی تھی لیکن یہ اکائی پیغمبروں کے ذریعے الوہی پیغامات کے آنے پر تقسیم ہو گئی۔ یہ حقیقت کہ پیغمبروں کے لائے ہوئے پیغام انسانی گروہوں کو تقسیم کر دیتے ہیں، ان کے درمیان حد فاصل کھڑی کر دیتے ہیں، اس کا سبب کسی الوہی راز میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے کہ اگر خدا چاہتا تو وہ سب انسانوں کو ایک ہی راستے پر لا سکتا تھا۔

> ''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر اللہ نے نبی بھیجے جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری جو حق پر قائم تھی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔ حق کے معاملے میں اختلاف ان لوگوں نے کیا جن کو اس کا علم تھا، اور وہ بھی اس وقت جب ان کے پاس واضح نشانیاں آ گئی تھیں اور یہ انہوں نے اس لیے کیا کہ وہ باہم ضدا ضدی کرنا چاہتے تھے۔'' (البقرہ۲:۲۱۳)
>
> ''اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک امت بنا سکتا تھا، مگر اب تو وہ مختلف راہوں پر چل نکلے ہیں۔'' (ھود۱۱:۱۱۸)
>
> ''ابتدا میں سارے انسان ایک ہی امت تھے، پھر ان میں اختلاف پیدا ہو گئے اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ اختلاف کر رہے تھے اس کا فیصلہ کر دیا جاتا۔'' (یونس۱۰:۱۹)

مدینے میں فرقہ پرست اور طرف دار (احزاب) کے الفاظ ترک کر دیے جاتے ہیں اور یہودیوں اور عیسائیوں کو ''امتیں'' قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اسلام کی

طرف بھی مسلسل دعوت دی جاتی ہے- جیسا کہ ہم نے پہلے نوٹ کیا، قرآن، مکہ کے ابتدائی مراحل میں امتوں کا نام لے کر بات نہیں کرتا، اور خاص امتیاز کی حامل امتوں کے بارے میں تو بالکل نہیں- علیحدہ علیحدہ یہودی اور عیسائی امتوں (اور غالباً عیسائیت کے اندر الگ الگ فرقوں) کی موجودگی سے آگاہ ہو کر اور انہیں تسلیم کر کے ہی قرآن نے پہلے تو انہیں ''فرقہ پرست'' اور ''طرف دار'' کہا اور اس کے بعد (مدینے میں) انہیں امتیں قرار دیا- جب ان امتوں کو ٹھوس پوزیشن دے دی گئی تو پھر مسلمانوں کو ایک الگ امت قرار دیئے جانے کا اعلان کیا گیا-

''یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں، اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کے پاس کچھ نہیں- حالانکہ دونوں ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں- (البقرہ ۲:۱۱۳)

''ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو، یا عیسائی نہ ہو، یہ ان کی خواہشات ہیں-'' (البقرہ ۲:۱۱۱)

''یہودی اور عیسائی تم سے کبھی خوش نہیں ہوں گے جب تک کہ تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو- صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے-'' (البقرہ ۲:۱۲۰)

اپنے بارے میں ان کے دعووں اور خدا کی ہدایت کے متولی ہونے کے دعووٴں کا قرآن نے جو جواب دیا ہے وہ بالکل واضح اور غیر مبہم ہے کہ ہدایت امتوں کا کام نہیں، بلکہ یہ خدا کا کام ہے اور اس کے نیک بندوں کا اور کوئی بھی امت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ صرف اسی کو ہدایت ملی ہے اور وہی منتخب امت ہے- قرآن کی دلیل کا سارا انداز ہی اس طرح کے انتخاب کے خلاف ہے-

''جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا، تو خدا نے کہا: میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں- ابراہیم نے کہا: میری اولاد میں سے بھی؟ خدا نے جواب دیا: میرا وعدہ ظالموں کے ساتھ نہیں ہوگا-'' (البقرہ ۲:۱۲۴)

انتخاب کا سارا پر اسرار نظریہ قرآن کے ان بار بار کے بیانات سے کھوکھلا ہو جاتا ہے جو وہ انجیلی پیغمبروں اور ان کے لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد دیتا ہے:

''وہ ایک امت تھی جو گزر گئی، جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے لیے ہے،

اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لیے ہے اور تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ
وہ کیا کرتے تھے۔'' (البقرہ ۲:۱۳۴، ۱۴۱)

اختصاصیت (exclusivism) اور انتخاب کو پوری طاقت سے رد کرنے کی پالیسی پر چلتے ہوئے قرآن دوسری امتوں، یہودیوں، عیسائیوں اور صابئین، میں اچھے لوگوں کی موجودگی کا بار بار اعتراف کرتا ہے جس طرح کہ وہ اسلام میں ایمان رکھنے والوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے:

''جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی۔ ان میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو ان کے رب سے ان کو اجر ملے گا، اور ان کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ کوئی غم۔'' (البقرہ ۲:۶۲، المائدہ ۵:۶۹)

سورہ البقرہ اور المائدہ کی ان دونوں آیات میں مسلم مفسرین کی ایک بہت بڑی اکثریت نے ان کے صاف معنی قبول کرنے سے بچنے کے لیے بے فائدہ اپنے آپ پر بوجھ ڈالا ہے، یعنی یہ معنی کہ انسانیت کے کسی بھی گروہ سے جو بھی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے وہ بچ جائے گا۔ وہ یا تو یہ کہتے ہیں کہ یہودیوں، عیسائیوں اور صابئین سے وہ لوگ مراد ہیں جو حقیقت میں اسلام لا چکے ہیں لیکن یہ تعبیر اس لیے صحیح نہیں ہو سکتی کہ مسلمان ان چار گروہوں میں سے صرف پہلا گروہ ہیں یعنی ''جو لوگ ایمان لائے'' یا پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ آیت سے مراد وہ اچھے یہودی، عیسائی اور صابئین ہیں جو پیغمبرؐ کی آمد سے پہلے گزرے۔ یہ تعبیر اس سے بھی بُری اپج ہے۔ جب قرآن یہودی اور عیسائی لوگوں کے ان دعوؤں کا جواب بھی دینے لگتا ہے کہ آخرت کی زندگی تو انہی کی ہے تو یہی کہتا ہے: ''ہاں، البتہ جو شخص خدا کے آگے اپنا سر جھکا دے اور وہ نیکوکار بھی ہو تو وہ اپنا صلہ اپنے پروردگار سے پالے گا اور اس کو نہ کسی طرح کا خوف ہو گا، نہ کوئی غم'' (البقرہ ۲:۱۱۲)

اس عالمگیر نیکی کو، جس کے ساتھ خدا اور آخرت، پر ایمان ضروری سہارے کے طور پر شامل ہوں، اس کو تسلیم کرنے کی منطق کا تقاضا یہی ہے کہ مسلم امت کو دوسری امتوں میں سے ایک امت سمجھا جائے۔ یہاں قرآن مختلف امتوں پر مشتمل دنیا کے مسئلے کا آخری حل بتاتا ہے:

''اور ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔۔۔۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک

شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی، (جبکہ دین کی روح ایک ہی ہے) اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا سکتا تھا لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا) تا کہ تمہیں آزمائے، اس چیز میں جو اس نے تم کو دی ہے۔ پس بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخرکار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کن باتوں میں اختلاف کرتے رہے ہو" (المائدہ ۵:۴۸)

مختلف مذاہب اور امتوں کی مثبت قدر چنانچہ یہ ہے کہ وہ بھلائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں (دیکھئے البقرہ ۲:۱۴۸ اور ۱۷۷ جہاں بیت القدس سے مکہ کی طرف قبلہ تبدیل کرنے کے اعلان کے بعد اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ قبلہ بذات خود اتنا اہم نہیں ہے، اصل قدر و قیمت نیکی اور بھلائیوں میں مسابقت کی ہے) خود مسلم امت کو بھی، جسے "امت وسط" کہا جاتا ہے۔ (البقرہ ۲:۱۴۳) اور "بہترین امت جسے انسانوں کے لیے میدان میں لایا گیا ہے" (آل عمران ۳:۱۱۰) یہ یقین دہانی نہیں کرائی جاتی کہ یہ اپنے آپ خدا کی منظور نظر ہوگی، جب تک یہ زمین میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد نماز قائم نہیں کرتی، غریبوں کو زکوٰۃ نہیں دیتی، معروف کا حکم نہیں دیتی اور منکر سے منع نہیں کرتی (الحج ۲۲:۴۱) پھر سورہ محمد ۴۷ کی آیت ۳۸ میں مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ "اگر تم (ان تعلیمات سے) منہ پھیرو گے تو خدا تمہاری جگہ دوسری قوموں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گی" (دیکھئے سورہ توبہ ۹:۳۹)

قرآن کی رو سے خدا اور مخلوقات کے درمیان بنیادی امتیاز یہ ہے کہ خدا بے نہایت ہے۔ سراپا زندگی، سراپا طاقت اور سراپا علم ہے جبکہ تمام مخلوقات محدود ہے۔ خدا نے، جو لا نہایت ہے، ہر چیز ایک مقرر اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے (مثلاً سورہ القمر ۵۴:۴۹) صرف وہی اندازہ مقرر کرنے والا ہے، جبکہ دوسری ہر چیز اندازہ کی ہوئی ہے۔ یہ خیال قرآن میں ہر جگہ موجود ہے۔ یہ کوئی جبریت کا نظریہ نہیں ہے جیسا کہ قرون وسطیٰ کے بہت سے مسلم متکلمین کا خیال ہے۔ اس سیاق و سباق میں اندازہ مقرر کرنے کے معنی بس امکانات کو، ان کی وسعت کے باوجود، محدود کرنے کے ہیں۔ مثلاً انسان کے متعلق قرآن یہ مانتا ہے کہ وہ بڑی امکانی قوتوں کا مالک ہے۔ تخلیقی علم میں آدم نے فرشتوں کو مات دے دی، اور فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی تکریم کریں

(البقرہ۲:۳۰ومابعد) تاہم انسان خدانہیں ہوسکتے۔

یہ خدا کے لانہایت ہونے کی وجہ سے ہے کہ مطلق رحمت اور مطلق طاقت دونوں کا مرجع صرف خدا ہے۔ خدا کی رحمت فی الواقع بے پایاں ہے (المومن۴۰:۷،، الاعراف۷:۱۵۶) بلکہ رحمت ایک ایسی چیز ہے جو خدا نے اپنے اوپر لازم کی ہے (الانعام۶:۱۲) اور یہ حقیقت کہ ہر طرف وجود کی فراوانی ہے، بجائے اس کے کہ ہر طرف لاوجود کا خلا ہوتا، یہ خود خدا کی رحمت کا اولین کارنامہ ہے۔ خدا کی قدرت اس کی رحمت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے تم کسی انسان کی طرف، جس کی حدود متعین ہیں اور جس کی ایک تاریخ پیدائش ہے، اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "یہ شخص خدا ہے" قرآن کے نزدیک یہ نہ ممکن ہے، نہ قابل فہم اور نہ قابل معافی!

تجسیم اور تثلیث کے عقائد پر قرآن کے فیصلوں کی شدت بدل بدل کر سامنے آتی ہے، بعض آیات میں عیسائی نظریئے کو صرف "عقیدے کی انتہاپسندی" کہا جاتا ہے:

"اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم صرف اللہ کا ایک رسول تھا اور اس کا کلمہ جو اس نے مریم کی طرف القا کیا اور ایک روح اللہ کی طرف سے۔ بس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ، اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔ اس سے باز آ جاؤ، تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے، وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اسی کا ہے۔---- مسیح کبھی اس کو عار نہیں سمجھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو، نہ وہ فرشتے جو اس کے قریب ہیں، اسے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو اللہ ان سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔" (النساء۴:۱۷۱:۱۷۲)

لیکن عیسائیت سے متعلق بہت زیادہ زوردار آیات وہ ہیں جو بت پرستوں کے خلاف قرآن کے بیانات کی یاد دلاتی ہیں، کہا جاتا ہے:

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ (اے محمد) ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اسی کی ماں کو اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے

سے باز رکھ سکے- آسمانوں اور زمین کی اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان
سب کی بادشاہی اسی کی ہے- وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر
قادر ہے-'' (المائدہ ۵:۱۷)

پھر یہ کہ:

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے---
یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے-
حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں- اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز
نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی
جائے گی- تو پھر کیا یہ لوگ توبہ نہیں کریں گے اور اس سے معافی نہیں
مانگیں گے، وہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے- مسیح ابن
مریم تو بس ایک رسول تھا- اس سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے،
اس کی ماں بہت راست باز عورت تھی- وہ دونوں (دوسرے لوگوں کی
طرح) کھانا کھایا کرتے تھے- دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت
کی نشانیاں واضح کرتے ہیں اور دیکھو کہ یہ کدھر الٹے پھرے جاتے
ہیں-'' (المائدہ ۵:۷۲:۷۵)

قرآن اسی لہجے میں آنحضرتؐ سے اور ان کے متعلق بات کرتا ہے:

''محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں- ان سے پہلے اور رسول
بھی گزر چکے ہیں پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ
الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟'' (آل عمران ۳:۱۴۴)

''ان سے کہو کبھی تم نے یہ سوچا کہ اگر خدا مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک
کر دے، یا ہم سب پر رحم کرے تو کافروں کو دردناک عذاب سے کون
بچائے گا؟'' (الملک ۶۷:۲۸)

محمدؐ اس بات کو طے شدہ نہیں مان سکتے کہ خدا اپنے آپ انہیں الہامی پیغامات بھیجتا رہے گا-

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص (محمدؐ) نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے-
پس اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مہر کر دے- (تا کہ اس سے کوئی

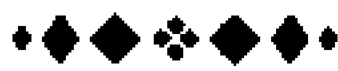
الہامی پیغام صادر نہ ہو) درحقیقت اللہ ہی ہے (نہ کہ محمدؐ) جو اپنے کلمات
سے باطل کو مٹاتا ہے اور حق کا اثبات کرتا ہے۔'' (الشوریٰ ۴۲:۲۴)

تو قرآن کے لیے حضرت عیسیٰ خدا کی تجسیم بالکل نہیں ہو سکتے، جس طرح خود محمدؐ یا کوئی بھی دوسرا پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے بارے میں نرمی سے بات کرتا ہے (دیکھئے سورہ المائدہ ۵ کی آیت ۸۲: ''اور تم ایمان لانے والوں (یعنی مسلموں) کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور وہ مغرور لوگ نہیں ہیں'' اسی طرح سورہ الحدید ۵۷ کی آیت ۲۷ ''اور ان سب رسولوں کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا، جس کو ہم نے انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا'')

عیسائیت کے ساتھ یہ جو رویہ ہے اس سے ملتا جلتا کوئی رویہ قرآن میں مذکور دوسری امتوں کے ساتھ دیکھنے میں نہیں آتا۔ چونکہ قرآن عیسائیوں کے معاملے میں بعض اوقات بہت نرم ہوتا ہے (اگر چہ کبھی کبھی وہ ان پر کڑی تنقید بھی کرتا ہے) بعض مغربی سکالروں کا خیال ہے کہ بنیادی طور پر محمدؐ انہی کی راہ کے مسافر تھے، اور غالباً قریب قریب عیسائی! اس بارے میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ بعض سیاسی محرکات کی وجہ سے وہ عیسائیت کے ساتھ اپنی مکمل اور کھلم کھلا شناخت نہ پیدا کر سکے۔ بعضوں کے نزدیک بازنطین کے معاملے میں ان کا روز افزوں جارحانہ رویہ قرآن میں عیسائیت پر بڑھتی ہوئی سخت تنقید کا باعث تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ عیسائیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدے کی جو نوعیت ہے اسے انہوں نے صحیح طور پر نہ سمجھا تھا، اس لیے کہ عیسائیوں نے اسے ان کے سامنے غلط انداز میں پیش کیا تھا۔ لیکن یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مثلاً تجسیم کا عقیدہ کس طرح غلط طور پر سمجھا سکتا تھا۔ پہلے نقطہ نظر کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ قرآن کی سخت تنقیدی آیات لازمی طور پر دوسری آیات سے بعد کی ہیں۔ مثلاً سورہ الحدید ۵۷ کی مذکورہ بالا آیت ۲۷ ہی کو لیجیے، یہ موخر مدنی زمانے کی لگتی ہے۔ تو اس لیے سچائی یہ معلوم ہوتی کہ آنحضرت کو عیسائیت کے مختلف نمائندوں کی طرف سے مختلف نظریات کا سامنا ہوا، اور لگتا ہے کہ قرآن نے بھی مختلف گروہوں کو مختلف نکات پر خطاب کیا۔

بہر حال حضرت عیسیٰ کی الوہیت اور عقیدہ تثلیث کا قرآن کے لیے ناقابل قبول ہونے میں

کسی قسم کا شک اور اختلاف نہیں ہوسکتا۔ جس طرح اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواری بہت فیاض اور ایثار پیشہ سمجھے جاتے ہیں۔ غالباً قرآن کو کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر الوہی کلمہ (Logos) گوشت پوست کی صورت اختیار کر لیتا بشرطیکہ الوہی کلمے کو خود خدا نہ سمجھ لیا جاتا۔ قرآن کی رو سے الوہی کلمے (کلمۃ من اللہ) سے کبھی بھی خدا مراد نہیں لیا جاتا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرآن کے لیے کچھ خاص معنوں میں خدا کی طرف سے پھونکی ہوئی روح ہیں، اگرچہ خدا نے اپنی روح اس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام میں بھی پھونکی تھی (الحجر ۱۵:۲۹، ص ۳۸:۷۲) عیسائی۔ اور یہودی بھی۔ توحید کے عقائد کا جو دعویٰ کرتے تھے اس سے وابستہ کچھ اسی طرح کی توقعات تھیں جن کی بنیاد پر قرآن نے ان کو یہ دعوت پیش کی ہے کہ "اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں" (آل عمران ۳:۶۴) یہ دعوت، جو غالباً اس وقت دی گئی جب آنحضرتؐ کے خیال میں تینوں نام نہاد توحید پرست امتوں کے درمیان ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا تھا، یہ عیسائیوں کو بظاہر معقول اور مناسب لگی ہوگی۔ تاہم اس دعوت کا کوئی جواب اب تک نہیں دیا گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک مثبت تعاون کے طور پر کوئی نہ کوئی حل اس صورت حال کا اب بھی نکالا جاسکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان قرآن کی بات دھیان سے سنیں اور اسلام کی روایتی ضابطہ بندی کے پیچھے نہ جائیں اور بشرطیکہ زمانہ حال کی یہ راہنما (pioneering) کوششیں کہ ایسا عیسائی عقیدہ سامنے لایا جائے جو عالمگیر توحید پرستی اور مساوات انسانی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو، جاری رکھی جائیں۔



MAJOR THEMES OF THE QUR'AN
(QURAN KAY BUNYADI MAUZUAAT)

by Dr. Fazlur Rahman

Urdu translation: Muhammad Kazim

Publisher: **Mashal Books**
RB-5, Second Floor,
Awami Complex, Usman Block, New Garden Town,
Lahore-54600, Pakistan

Telephone & Fax: 042-5866859
email: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.com

Title design: Ahmar Rehman

Printers: Zahid Bashir Printers, Lahore.

Price: Rs. 320/-

Mashal is a small organisation dedicated to the publishing of books on social, cultural and developmental themes of contemporary relevance. Trends in modern thought, human rights, the role of women in development, issues of governance, environmental problems, education and health, popular science, drugs and creative literature relating to these and other themes are the focus of Mashal's programme.

While Mashal works for the widest dissemination of its publications, it is a non-commercial and non-profit enterprise. Mashal therefore seeks the support of individuals and aid giving agencies worldwide which consider the foregoing objectives worthy of promotion.

مشعل معاشرتی، معاشی اور ثقافتی امور اور عہد حاضر سے متعلق ترقیاتی موضوع پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ جدید فکری رجحانات، انسانی حقوق، بہتر نظم ونسق، ترقی میں خواتین کے کردار، ماحولیات، منشیات اور قومی و عالمی تخلیقی ادب مشعل کی خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔

مشعل کی کوشش ہے کہ اس کی مطبوعات وسیع پیمانے پر دستیاب ہوں۔ یہ ایک غیر تجارتی اور غیر نفع مند ادارہ ہے۔ چنانچہ مشعل ایسے پاکستانی اور غیر ملکی اداروں اور افراد سے امداد کا خواہاں ہے جو مشعل کے اغراض و مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔

مشعل کی کتابیں

(Mashal's Urdu Titles)

معاشرتی علوم اور فلسفہ

قرآن کے بنیادی موضوعات ۔ ڈاکٹر فضل الرحمن	ترجمہ: محمد کاظم	320/-
اسلام اور جدیدیت ۔ ڈاکٹر فضل الرحمن	ترجمہ: محمد کاظم	320/-
معاشی تکون کا نچلا حصہ	ترجمہ: جنید احمد	300/-
مقدر بنانے کے خواب	ترجمہ: فرزانہ ممتاز	220/-
تباہ شدہ تہذیبیں اور جدید دنیا	ترجمہ: سجاد کریم انجم	450/-
علم کی سلطنت	ترجم: شفقت تنویر مرزا	400/-
قوموں کی اصل دولت	ترجمہ: پروفیسر حنیف کھوکھر	340/-
تہذیبوں کی کایا کلپ	ترجمہ: پروفیسر حنیف کھوکھر	500/-
تیل اور گیس خاتمہ قریب ہے ...	ترجمہ: ایم وسیم	300/-
تشخص اور تشدد	ترجمہ: پروفیسر مقبول الٰہی	250/-
دہشت کے بعد	ترجمہ: ایم وسیم	280/-
برصغیر کے اولیا اور ان کے مزار	ترجمہ: محمد ارشد رازی	200/-
فی سبیل اللہ فساد	ترجمہ: یونس منصور	340/-
لامحدود طاقت	ترجمہ: تنویر اقبال	380/-
روسو	قاضی جاوید	100/-
والتیئر	قاضی جاوید	100/-
مسلم فکر و فلسفہ عہد بعہد	محمد کاظم	300/-
اسلامی ریاست ۔ جواز کی تلاش	ترجمہ: محمد ارشد رازی	170/-
ہندوستان میں فرقہ پرستی اور اس کا جواب۔ اصغر علی انجینئر	ترجمہ: شفقت تنویر مرزا	290/-

ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	200/-
بھارت میں ہندو مسلم محاذ آرائی	ترجمہ: فضیل ہاشمی	150/-
اپنا قاتل	ڈاکٹر خالد سہیل	140/-
پاکستان ہندوستان ایٹمی امن ریڈر	ترجمہ: مصطفیٰ نذیر احمد	200/-
جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر	ڈاکٹر مبارک علی	120/-
مذہبی رواداری	صفدر صدیقی	160/-
جال ۔ جیمز گولڈ سمتھ	ترجمہ: الطاف احمد قریشی	85/-
کلچر اور کاروبار جاپان میں	ترجمہ: حسن عابدی	125/-
میرے بچے میری دولت	ترجمہ: الطاف فاطمہ	250/-
پاکستان کی فعال خواتین: فصیلوں کے ادھر	ش۔فرخ	250/-
عورت اور مزاحمت	روبینہ سہگل	280/-
غربت کے کئی چہرے	ترجمہ: قاضی جاوید	135/-
خوف سے رہائی ۔ آنگ سان سوچی (برما)	ترجمہ: شفقت تنویر مرزا	180/-
انسان ہونے کا حق	ترجمہ: ناظر محمود	50/-
دشمن کی تلاش	ترجمہ: حسن عابدی	150/-
The Fluttering Flag of Jehad	عامر میر	700/-
A to Z of Jehadi Organisation in Pakistan	عامر رانا	550/-
The Evolution of Devolution		300/-
Making Enemies: Pakistan 's Crises of State and Society	تالیف: ضیاء میاں اور افتخار احمد	200/-
An Introduction to Reporting in Pakistan	فریک جوی	90/-

صحت

موت کے سامنے (کینسر سے مقابلہ کرنے والی خاتون کی آپ بیتی)	ترجمہ: محمد عامر رانا	130/-
حمل اور بچے کی پیدائش	ترجمہ: ڈاکٹر جاوید انور	90/-
بچے اور صحت	ترجمہ: ڈاکٹر جاوید انور	70/-
فیملی ڈاکٹر	ڈاکٹر ابرار احمد	200/-
ایچ آئی وی ایڈز ۔ ایلز بتھ ریڈ	ترجمہ: ڈاکٹر ابرار احمد	150/-

سائنس

سائنس کے عظیم مضامین	ترجمہ: شہزاد احمد	160/-
وقت کا سفر	ترجمہ: ناظر محمود	200/-
اساسی قوتوں کی یکجائی ۔ ڈاکٹر عبدالسلام	ترجمہ: ڈاکٹر انیس عالم	100/-

ماحولیات

ماحولیات کی رپورٹنگ صحافیوں کے لیے	ترجمہ: شیخ ریاض احمد	120/-
کرہ ارض کا تحفظ اور ماحول	ترجمہ: شیخ ریاض احمد	80/-

ناول فکشن

آپ کی جنت		ترجمہ: مسعود اشعر	270/-
سنہری قفس		ترجمہ: سجاد کریم انجم	240/-
آوازیں جو سنائی نہیں دیتیں		ترجمہ: محمد وسیم	300/-
بھنور کے بیچ	(انڈین ناول)	ترجمہ: تنویر اقبال	150/-
کامروپ کی کہانی	(آسامی ناول)	ترجمہ: تنویر اقبال	200/-
جھلتے دنوں کے خواب	(کورین ناول)	ترجمہ: تنویر اقبال	180/-
دکھ درد کے جزیرے	(انڈونیشی)	ترجمہ: تنویر اقبال	250/-
دھرتی کے دکھ	(انڈونیشی)	ترجمہ: تنویر اقبال	230/-
قصائی کی بیوی	(تائیوانی)	ترجمہ: تنویر اقبال	120/-
طوفان	(بنگلہ دیشی)	ترجمہ: ممتاز رفیق	100/-

سپنوں کی موت	(تھائی لینڈ)	ترجمہ: حمید جہلمی	110/-
بے موسم کا پھول	(جاپانی کہانیاں)	ترجمہ: محمد عاصم بٹ	120/-
کانٹوں کی کھیتی	(ملائیشیا)	ترجمہ: محمد ارشد رازی	130/-
جنگ کے ٹکڑے	(تائیوانی)	ترجمہ: امجد حسین	200/-
سلطانہ کا خواب	(بنگلہ دیشی)	ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا	90/-
خون خاک نشیناں	(ویت نامی)	ترجمہ: یونس منصور	100/-
حویلی کے اندر	(انڈین)	ترجمہ: الطاف فاطمہ	210/-
موسم گل	(جاپانی)	ترجمہ: شفقت تنویر مرزا	190/-
ساون دیس	(تھائی لینڈ)	ترجمہ: شفقت تنویر مرزا	200/-
سچ کہانیاں	(انڈین)	ترجمہ: الطاف فاطمہ	160/-
چار ناولٹ	(جاپانی)	ترجمہ: الطاف احمد قریشی	160/-
شکستہ ستون پر دھوپ ۔ عطیہ حسین	(انڈین)	ترجمہ: انتظار حسین	220/-
اعتراف	(جاپانی)	ترجمہ: پروفیسر نظیر صدیقی	320/-
خاموشی	(جاپانی)	ترجمہ: مسعود اشعر	100/-
بے منزل راستہ	(انڈونیشیا)	ترجمہ: منصورہ احمد	65/-
جدید جاپانی افسانے	(جاپانی)	ترجمہ: شاہد حمید	200/-
بیراگ	(سری لنکا)	ترجمہ: مصطفیٰ نذیر احمد	160/-
آگ کی دہلیز ۔ کہانیاں	(جنوب مشرقی ایشیا)	ترجمہ: مصطفیٰ نذیر احمد	120/-
دریا بی بی	(بنگلہ دیشی)	ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا	110/-
ادھورے مرد	(چائنا)	ترجمہ: انور غالب	125/-
شجر گلنار	(جاپانی)	ترجمہ: آصف فرخی	90/-
نوجوان شاعر کے نام خطوط	(جرمن)	ترجمہ: رضی عابدی	30/-
گھر کے اندر گھر کے باہر	(عرب)	ترجمہ: شفقت تنویر مرزا	110/-
کالی بارش	(جاپانی)	ترجمہ: اجمل کمال	120/-
برما کا ستار	(جاپانی)	ترجمہ: صابر صدیقی	85/-

چوبیس آنکھیں	(جاپانی)	ترجمہ: اجمل کمال	130/-
ابابیل	(مراکش)	ترجمہ: عارفہ سیدہ زہرہ	70/-
ننھے سپاہی		ترجمہ: رقیہ جعفری	120/-

بچوں کی کتابیں

ندیدی گائے	(جاپانی)	ترجمہ: چی زورو جاوید	30/-
شریر مرغا	(جاپانی)	ترجمہ: چی زورو جاوید	40/-
سفید گھوڑا	(جاپانی)	ترجمہ: چی زورو جاوید	50/-

قرآن کے بنیادی موضوعات کیا ہیں؟

عالمِ اسلام کے ممتاز مفکر اور محقق ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اس کتاب میں اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے خدا، انسان، معاشرے اور یوم آخرت کے بارے میں قرآن کے مجموعی نقطہ نظر پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس ضمن میں اس کی ہدایات اور تفصیلات کس طرح مربوط شکل میں سامنے آتی ہیں۔



مشعل